

الرسائل والمسائل

جلد سوم

تصنيف

شيخ المشايخ پير محمد چشتي

جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور

گلف پبلشرز محلہ جنگی قصہ خوانی پشاور



الرَّسَائِلُ وَالْمَسَائِلُ

جلد سوم

تصنيف

شيخ المشايخ شيخ الحديث والتفسير

پير محمد چشتي چترالوي مدظلہ

پرنسپل جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون پشاور پاکستان



جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب:	الرسائل والمسائل
مصنف:	شیخ الحدیث مولانا پیر محمد چشتی
باہتمام:	فضل الرحمن
کمپوزر:	عاطف شہزاد چشتی
پروف ریڈنگ:	استاذ حدیث سید ظاہر علی شاہ
ڈیزائنر:	ندیم خان
تعداد:	1100
جلد:	سوم
سال اشاعت:	2015ء

نمبر شمار	فہرست	صفحہ نمبر
1	احسن الامین فی تطبیق حدیث ثقلین	6
2	تقریر مدرسہ یا گناہوں کا ڈھیر	16
3	نماز جنازہ کی دعائیں اور تاریخ	26
4	احکام شرعیہ کی تفصیل	37
5	ایمان کے لوازمات خمسہ کا بیان	52
6	سورۃ الصف، آیت 4 کی قابل فہم تفسیر	66
7	شفاء الہی والغل	74
8	کفر دون کفر	82

9	علم الغیب ماہو	89
10	مسند ارشاد و امام سے متعلق سوال کا جواب	98
11	سورة البقرہ، آیت نمبر 49 کا ترجمہ	105
12	خطاب اللہ اعلیٰ لرسولہ الاعلیٰ	112
13	القتال المذہبی فساد لا جہاد	118
14	تحویل قبلہ سے متعلق آیات کی تفسیر	133
15	صرف ونحو، بلاغت کا عربی کے ساتھ مختص نہ ہونے کا فلسفہ	141
16	ترجمہ القرآن کی شرائط کا قرآن و سنت سے ثبوت	154
17	لوازمات ایمان کا نقل سے ثبوت	160
18	سورة البقرہ، آیت 184، 185 کی تفسیر	180

19	سورة البقرہ، آیت نمبر 192 کی تفسیر	187
20	لفظ شئی کی وضاحت کے متعلق استفتاء	195
21	جملہ متنافہ کی تعریف کے متعلق استفتاء	204
22	وحدة الوجود اور وحدة الشہود کا فلسفہ	211
23	سورة البقرہ، آیت نمبر 38 کی تفسیر	220
24	ترجمہ القرآن ممکن و لا ممکن	230
25	اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنا	238
26	ترجمہ اور ترجمانی کی تفریق	247
27	حقیقی ترجمہ اور ترجمہ باللازم کا فرق	254
28	سورة یاسین آیات 7 تا 9 کی تفسیر	259

احسن الاملین فی تطبیق حدیث الثقلین

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اہل سنت والجماعت کے علماء میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوا ہے کہ جائز و ناجائز کو جاننے کے لیے قرآن و سنت کافی ہیں یا اہل بیت پیغمبر ﷺ کو بھی دخل ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ قرآن و سنت کے ساتھ اہل بیت کے اماموں کو دلیل بنانا شیعہ مذہب ہے۔ جو وضعی حدیث گھڑ کر کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا:

”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كَتَبَ اللَّهُ وَعِترَتِي“

میں تم کو دو چیزیں دے کر دنیا سے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب ہے اور دوسری میرے اہل بیت ہیں۔

ظالم شیعوں نے اس وضعی روایت کو اہل سنت کی کتابوں میں بھی داخل کر کے مغالطہ پیدا کر دیا ہے جبکہ کتاب اللہ کے بعد روئے زمین کی سب سے زیادہ صحیح کتاب حدیث بخاری شریف ہے۔ جس میں ”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كَتَبَ اللَّهُ وَسُنَّتِي“ کے الفاظ ہیں۔ جس کے مطابق صرف قرآن و سنت کا شرعی دلیل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے اماموں نے اس حدیث کو صحیح سمجھ کر اس کے مطابق عمل کیا ہے جس وجہ سے شیعہ والی روایت اہل سنت کے ہر مذہب میں نا آشنا، غیر مانوس ہے کیوں کہ وہ اصل میں شیعہ عقیدہ اور غلط ہے۔ علماء کا یہ فریق یہ بھی کہتا ہے کہ اس روایت پر عمل کرنا اس لیے بھی ناجائز ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے شیعہ اماموں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا جس سے باطل کو قوت ملتی ہے جس بات سے باطل کو قوت ملے وہ جائز نہیں ہوتی۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ قرآن و سنت کے ساتھ اہل بیت کے اماموں اور امام ابوحنیفہ کی طرح ہر مجتہد کا فتویٰ بھی شرعی دلیل ہے اور ”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كَتَبَ اللَّهُ وَعِترَتِي“ کی روایت کو وہ صحیح

اور قابل عمل کہتا ہے۔ مہربانی کر کے اس مسئلہ کی وضاحت ماہنامہ آوازِ حق میں شائع کر کے ثواب دارین حاصل کریں، یہ مسئلہ کافی دنوں سے باعثِ اختلاف بنا ہوا ہے۔

ہم نے ماہنامہ آوازِ حق کا مطالعہ کر کے مناسب سمجھا کہ آوازِ حق کے سرپرست اعلیٰ مولانا پیر محمد چشتی کو یہ مسئلہ بھیجیں تاکہ وہ اپنی غیر جانبدارانہ شاندار روایت کے مطابق اس کی شرعی تحقیق شائع کر کے شک اور وسوسہ کو دور کریں۔ والسلام

السائل..... حافظ محمد زرین وقاری محمد رحیم 16/4 ماہنامہ بازار ضلع مانسہرہ ہزارہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جواب:- اس سوالنامہ کا اجمالی جواب یہ ہے کہ حدیث شریف ”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كِتَابَ اللَّهِ وَعِزَّتِي“ سے انکار کرتے ہوئے اسے موضوع غلط، غیر مانوس اور شیعہ کی طرف سے اہل سنت کتابوں میں شامل کردہ کہنے والا فریق سراسر غلطی پر ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے کل مکاتب فکر محدثین کے نزدیک اس مسئلہ اور صحیح حدیث سے متعلق اس کی یہ تمام باتیں خلاف حقیقت اور صریح جھوٹ ہونے کے ساتھ اس فریق کا عقیدہ و کردار بھی اس حدیث کے حوالہ سے جملہ محدثین اسلام اور کل مکاتب اہل سنت کے عقیدہ و کردار کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ فریق انجانے میں فرقہ خوارج یا فرقہ نواصب کا کردار ادا کر رہا ہے۔ کیوں کہ ان دونوں گمراہ فرقوں کی سب سے بڑی علامت و پہچان یہی ہے کہ جس بات میں اہل بیت نبوت کے آئمہ اطہار کی عظمت ظاہر ہو رہی ہو، یہ اس کے خلاف چلتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ فریق محض شیعہ کی مخالفت کو افضل عبادت تصور کرتے ہوئے آئمہ اطہار اہل بیت نبوت کی عظمت شان اور ان کے فرامین و ہدایات سے انکار کر کے جملہ اہل اسلام سے بالعموم اور اسلاف اہل سنت سے بالخصوص خود کو کٹ آف کر رہا ہے۔ نیز انجانے میں قرآن و حدیث کی ان تمام نصوص سے انکار کر رہا ہے جن میں اہل بیت نبوت کی محبت و تعظیم کو سب پر واجب اور ان کی اقتداء کو سب پر لازم قرار دیا گیا ہے۔

تفصیلی جواب:- مذکور فی السؤال دونوں حدیثیں معیاری اور صحیح و درست ہیں، آپس میں متعارض بھی نہیں ہیں کہ ان میں تطبیق نہ ہو سکے اہل سنت اور اہل تشیع کے طبقہ فقہاء کے نزدیک اس حوالہ سے فرق صرف تعبیر کا ہے کہ فقہاء اہل سنت شرعی احکام کے ثبوت و استنباط کے لیے ”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّتِي“ کو معیار قرار دے کر شرعی احکام کے لیے بنیادی مآخذ و منابع کی تعبیر قرآن و سنت سے کرتے ہیں جبکہ فقہاء اہل تشیع فرمان نبوی ﷺ کہ ”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كِتَابَ اللَّهِ وَعِزَّتِي“ کو اصل الاصول قرار دے کر بنیادی مآخذ و منابع کی تعبیر قرآن و سنت اور آئمہ اہل بیت نبوت سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معصوم ہونے کی بنا پر اہل بیت نبوت کے ان اماموں کی سنت و کردار، ان کے اقوال و افعال اور ان کے اجتہادات و فتاویٰ سنت نبوی ﷺ کے عین مطابق اور اس کے مظاہر ہونے کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسے میں فریقین کے مابین اس حوالہ سے تعبیری فرق اور عنوان کی تفریق کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ فقہاء اہل تشیع کے مطابق آئمہ اہل بیت نبوت اپنے نانا اکرم رحمۃ اللہ علیہ کے کامل وارث و جانشین اور معصوم ہونے کے فلسفہ کے مطابق جب عکس نبوت، مظہر رسالت اور تفسیر قرآن ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو ان کے جملہ تصرفات و تولیت و اجتہادات و احکام بھی احکام نبوی اور تفسیر قرآن ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں گے۔ اس تشریح کی تائید حدیث ثقلین سے متعلقہ اُس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں اللہ کے حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے آئمہ اطہار اہل بیت نبوت کو قرآن شریف کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

”لَنْ يَنْفَرَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ“ (۱)

یعنی امامان اہل بیت نبوت اور قرآن حوض کوثر پر میرے پاس آنے تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

گویا ”إِنِّي تَارِكُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّتِي“ کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ

نے اپنی پاک، مطہر و مقدس اولاد کو ”أَلَوْلَدُ بَسْرَ لَا يَبْه“ کے مطابق اپنی سنت قرار دیا، ان کے کردار کو اپنا کردار قرار دیا اور ان کی تولیت و احکام کو اپنے احکام قرار دیا جس کی صداقت کی گواہی اُن پاکیزہ ہستیوں کی عملی زندگی بھی دیتی ہے کہ انہوں نے بھی قرآن کی اشاعت و حفاظت کے لیے اور بیضۃ الاسلام کی جمعیت و بقاء کے لیے ایسا ہی مجاہدہ فرمایا جو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا، خارجی و داخلی دشمنوں کے دستِ ظلم سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کو بچانے اور اسے پھیلانے کے لیے وہی کردار انجام دیا جو رسول اکرم ﷺ نے انجام دیا تھا اور اُم المؤمنین کے فرمان ”وَكُنَّا خُلُقُهُ الْقُرْآنَ“ کے عین مطابق ان مقدس ہستیوں کا کریمانہ اخلاق بھی عکس قرآن ہونے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سنتِ نبوی ﷺ اور عترتِ نبی ﷺ کو ایک دوسرے کے متعارض تصور کرنے والے نادانوں کو شاید ان پاکیزہ ہستیوں کے کریمانہ اخلاق و کردار کا مطالعہ نہیں ہے ورنہ ایسی جسارت وہ کبھی نہ کرتے۔ اس کے علاوہ اس مسلمہ حدیث کے متعلق موضوع غلط، اہل تشیع کی کارستانی، غیر مانوس، اہل سنت عقیدہ کے خلاف اور غلط جیسی جتنی دفعات لگائی جا رہی ہیں۔ یہ سب مستحکمہ خیز، باطل و اکاذیب ہیں جن پر ہتکار دیکھا جائے پھر بھی کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی صحت اور قابلِ عمل ہونے پر شیعہ سنی دونوں مکاتب فکر کے جملہ محدثین متفق ہیں آج تک کسی بھی محدث نے اس کے متعلق ایسے الزامات نہیں لگائے جو یہ لوگ لگا کر روج نبوی ﷺ کو اذیت پہنچا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سو بیس (۱۲۰) صحابہ و تابعین سے مروی ہونے کے ساتھ اہل سنت کی مندرجہ ذیل کتب حدیث میں بھی اس کی تخریج ہوئی جیسے صحیح مسلم شریف میں حضرت زید بن ارقم کی مرفوع روایت کے مطابق اس طرح ہے:

”قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمَافِينَا حَاطِيًا بِمَاءٍ يُدْعَى خُمَابَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ فَحَمَدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ وَوَعظَ وَذَكَرْتُمْ قَالَ أَمَا بَعْدَ لَا أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوْشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأَجِيبُ وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللَّهِ فِيهِ الْهُدَى وَالتُّورُ فَخُذُوا بِكِتَابِ اللَّهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ فَحَتَّ عَلَى كِتَابِ اللَّهِ وَرَغَبَ

فِيهِ ثُمَّ قَالَ وَاهْلُ بَيْتِي أَذْكُرْكُمْ اللَّهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أَذْكُرْكُمْ اللَّهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أَذْكُرْكُمْ اللَّهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي“ (۱)

ایک دن اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ و مدینہ کے درمیان ایک چشمہ پر جو غم غدیر کے نام سے پکارا جاتا ہے کھڑے ہو کر ہمیں خطبہ دیا جس میں سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثناء بیان فرمائی بعد ازاں ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی اس کے بعد فرمایا کہ:

”اے لوگو! میں خدا نہیں ہوں کہ مجھ پر موت نہ آئے بلکہ انسان ہی ہوں جس پر موت آتی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حضرت عزرائیل کا میرے پاس آنا اور میری طرف سے اللہ کی دعوت کو قبول کرنا آپہنچا ہے۔ میں دو بھاری چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا (جو اللہ کے نزدیک معزز اور بھاری ہیں) ان میں سے اول اللہ کی کتاب ہے جس میں تمہاری رہنمائی و روشنی ہے تو اللہ کی اس کتاب پر عمل کرو اور اس سے استدلال کرو۔ اللہ کے رسول نے کتاب اللہ پر عمل کے لیے صحابہ کرامؓ کو ابھارا اور انہیں ترغیب دی۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان میں سے دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت سے متعلق تمہیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں، میں تمہیں اپنے اہل بیت سے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔ (تین بار اہل بیت سے متعلق تاکید فرمائی۔)

حضرت زید بن ارقم کی یہی روایت ترمذی شریف میں اس طرح موجود ہے:

”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ مَا إِن تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَحَدُهُمَا أَغْظَمُ مِنَ الْآخِرِ كِتَابُ اللَّهِ حَبْلٌ مُمْدُودٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ وَ عِزَّتِي أَهْلُ بَيْتِي وَلَنْ يَنْفَرَقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوا كَيْفَ تَخْلِفُونِي فِيهِمَا“ (۲)

(۱) الحدیث مسلم شریف، ج ۲، ص ۲۷۹، باب فضائل علی۔

(۲) ترمذی شریف، ج ۲، باب فضائل علی، ص ۲۱۹۔

میں تم میں دوا ایسی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جن کے مطابق عمل کر کے تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے، ان میں سے ایک کی عظمت دوسری سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک تو کتاب اللہ ہے جو آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی رہی ہے (اس کے علوم و معارف آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہیں) اور ان میں سے دوسری چیز میری اولاد و اہل بیت ہیں۔

ترمذی شریف میں ہی اس سے دو تین حدیثیں چھوڑ کر حضرت جابر بن عبد اللہ ص کی روایت اس طرح موجود ہے:

”إِنَّمَا النَّاسُ إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ اخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا كِتَابُ اللَّهِ وَ عِرَّتِي أَهْلُ بَيْتِي“

اے لوگو! میں تم میں دو چیزیں ایسی چھوڑ کر جارہا ہوں کہ جب تک تم ان کے مطابق عمل کرتے رہو گے تو کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے، ان میں سے اول کتاب اللہ ہے اور دوسری چیز میری اولاد و اہل بیت ہیں۔

یہ حدیث حضرت زید بن ارقم ص کی روایت سے مستدرک حاکم، جلد سوم، صفحہ ۱۰۹، کتاب معرفۃ الصحابہ اور فضائل علی میں اس طرح موجود ہے:

”قَالَ لَمَّا رَجَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَنَزَلَ عَدِيرَ خِمٍّ أَمَرَ بِدُوحَاتٍ فَنُقِمْنَ فَقَالَ كَأَنِّي قَدْ دُعِيتُ فَأَجَبْتُ إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ الثَّقَلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْآخَرِ كِتَابُ اللَّهِ تَعَالَى وَ عِرَّتِي فَأَنْظَرُوا كَيْفَ تَخْلُقُونِي فِيهِمَا فَإِنَّهُمَا لَنْ يَفْشَرَقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْخَوْضَ ثُمَّ قَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ مَوْلَانِي وَأَنَا مَوْلَى كُلِّ مُؤْمِنٍ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ ص فَقَالَ مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فِهَذَا وَلِيُّهُ اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَا وَ عَادَ مِنْ عَادَاهُ وَ ذَكَرَ الْحَدِيثَ بِطَوِيلِهِ هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ الصَّحِيحِينَ وَلَمْ يُخْرِجَاهُ بِطَوِيلِهِ“

حضرت زید بن ارقم ص نے کہا کہ جب رسول خدا ﷺ حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر اترے تو کیکر کے کچھ درختوں کے نیچے صفائی کا امر فرمایا، جگہ کی صفائی کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے دعوت اور میری طرف سے اجابت کا وقت قریب آچکا ہے میں نے دو بھاری چیزیں تمہیں دی ہیں جن میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، ان میں سے ایک کتاب اللہ ہے جبکہ دوسری میری اولاد، تم غور کرو کہ میرے بعد ان کے ساتھ کس طرح سلوک کرو گے۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ وہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچنے سے قبل کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو گے۔ (یعنی قرآن اور اہل بیت لازم و ملزوم ہیں) اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا۔ بیشک اللہ عزیز و جلیل میرا مولیٰ ہے اور میں ہر مومن کا مولیٰ ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت علی ص کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ بھی مولیٰ ہے۔ اے اللہ! جس نے انہیں مولیٰ جانا تو بھی اسے دوست رکھ اور جس نے ان سے عداوت کی تو بھی اس کا دشمن ہو۔ راوی نے اس حدیث کو مکمل طور پر ذکر کیا۔

یہ حدیث مسلم و بخاری کی شرط صحت کے مطابق صحیح ہے اور مسلم و بخاری نے اس کی صحت کے باوجود مکمل طور پر اس کو ذکر نہیں کیا۔

حضرت زید بن ارقم ص کی یہی روایت مستدرک حاکم میں فضائل اہل بیت کے سلسلہ میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے:

”إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ كِتَابُ اللَّهِ وَأَهْلُ بَيْتِي وَإِنَّهُمَا لَنْ يَفْشَرَقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْخَوْضَ“ (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں دو بھاری چیزیں تم میں چھوڑے جارہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں یعنی ایک دوسرے سے



ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملیں گے۔

اس سلسلہ میں اگر اہل سنت و جماعت کے چاروں مذاہب اور غیر اہل تقلید محدثین مفسرین وغیرہ سلف صالحین کی کتابوں میں موجود حوالہ جات کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا جائے تو اس سے ایک علیحدہ دفتر بن سکتا ہے۔

خلاصہ کلام:- درجنوں سے زیادہ صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، آئمہ مجتہدین اور مفسرین و محدثین اور شارحین حدیث سے بلا شک و تر و دمنقول اس روایت کو نا آشنا یا غلط سمجھنا جہل محض کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ شاید اس فریق کے دماغ پر کچھ ایسے علماء اور ماحول کا اثر ہو جو اپنی کوتاہ بینی کی بناء پر حدیث شریف کی کچھ کتابوں میں ثقلین کی تفسیر کتاب و سنت کے ساتھ جو آئی ہوئی ہے، ان دونوں کے درمیان تطبیق کو سمجھنے سے قاصر رہنے کی بناء پر اسی کو اصل حدیث تصور کر کے اس کثیر الورود روایت کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کی جسارت کر رہے ہیں جو کسی طرح بھی ”اَفْتُوْهُمْ مِّنْ بَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ“ (البقرہ، 85) سے مختلف نہیں ہے۔ اور اس روایت کو شیعہ مذہب قرار دے کر ٹھکرا دینا بھی جہالت ہے کیوں کہ شیعہ یا اہل سنت، اہل حدیث، شافعی، حنفی اور دیوبندی و بریلوی اختلافات کے ساتھ اس روایت کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تفریق محض جہل کی پیداوار ہے ورنہ یہ روایت بلا تخصیص مسلک کل مکاتب فکر کی کتب میں موجود ہے اور سب کے نزدیک قابل قبول و قابل عمل سمجھی گئی ہے۔ قابل عمل کیوں نہ ہو جبکہ آئمہ اہل بیت جملہ اہل اسلام کے نزدیک واجب التعظیم ہیں، مقتدی اہل اسلام ہیں، نجوم ہدایت و کشتی نجات ہیں، جن کی تعلیمات کو مشعل راہ بنائے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن ہے نہ حدیث نبوی ﷺ کو، چاروں مذاہب اہل سنت کے آئمہ مجتہدین کبھی ان سے مستغنی ہوئے نہ اہل طریقت کے عرفاء کا ملین ان کے بغیر کبھی فیض یاب ہوئے، نہ محدثین کرام نہ فقہاء اسلام۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے (30) سالہ اسلامی دور حکومت کے بعد (600) سالوں تک خلافت کے نام پر سیاسی مقتدرہ پر بیٹھ کے حدود اللہ کی دھجیاں اڑانے والے کج کلاہوں کے دستبرد



سے اگر اسلام کو بچایا تو ان ہی حضرات نے اور ان کے کتب فکر سے فیض پانے والے خوش نصیبوں نے بچایا ہے۔ جس کے ثبوت کے لیے تاریخی حقائق کے علاوہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نور اللہ مرقدہ الشریف کا یہ شہرہ آفاق مقولہ کافی و ثانی سند و دلیل ہے:

”لَوْ لَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ نَعْمَانُ“

یعنی اگر حضرت امام جعفر صادق کے درس صحبت میں دو سال میں نے نہ گزارے ہوتے تو جہالت کی ہلاکت میں گر جاتا۔

حضرت امام شافعیؒ نور اللہ مرقدہ الشریف نے فرمایا:

آلُ النَّبِيِّ ذَرِيعَتِي وَهُمْ إِلَيَّ وَسِيلَتِي
أَرْجُو بِهِمْ أَعْطَى غَدَا بَيْدِي الْيَمِينِ صَحِيفَتِي

یعنی خاندان نبوت کے آئمہ اطہار میرے لئے ذریعہ نجات ہیں اور رسول ﷺ تک پہنچنے کے لیے یہی میرے وسیلے ہیں۔ اُمید کرتا ہوں کہ ان کی اتباع کی برکت سے قیامت کے دن محیفہ اعمال میرے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ (۱)

شیعہ کی ضد میں حقائق سے منہ پھیرنے کی اس سے بدترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دوزدہ آئمہ اہل نبوت جو تمام اہل اسلام کے متفقہ مقتدی، آئمہ ہدی و پیشوایان اسلام ہیں، جن کی امامت و پیشوائیت پر جملہ اہل اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں فخر کیا، جن کے دامن اقدس کے ساتھ وابستگی میں ہدایت سمجھی، جن کے مکتبہ فکر کی تابعداری کو کشتی نوح کی طرح نجات دہندہ جانا، الغرض فرقہ خوارج و نواصب کے ماسوا تمام مکاتب فکر اہل اسلام نے جن کی تعلیمات کو اسلام کی حقیقی تفسیر کہہ کر قرآن و سنت کے بعد انہیں واجب الاتباع قرار دیا ان ہی کو نا آشنا، غیر مانوس اور غیر اہل سنت عقیدہ کہہ کر انجانے میں جملہ اہل اسلام کی مخالفت کی جا رہی ہے۔

(۱) دیوان الشافعی، ص 55، مطبوعہ مصر۔

اگر عقل ہوتی تو ایسی جسارت کبھی نہ کرتے، اہل اسلام کے اسلاف کا مطالعہ ہوتا تو ایسے بے پر کی کبھی نہ اڑاتے یا کم از کم خوارج و نواصب کی سب سے بڑی علامت و پہچان کا پتہ ہوتا تو خود کو اس حوالہ سے ان کی صف میں کبھی شامل نہ کرتے، سچ کہا گیا ہے:

”الْتَعَصُّبُ إِذَا تَمَلَّكَ أَهْلَكَ“

یعنی تعصب جب کسی پر غالب ہوتا ہے تو اسے ہلاک کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی تعصب کے نتیجے میں فرقے و اریات کی سلگتی آگ کے شعلے جو بھڑک رہے ہیں۔ جو مذہبی و غیر مذہبی، ملکی، غیر ملکی خواص و عوام کو بے قرار کیے ہوئے ہیں اس کا اصل سبب اس قسم کا تعصب زدہ مذہبی طبقہ ہے جن کو حقیقت میں اپنے اسلاف کے عقائد و کردار کا کچھ علم ہے نہ مخالف کے موقف کا، انسانی شرافت کا احساس ہے نہ صداقت کا، قابل رحم ہے مسلمانوں کا وہ معاشرہ جس میں ایسے متعصب، نا اہل حضرات لوگوں کی مذہبی رہنمائی کر رہے ہوں۔

ایسوں سے متعلق ہی کہا گیا ہے۔

إِذَا كَانَ الْغُرَابُ دَلِيلَ قَوْمٍ سَيَهْدِيهِمْ طَرِيقَ الْهَالِكِينَ

یعنی کوا جس معاشرہ کا رہنما ہو تو وہ انہیں ہلاکت کی راہ پر ہی لے جائے گا۔

اہل سنت و جماعت کے مسلمہ امام فقہ حضرت برہان الدین صاحب ہدایہ نے بھی اس قسم مغلوب التعصب نا اہل رہنماؤں سے متعلق فرمایا:

فَسَادَ كَبِيرُ عَالِمٍ مُتَنَبِّئُكَ
هُمَا فِتْنَةٌ عَظِيمَةٌ لِمَنْ
وَ اكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَبِّئُكَ
بِهِمَا فِي ذِيْنِهِ يَتَنَسَّكَ

مذہبی اقدار کی دھجیاں اڑانے والا عالم بڑا فساد ہے اور اُس سے بھی بڑا فساد مذہب کا وہ نادان دوست ہے جو اُس کے ماحول سے اثر لیتا ہے۔ (۱)

☆☆☆☆☆

(۱) تعلیم المتعلم، ص 5، مطبوعہ مصر۔

تعمیر مدرسہ یا گناہوں کا ڈھیر

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ:

1 ایک شخص نے دینی مدرسہ کے لیے اپنی زمین وقف کی ہے جبکہ اُس زمین اور میرے گھر کے درمیان اندازہً بارہ گز کا فاصلہ ہے۔

2 اُس زمین اور میرے گونج کے درمیان اندازہً دو فٹ کا پیدل راستہ ہے میرا یہ گونج دودھ کے لیے استعمال ہوتا ہے گھر کی خواتین کا اس میں آنا جانا ہوتا ہے۔

3 میری پانی کی ٹینگی بھی اس سے دو فٹ کے فاصلہ پر ہے گونج کی طرح اس پانی کی ٹینگی سے بھی خواتین کا واسطہ رہتا ہے۔

4 اُس کے ساتھ متصل میری کاشت کی زمین ہے اس میں بھی زنانوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ یہ دو فٹ گزر گاہ تقریباً پچاس گھرانوں کی گزر گاہ ہے۔

5 اس مدرسہ کے عملہ کی وجہ سے گونج، ٹینگی اور پلاٹ (کاشت والی زمین) والے گھرانہ کی بے پردگی ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر پچاس گھرانوں کے اس راستہ سے گزرنے والی عورتوں کی بھی بے پردگی ہوتی ہے۔

6 اس مدرسہ سے اندازہً بیس گز کے فاصلہ پر اسماعیلیہ فرقہ کا جماعت خانہ بھی واقع ہے جو قدیم الایام سے آباد ہے اب اس مدرسہ کی تعمیر کی وجہ سے مذہبی مرکزوں کے ایک دوسرے کے نزدیک ہونے کی بنا پر آئندہ چل کر مذہبی تصادم ہونے کا مستقل خطرہ ہو سکتا ہے۔

7 میرے گھر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے جب اُس مدرسہ میں بچوں کی تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے اُس کے آواز و شور سے ہم لوگوں کو اپنے گھر میں اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ ہم آپس میں بات بھی نہیں کر

سکتے ہیں اور اُس شور کی وجہ سے ہماری زندگی اجیرن ہوتی ہے خاص کر جب مہمان کی موجودگی ہو ہمارے لئے شدید تکلیف کا سامان ہوتا ہے۔

8 اس مدرسہ کا اپنا راستہ بھی نہیں ہے جو دفن کی گزرگاہ ہے وہ بھی میری ملکیت ہے جس کو میرے آباؤ اجداد نے محض آس پاس کے گھروں کو بطور راستہ دیا ہوا تھا جس پر ہم بھی راضی ہیں۔ لیکن مدرسہ والے زبردستی سے ہماری رضامندی کے بغیر اس تنگ راستہ کو استعمال کرتے ہیں۔

9 اس مدرسہ کی جانب شمال میں متصل آب پاشی و آب نوشی کے لیے ایک چھوٹی سی نہر ہے جس سے نیچے رہنے والے لوگ پانی پیتے ہیں اور زمینوں کو سیراب کرتے ہیں اور اس نہر کے کنارہ پر اُن لوگوں کو گزرگاہ تھی جو قدیم الایام سے اُن لوگوں کا راستہ تھا اب مدرسہ والوں نے اُس راستہ کو بھی مدرسہ میں شامل کر کے راستہ کو زبردستی ختم کر دیا ہے جس وجہ سے متعلقہ لوگوں کو بہت دور کا چکر کاٹ کر آنا جانا ہوتا ہے۔

10 اس مدرسہ کی زمین کے احاطہ میں میری ملوکہ سردوائی (سرد آب) کی زمین شامل ہے سردوائی کی یہ زمین آج سے تقریباً پچاس سال قبل مدرسہ کے لیے زمین وقف کرنے والے شخص کے والد نے رضاعت کے عوض میری والدہ کو دی تھی جس پر میرے والد نے قبضہ و تصرف کر کے سردوائی تعمیر کی تھی جو اندازہ عرصہ پچاس سال تک ہمارے زیر تصرف رہا جس پر گواہ اب بھی موجود ہیں لیکن مدرسہ کے لیے زمین دینے والا شخص نے میری عدم موجودگی میں میرے والد کی ضعیف العمری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُس پر زبردستی قبضہ کر کے اپنی زمین میں شامل کر کے مدرسہ کو دیا ہے اب مدرسہ والوں نے میری اُس سردوائی کی زمین پر مسجد تعمیر کر کے نمازیں شروع کی ہوئی ہیں۔

11 اس مدرسہ کی وجہ سے اپنے گھر کی بے پردگی، آواز اور شور کی تکلیف، قدیمی راستہ کی بندش کی عام لوگوں کی تکلیف، سردوائی زمین پر ناجائز قبضہ کی وجہ سے دینی کوفت اور اس مدرسہ میں لڑکوں اور لڑکیوں، اجنبی اساتذہ و استانیوں کے اختلاط کی وجہ سے اپنے ماحول پر بُرا اثر پڑنے اور سنی اسماعیلی تصادم

کے آئندہ خطرات سے بچنے کی خاطر میں یہ قربانی بھی دینے کے لیے تیار ہوں کہ اس زمین جتنی دوسری زمین اس سے اچھی جگہ اور آبادی کے لیے تعلیمی فوائد کے حوالہ سے مفید جگہ دینے کے لیے تیار ہوں تاکہ دینی مدرسہ و مسجد بھی تعمیر ہو اور لوگوں کو بھی اس جگہ کی نسبت زیادہ فائدہ پہنچے اور ہم بھی مذکورہ مصائب سے محفوظ ہو سکیں، کیا ایسی صورت میں اس مدرسہ کو یہاں پر قائم کرنے کا کوئی جواز ہے؟ جبکہ اُس کی تعمیر بھی میری عدم موجودگی میں دھوکہ دے کر کی گئی ہے۔ اس مدرسہ کے لوگوں نے مجھے بدنام کر نیکے لیے مشہور کیا کہ دینی مدرسہ و مسجد بنانے نہیں دیتا لہذا ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا“ (الحديث) سے استدلال کر کے میرے ساتھ سوشل بائیکاٹ کیا ہے۔ میرے مطلوبہ حل طلب سوالات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے؛

کیا مذکورہ جگہ مسجد بنانا شریعت محمدی میں جائز ہے یا ناجائز؟

دینی مدرسہ و مسجد کی خاطر کسی مسلم کو مذکورہ اذیتیں پہنچانی جائز ہے یا ناجائز؟

میری والدہ کو رضاعت کے عوض دی گئی مذکورہ سردوائی پر میرا حق ہے یا نہیں؟

کیا قدیم الایام سے موجود برب نہر لوگوں کی گزرگاہ کو مسجد و مدرسہ میں شامل کر کے اُن سب کو دور دراز کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

کیا ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا“ (حدیث) سے استدلال کر کے مجھے بدنام کرنا اور میرے خلاف سوشل بائیکاٹ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

کسی ایسی جگہ میں مسجد و مدرسہ بنانا جائز ہے؟ جس میں پہلے سے اسماعیلیہ فرقہ کا مرکز موجود ہے جس کی وجہ سے مستقبل قریب یا بعید میں ان دونوں مراکز کی وجہ سے فریقین کے مابین مذہبی تصادم و فتنہ انگیزی اٹھنے کا اندیشہ ہو خاص کر ایسے حالات میں جب کہ اس مسجد و مدرسہ کے لیے ہر لحاظ سے بہتر محل وقوع دوسری جگہ موجود ہو لیکن مناسب جگہ کی بجائے اس جائے فتنہ پر بعد رہنے کا جواز ہے یا نہیں؟

اس سوال نامہ میں جو تفصیلات میں نے لکھ دی ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اشد

پڑھ کر یقین دلاتا ہوں کہ میری ایک بات بھی خلاف واقعہ نہیں ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مسجد و مدرسہ بھی آباد ہو اور اہل علاقہ کو بھی علمی و مذہبی فائدہ پہنچے اس کے ساتھ میرا خاندان بھی مذکورہ اذیتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہو جائے اور اہل علاقہ کا راستہ بھی بند نہ ہو۔ اس لیے میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ چاہتا ہوں کہ اللہ کے دین اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں جو جائز ہو وہ ہمیں بتا دیا جائے تاکہ ہم اُس پر عمل کریں۔

میرا ایمان ہے کہ اگر شریعت کا فتویٰ میرے خلاف ہوتا ہے تب بھی میں بطیب خاطر اُسے تسلیم کر کے خانہ بدوش ہو جاؤں گا کیوں کہ اس جگہ پر مدرسہ ہونے سے ہماری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ہم اپنا گھر وہیں پر قائم نہیں رکھ سکتے ہیں۔

لہذا ان سوالات کی بابت شریعت کا جو فیصلہ ہو وہی قرآن و حدیث اور فقہ حنفی کے حوالہ سے ہم پر واضح کیا جائے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ماہنامہ آواز حق میں ہمارے ان سوالات کا شرعی جواب شائع کر کے صحیح معنی میں آواز حق ہونے کا ثبوت فراہم کیا جائے گا۔

ہمیں یاد ہے کہ اس سے قبل بھی ماہنامہ آواز حق نے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل شائع کر کے عوام کے ساتھ حکومت کی بھی جائز رہنمائی کی ہے۔ لہذا مہربانی کر کے ہمارے ان سوالات سے متعلق جو بھی شرعی فتویٰ ہو اُسے آواز حق میں شائع کیا جائے۔

السالئل..... شیر محمد تورکھو چترال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جواب:- اس سوال نامہ میں جو تفصیلات بیان کی گئیں ہیں اُن کی صحت کی صورت میں مذکورہ مدرسہ و مسجد کی تعمیر کو اللہ کے دین میں اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت مقدسہ میں دنیا کا کوئی دین دار مفتی و عالم جائز نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ناجائز ہونے کے لیے یہی ایک وجہ بھی کافی تھی کہ اُس تنازعہ زمین کی سرحدوں والی جگہ و حصہ حق رضاعت کے سلسلہ میں کسی اور کی ملکیت ہے جس پر ناجائز طریقہ سے ظلماً

قبضہ کر کے وقف کیا جا رہا ہے جبکہ حق غیر، مشکوک اور غیر یقینی ملکیت کا وقف کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اسلامی احکام کی روشنی میں فی سبیل اللہ وقف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کسی یقینی ملک کو اللہ کی رضا کے لیے اپنی ملکیت سے نکال کر اس طرح معلق کرنا ہوتا ہے کہ اُس کا مالک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا اور اُس پر تصرف کا حق قاضی کی طرف سے کسی کے سپرد ہو جانے کے بعد کسی اور کے حقوق و ملکیت کے مشکوک و شبہات سے مکمل پاک ہونا ضروری ہے۔ جیسے فقہ حنفی کی ظاہر الروایت کی یہ عبارت کنز الدقائق، ہدایہ وغیرہ اکثر کتب فقہ میں لکھی ہوئی موجود ہے ”وَلَا يَتِمُّ حَتَّى يَقْبُضَ وَيُقَرَّضَ“ سائل ہذا کے بیان حنفی سے بھی قطع نظر کر کے اگر فرض کر لیا جائے کہ سرحدوں والی جگہ اُس کی والدہ کی ملکیت نہیں ہے تو پھر بھی پچاس سال تک اُس کا اس پر مالکانہ تصرف کرنا جس پر گواہوں کی موجودگی اور مدعی کا قسم اٹھانے کے لیے تیار ہونا یہ سب کچھ مل کر وقف کرنے والے کی ملکیت کو مشکوک بنا دیتے ہیں اور ملکیت میں شک و تردید یا عدم یقین کی صورت میں وقف جائز نہیں ہو سکتا جب وقف کرنا درست نہیں ہے تو پھر اُس پر بنائے جانے والی مسجد بھی شرعی مسجد نہیں ہوگی اور اُس پر پڑھی جانے والی نمازوں کو بھی مسجد کا ثواب نصیب نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی شک پیدا کرنے والی باتوں کو خلاف حقیقت، جھوٹ، اشتباہ یا ناقابل توجہ سمجھ کر اُن سے صرف نظر کرنے کو خلاف تقویٰ و منافی احتیاط قرار دیتے ہوئے اللہ کے حبیب نبی اکرم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ“ (۱)

اس حدیث شریف کا پس منظر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی (حضرت عقبہ ابن الحارث) نے ابی احباب ابن عزیز کی بیٹی کے ساتھ نکاح کیا ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ایک عورت نے آکر عقبہ ابن الحارث کو کہا کہ جس لڑکی کے ساتھ تو نے نکاح کیا ہے وہ تیری رضاعی بہن ہے میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے۔

(۱) بخاری شریف، ج ۱، ص ۱۹، باب الرحلة فی المسئلة النازلة۔



یہ بات سن کر اُن کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی تو عقبہ ابن الحارث نے اپنے حالات و یقین کے مطابق یہ کہا کہ ہمیں تیری اس بات پر کوئی یقین ہے نہ خبر تیرے سوا دونوں خاندانوں کا کوئی فرد بشر یہ نہیں کہتا ہم تیرے کہنے پر کس طرح عمل کریں یہ کہہ کر پریشانی کے عالم میں چل کر آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور صورت حال بیان کی تو سرور کونین نبی اکرم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ“

یعنی نکاح کے منافی خبر کی موجودگی میں ایسا کرنا تقویٰ و احتیاط کے خلاف ہے۔

اس حدیث کو سلف صالحین نے بنیاد بنا کر ہر اُس تصرف و عمل سے بچنے کا حکم دیا ہے جس میں جانب مخالف کی طرف سے کوئی بات موجود ہو اور ایسے ہی مواقع پر فقہاء کرام نے بھی اپنی کتابوں میں ”كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ“ کا فرمان عالی شان استعمال کیا ہے۔

سوال نامہ ہذا میں مذکور سردوائی مسجد و مدرسہ کے لیے وقف کرنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ باعث شک و تردد ہے کیوں کہ جانب مخالف کا پچاس سال تک اُس پر مالکانہ تصرف کرنے کا دعویٰ ہے، گواہوں کی موجودگی ہے، حق رضاعت کے عوض دی گئی اس زمین پر وقف کرنے والے کا ناجائز قبضہ جمانے کی حجت آرائی ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پر حلفیہ بیان اور اُشہد کے ساتھ قسم کی تیاری و اظہار یقین و جزم ہے۔ ایسے میں شریعت مقدسہ کی روشنی میں کسی بھی مفتی و محتاط مسلمان کو روکا نہیں ہے کہ ایسی مشکوک اور غیر یقینی زمین کو وقف کر کے خدا اور رسول کو دھوکہ دیں خاص کر ایسے حالات میں جبکہ یہ وقف اپنی جگہ ناجائز ہونے کے باوجود اُس پر تعمیر ہونے والی مسجد سے مذکورہ فتنوں کے جنم پانے کی راہ ہموار ہو رہی ہو۔ مسجد جیسی جائے امن کے نام پر غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، آئندہ چل کر سنی اسماعیلی فرقہ واریت کی آگ سلگانے کا خطرہ ہو اور اہل علاقہ کے لیے مشکلات پیدا کی جا رہی ہو دُنیا کا کوئی بھی مفتی اس وقف کو جائز اور اُس پر تعمیر ہونے والی مسجد کو خانہ خدا و مسجد شرعی قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس کے علاوہ قریب کے گھر، گونج، پلاٹ اور پانی کی ٹینکی وغیرہ کے حوالہ سے مسلم عورتوں کی بے پردگی کا خطرہ اور مدرسہ میں پڑھنے والوں کے آواز و شور کی وجہ سے مذکورہ گھر والوں کو تکلیف پہنچنا، اُن کے آرام میں خلل آنا اور اُن کے مہمانوں کے لیے بے آرامی کا سبب بننا ان میں سے ہر ایک انفرادی طور پر بھی مذکورہ جگہ پر تعمیر مسجد و مدرسہ کے ناجائز ہونے کی شرعی وجوہ و دلائل ہیں چہ جائے کہ ان سب کا اکٹھا اس کے عدم جواز کی دلیل نہ بنے، بنظر انصاف دیکھنے سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ ان وجوہ میں سے ہر ایک متعلقہ مسلمانوں کے لیے ضرر بین و اذیت لائیکل ہے جس کے متعلق نبی اکرم رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح حدیث موجود ہے:

”لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ“ (۱)

یعنی اسلام میں کسی کو انفرادی طور پر ضرر پہنچانے کی اجازت ہو سکتی ہے نہ اجتماعی طور پر۔ فتاویٰ درالمختار کتاب القضاء میں ہے:

”لَا يُمْنَعُ الشَّخْصُ مِنْ تَصَرُّفِهِ فِي مِلْكِهِ إِلَّا إِذَا كَانَ الضَّرَرُ بَيِّنًا“ (۲)

یعنی کسی بھی شخص کو اپنے ملک میں تصرف کرنے سے منع نہیں کیا جاسکتا مگر ایسا تصرف کرنے سے منع کیا جائے گا جب دوسروں کے حق میں اُس کا ضرر واضح ہو۔

اہل انصاف کو غور کرنا چاہئے کہ ہمایوں کی بے پردگی، گھر میں بے آرامی، مہمانوں کی بے اطمینانی، فرقہ وارانہ تصادم و فتنہ برپا ہونے کے خطرہ اور مسلمانوں کی قدیم الایام سے گزر گاہ کی بندش کر کے انہیں دور دراز کی راہ سے گزرنے پر مجبور کرنے جیسے مفسد و نقصانات اور اذیت و ضرر جس تعمیر کی وجہ سے اکٹھے لازم آتے ہوں تو پھر اس سے بڑھ کر واضح ضرر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ کے دین میں اور رسول

(۱)۔ سنن ابن ماجہ شریف کتاب الاحکام باب من بنی فی حقہ ما یضر بجارہ، مطبوعہ ایچ ایم سعید کراچی، صفحہ 170۔

۲۔ مسند امام احمد ابن حنبل، ج 1، ص 105، مطبوعہ بیروت۔

(۲) فتاویٰ درالمختار، ج 1، ص 85، مطبوعہ مجتہبائی دہلی، کتاب القضاء۔



اللہ ﷻ کی شریعت میں ایسی جگہ مدرسہ و مسجد تعمیر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہو سکتی جو اس قسم فتنوں کو جنم دے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”الْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَّعَنَ اللَّهُ مَنْ يَقْظُهَا“ (۱)

یعنی فتنہ سویا ہوا ضرر ہے اُس پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اُسے اُٹھایا۔

فقہاء کرام نے حدیث ”لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ“ کے مصداق کے لیے جس واضح ضرر کو معیار قرار دیا ہے یہاں پر لازم آنے والے مذکورہ مفاسد سب کے سب اُس پر صادق آتے ہیں ایسے میں دنیا کا کون سا مفتی یا کون سا قانون مسجد و مدرسہ کے مقدس ناموں کی آڑ میں ان مفاسد اور ضرر پہنچنے کو جائز قرار دینے کی جرات کر سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔

”وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“ (۲)

یعنی ضرر رسانی و فتنہ انگیزی قتل سے بھی بڑھ کر خطرناک ہے۔ فتاویٰ بحر الرائق میں ہے:

”إِنَّ الضَّرَرَ إِنْ كَانَ فَاجِشًا يُمْنَعُ“ (۳)

یعنی اگر کوئی شخص اپنے ملک میں اس طرح کا تصرف کرے کہ اُس سے دوسروں کو واضح ضرر پہنچے تو اسے ایسا کرنے سے منع کیا جائیگا۔

یہاں تک سوال 1، 2، 3، 4 اور 6 کا شرعی جواب واضح ہو گیا اُمید کرتا ہوں کہ اہل علم حضرات کو یہ اجمالی جواب بصیرت قلبی کا سامان فراہم کرے گا۔ اس کے علاوہ سوال نمبر 3 کا جواب یہ ہے کہ جس

(۱) ۱۔ جامع الصغیر شریف، ج 2، ص 370، مطبوعہ بیروت۔

۲۔ کشف الخفاء شریف، ج 2، ص 77، مطبوعہ بیروت۔

(۲) البقرہ، 191۔

(۳) فتاویٰ بحر الرائق، کتاب القضاء، ج 7، ص 33، مطبوعہ مصر۔

عورت کو یہ جگہ بطور سردوائی غیر دیئے جانے اور پچاس سال تک اُس پر سردوائی بنا کر مالکانہ تصرف کرنے اور حق رضاعت کے عوض میں دینے جیسے دعاوی کا شرعی ثبوت اس سوال نامہ میں لکھے ہوئے بیان کے مطابق اگر موجود ہو تو یقیناً اُس عورت کا اور اُس کے ورثاء کا حق اُس پر ثابت ہوگا ورنہ نہیں واللہ اعلم۔

لیکن اس قسم کے دعویٰ کی موجودگی میں اُسے کسی مدرسہ و مسجد کے لیے وقف کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کیوں کہ وقف کی جانے والی جائیداد کا ہر طرح کے شک و تردد اور قیل و قال سے پاک ہونا ضروری ہے اور مدرسہ و مسجد والے باوجود فریقین کی طرف سے ان متضاد دعوؤں کے اگر اُس پر عمارت تعمیر کر کے قبضہ جماتے ہیں تو حدیث شریف کے مطابق دو ذرخ میں اپنے لئے ٹھکانہ بناتے ہیں اللہ کے حبیب نبی اکرم رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ خُسِيفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ إِلَى سَبْعِ أَرْضَيْنِ“ (۱)

یعنی اگر کسی نے کچھ زمین ناحق لے کر استعمال کی تو قیامت کے دن اُسے سات زمینوں تک دھنسیا جائے گا۔

دین اسلام کے ایسے بدنام ٹھیکہ داروں کو جب اس قسم کی ناقابل تصور سزا ملے گی تو یہ مسجد و مدرسہ، یہ پڑھنا، پڑھانا اور تعلیم قرآن کی روپ میں خلق خدا پر عرب جمانے جیسے کوئی گر اُس عادل الحاکمین کی گرفت سے اُنہیں نہیں بچا سکے گا اس لیے علماء کرام حضرات کو خاص کر مساجد و مدارس کے ساتھ منسلک اصحاب مجہد و دستار حضرات کو پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا چاہیے کیوں کہ دین اسلام کے حوالہ سے سب سے بڑی ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے۔ (وَاللَّهُ أَعْلَمُ)

سوال نمبر 5 کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کا تعلق اسلامی تبلیغ کے شعبہ نبی عن المنکر سے ہے۔ اپنے حقوق کے طلب کرنے یا مظالم کے خلاف احتجاج و فریاد کرنے والوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق

(۱) بخاری شریف، ج 1، ص 332، ابواب المظالم باب اثم من ظلم شیئاً من الارض۔

نہیں ہے لہذا کسی فریادی مسلمان کے ساتھ سوشل بائیکاٹ جیسے حرام کاری کے جواز پر اس سے استدلال کرنا حضرت مولیٰ علیؑ کریم اللہ وجہہ الکریم کے فرمان ”کَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيدَ بِهَا الْبَاطِلُ“ سے مختلف نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت مولیٰ علیؑ نے آج سے چودہ سو سال (1400) قبل قرآن وحدیث سے غلط استدلال کرنے والے خوارج کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا جبکہ اب اس کا انطباق ہمارے اپنے ہی نادان مسلمان بھائیوں پر ہو رہا ہے۔ اس قسم کے غلط استدلال کر کے خلق خدا کو گمراہ کرنے والے حضرات کو چاہئے کہ توبہ کر کے اصلاح احوال کی طرف متوجہ ہوں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ اَكْمَلُ وَاَتَمُّ وَصَلَّ اللّٰهُ عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهِ وَمَظْهَرِ لُطْفِهِ وَاِلٰهِ الطَّيِّبِيْنَ

الطَّاهِرِيْنَ وَصَحَابَتِهِ اَجْمَعِيْنَ
خَرَرَهُ الْعَبْدُ الضَّعِيفُ..... پیر محمد چشتی

21/5/2003

☆☆☆☆☆

نماز جنازہ کی دعائیں اور تاریخ

ماہنامہ آوازِ حق پشاور میں ملی مسائل کا تحقیقی قادی شائع ہونے کو دیکھ کر ہمیں بھی اُمید پیدا ہوئی کہ ہمارے مندرجہ مسائل کا بھی تسلی بخش شرعی جواب شائع کیا جاسکتا ہے؛

مسئلہ نمبر 1:- بعض علماء کرام نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے زیادہ وقت لگاتے ہیں جبکہ بعض مختصر وقت لیتے ہیں پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ وقت لینے والے حضرات نماز جنازہ کی مشہور دعا کے علاوہ بھی کچھ مسنون دعائیں پڑھتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر بتایا جائے کہ وہ کونسی دعائیں ہیں؟ ان کا ثبوت حدیث کی کونسی کتابوں میں آیا ہے؟

مسئلہ نمبر 2:- مسلم سکا لرز و مصنفین نے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ جیسے اسلامی احکام کی تاریخ اپنی کتابوں میں بیان کی ہوئی ہیں کہ فلاں حکم فلاں سن اور فلاں مہینے میں نازل ہوا ہے جبکہ نماز جنازہ کے فرض ہونے کی تاریخ کسی نے بھی نہیں لکھی ہے۔ مہربانی کر کے بتایا جائے کہ یہ حکم ہجرت سے پہلے نازل ہوا یا ہجرت کے بعد اور کس سن ومہینہ میں نازل ہوا ہے؟

جواب کا منتظر: مولانا محمد سراج مورودیر تحصیل ملک ضلع چترال، 20/12/2004

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ نماز جنازہ پڑھانے والے جو امام حضرات مشہور دعا کے ساتھ دوسری دعائیں پڑھنے کی وجہ سے زیادہ وقت لیتے ہیں ان کا یہ عمل سنت نبوی ﷺ کے مطابق ہے۔ کیوں کہ اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ نے مختلف اوقات میں اور مختلف جنازوں پر مختلف قسم کی دعائیں پڑھی ہیں۔ مثال کے طور پر امام مسلم نے اپنی سند کے مطابق حضرت عوف ابن مالک الاشجعی ص کی روایت سے تخریج کی ہے کہ سرور کائنات رحمت عالم ﷺ نے ایک متوفی صحابی کی نماز جنازہ پر یہ دعا پڑھی؛

”اللَّهُمَّ اغْفِرْهُ وَأَرْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ وَاعْبِسْهُ بِالْمَاءِ
وَالشَّلْحِ وَالْبَرْدِ وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَأَبْدِلْهُ
ذَارًا خَيْرًا مِنْ ذَارِهِ وَأَخْلَا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ
مِنْ فَتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ“ (۱)

اور امام حاکم نے المستدرک علیٰ الحسین میں اپنی سند کے مطابق حضرت ابن عباس ص کی روایت سے تخریج کی ہے کہ آن سرور عالم ﷺ نے ایک اور صحابی کی نماز جنازہ پر مندرجہ ذیل دعا پڑھی ہے:

”اللَّهُمَّ عَبْدُكَ ابْنُ أُمِّكَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ لَا شَرِيكَ لَكَ وَيَشْهَدُ
أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ أَصْبَحَ فَقِيرًا إِلَى رَحْمَتِكَ وَأَصْبَحْتَ غَنِيًّا
عَنْ عَذَابِهِ تَخْلِي مِنَ الدُّنْيَا وَأَهْلِهَا إِنْ كَانَ رَاكِبًا فَرَكْهُ وَإِنْ كَانَ مُحْطِنًا فَأَغْفِرْ لَهُ
اللَّهُمَّ لَا تَحْرِمْ مَنَاجِرَهُ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ“ (۲)

اور محدث علی المتقی نے اپنی سند کے مطابق حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی روایت سے تخریج فرمائی ہے کہ سید عالم ﷺ نے ایک اور صحابی کے جنازہ پر یہ دعا پڑھی ہے:

”اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ وَابْنُ أُمِّكَ مَا ضَرَفَ فِيهِ حُكْمُكَ خَلَقْتَهُ وَلَمْ يَكْ شَيْئًا
مَذْكُورًا، أَنْزَلَ بِكَ وَأَنْتَ خَيْرُ مَنْزُولٍ بِهِ اللَّهُمَّ لَقْنَهُ حُجَّتَهُ وَالْحَقُّهُ بِنَبِيِّهِ
مُحَمَّدًا ﷺ وَبَيَّنَّتْهُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فَإِنَّهُ افْتَقَرَ إِلَيْكَ وَاسْتَغْنَيْتَ عَنْهُ كَانَ يَشْهَدُ
أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَأَغْفِرْ لَهُ وَأَرْحَمْهُ وَلَا تَحْرِمْ مَنَاجِرَهُ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ
رَاكِبًا فَرَكْهُ وَإِنْ كَانَ خَاطِنًا فَأَغْفِرْ لَهُ“ (۳)

(۱) مسلم شریف، کتاب الجنائز، ج ۱، ص ۳۱۱۔

(۲) مستدرک، کتاب الجنائز، ج ۱، ص ۳۵۹۔

(۲) کنز العمال، کتاب الجنائز، ج ۱۵، ص ۷۱۸۔

الغرض سید عالم ﷺ اس حوالہ سے کسی خاص دعا کے پڑھنے کے پابند نہیں تھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اس کے سوا کسی اور خاص دعا کو پڑھنے کا پابند نہیں کیا گیا تھا کہ میت کے لیے استغفار کرے، بخشش کی دعا کریں اور بطور شفاعت بخشش کا سوال کرنے کے ساتھ ترقی درجات کی بھی التجا کرے چاہے جن مناسب الفاظ میں بھی ہو۔ اس کا فطری تقاضا بھی یہی تھا کہ صلوٰۃ جنازہ کے اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر اللہ کے حبیب ﷺ مختلف حالات کے حامل اموات کے جنازوں پر ان کے مناسب حال مختلف دعائیں پڑھتے۔ اس کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ نماز جنازہ من وجہ صلوٰۃ ہے اور من وجہ دعا ہے یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مطلق صلوٰۃ بھی نہیں ہے اور مطلق دعا بھی نہیں ہے کیوں کہ مطلق دعا کے لیے طہارت بدن، طہارت مکان و لباس شرط نہیں ہیں اور روبرو قبلہ ہونا، با وضو ہونا بھی ضروری نہیں ہے جبکہ صلوٰۃ جنازہ کے لیے یہ سب ضروری ہیں اور مطلق صلوٰۃ اس لیے نہیں ہے کہ اس کے لیے رکوع و سجود اور قرأت و قعود جیسے ضروری ارکان موجود نہیں ہیں، ایسے میں صلوٰۃ جنازہ کی حیثیت مطلق صلوٰۃ اور مطلق دعا کے مابین برزخ ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور من وجہ صلوٰۃ، من وجہ دعا ہونے کی اس بین بین و برزخی کیفیت کا فطری تقاضا ایسا ہی ہونا تھا کہ مطلق صلوٰۃ جیسے خشوع و انکساری کے ساتھ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر استغفار و شفاعت کی حالت میں مناسب حال دعا پڑھنے کے حوالہ سے اختیار مند ہوتے۔ جیسے مطلق صلوٰۃ کی صحت کے لیے مطلق قرأت القرآن کا ہونا فرض ہے ویسے ہی صلوٰۃ جنازہ کی صحت کے لیے میت کے لیے استغفار و شفاعت پر مشتمل دعا کا ہونا فرض ہے چاہے اس کے الفاظ اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ اپنی حکیمانہ نگاہ بصیرت کے مطابق جیسے بھی اختیار فرمائیں۔

یہ ہونا نماز جنازہ میں سرور کائنات رحمت عالم ﷺ سے مختلف اموات پر مختلف اوقات میں مختلف دعائیں پڑھنے کا بنیادی فلسفہ جس کے بعد افراد امت سید عالم ﷺ سے ثابت شدہ ان دعاؤں میں سے جسے بھی اختیار کریں جائز ہوگا لیکن اتنی بات ضروری ہے کہ جیسے مطلق صلوٰۃ کی صحت کے لیے اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ نے کتاب اللہ سے مطلق قرأت کو ناگزیر قرار دیا ہے ویسے ہی امت کے

لیے نماز جنازہ کی صحت کے لیے اُن دعاؤں میں سے کسی کو بھی پڑھنا ضروری قرار دیا ہے جو سرور کائنات رحمت عالم ﷺ سے ثابت ہیں جیسے مرفوع حدیث ”صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي“ یعنی ایسے نماز پڑھا کرو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ کا تقاضا ہے کیوں کہ یہ حدیث مطلق علیہ لفظ الصلوٰۃ کی جملہ انواع کو شامل ہے، چاہے نماز پنجگانہ ہو یا نماز عیدین، نفل ہو یا نماز جنازہ۔

نیز کیفیت صلوٰۃ کو شامل ہونے کی طرح قرأت صلوٰۃ کو بھی شامل ہے تو ظاہر ہے کہ سید عالم ﷺ کا مطلق صلوٰۃ کی تمام اقسام و انواع میں بطور قرأت صرف اور صرف قرآن شریف پڑھنا ہی ثابت ہے جبکہ صلوٰۃ جنازہ میں مختلف دعاؤں کے پڑھنے کا ثبوت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اصوات کی نماز جنازہ پر سید عالم ﷺ کا قرآن شریف کی کچھ آیات و سورۃ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت بھی بطور ثناء الہی اقتداً بسید الانام ﷺ کی نیت سے پڑھے تو عین کارِ ثواب ہوگا لیکن دعاؤں میں سید عالم ﷺ سے ثابت دعاؤں کو چھوڑ کر اپنی طرف سے کچھ اور پڑھنے کا جواز نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنا فرمان نبوی ”صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي“ کے امر و جوبی کی مخالفت ہونے کی بنا پر بالیقین ناجائز و ممنوع ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ مذکورہ تین دعاؤں اور صلوٰۃ جنازہ کی بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مشہور و معروف دعا کے علاوہ کون کون سی دعائیں ثابت ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چاروں کے علاوہ نو دعائیں سید عالم ﷺ سے اور بھی ثابت ہیں جو صحت عند الفقہاء کے معیار کے عین مطابق قابل عمل ہونے کی بنا پر اُن میں سے جسے بھی پڑھا جائے گا نماز جنازہ کا مقصد ادا ہو جائے گا، سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنے کا ثواب مل جائے گا اور دعا کے حوالہ سے نماز جنازہ کا فریضہ انجام پائے گا۔ فقہ حنفی پر روز اول سے لے کر ایک کی لکھی گئی تمام کتب فتاویٰ سے زیادہ ضخیم، زیادہ جامع اور زیادہ مفید ذخیرہ علم فتاویٰ رضویہ کی جلد 9، صفحہ 210 تا صفحہ 221 پر سرور کائنات رحمت عالم ﷺ سے ثابت ان تیرہ (13) مختلف دعاؤں کی پوری تفصیل بمع ترتیب و ترجمہ بیان فرمائی گئی ہے، جو بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرْنَا وَأَنْتَنِي

اللَّهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَاحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ اللَّهُمَّ لَا تُحَرِّمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنْنَا بَعْدَهُ“۔

”اللَّهُمَّ اغْفِرْهُ وَأَرْحَمْهُ وَعَافِهِ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَ السَّلْحِ وَالْبَرْدِ وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهِ وَأَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ“۔

”اللَّهُمَّ عَبْدُكَ ابْنُ أُمَّتِكَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ لَا شَرِيكَ لَكَ وَ يَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ رَسُولُكَ أَصْبَحَ فَقِيرًا إِلَى رَحْمَتِكَ وَ أَصْبَحْتُ غَنِيًّا عَنْ عَذَابِهِ تَخَلَّى مِنَ الدُّنْيَا وَ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ زَاكِيًا فَرَّجْكَ وَإِنْ كَانَ مُخْطِئًا فَاعْفِرْ لَهُ اللَّهُمَّ لَا تُحَرِّمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ“۔

”اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ وَابْنُ أُمَّتِكَ مَاضٍ فِيهِ حُكْمُكَ خَلَقْتَهُ وَلَمْ يَكْ شَيْئًا مَذْكُورًا، نَزَلَ بِكَ وَأَنْتَ خَيْرُ مَنْزُولٍ بِهِ اللَّهُمَّ لَقْنَهُ حُجَّتَهُ وَ الْحَقُّهُ بَنِيهِ مُحَمَّدٌ ﷺ وَثَبَّتَهُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فَإِنَّهُ افْتَقَرَ إِلَيْكَ وَاسْتَغْنَيْتَ عَنْهُ كَانَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَاعْفِرْ لَهُ وَأَرْحَمْهُ وَلَا تُحَرِّمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنْنَا بَعْدَهُ اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ زَاكِيًا فَرَّجْكَ وَإِنْ كَانَ خَاطِئًا فَاعْفِرْ لَهُ“۔

”اللَّهُمَّ عَبْدُكَ وَابْنُ أُمَّتِكَ احْتَاجَ إِلَى رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ غَنِيٌّ عَنْ عَذَابِهِ إِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَرِّدْ فِي إِحْسَانِهِ وَإِنْ كَانَ مُسِيئًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ“۔

”اللَّهُمَّ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ كَانَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنَّا إِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَرِّدْ فِي إِحْسَانِهِ وَإِنْ كَانَ مُسِيئًا فَاعْفِرْ لَهُ وَلَا تُحَرِّمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنْنَا

بَعْدَهُ“۔

”أَصْبَحَ عَبْدُكَ هَذَا قَدْ تَخَلَّى عَنِ الدُّنْيَا وَتَرَكَهَا لِأَهْلِهَا وَافْتَقَرَ إِلَيْكَ وَاسْتَغْنَيْتَ عَنْهُ كَانَ يَشْهَدُ أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَتَجَاوَزْ عَنْهُ وَالْحَقُّ بِنَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“۔

”اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبُّهَا وَأَنْتَ خَلَقْتَهَا وَأَنْتَ هَدَيْتَهَا لِلْإِسْلَامِ، وَأَنْتَ قَبَضْتَ رُوحَهَا وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِسِرِّهَا وَعَلَانِيَتِهَا جَنَّا شَفَعَاءَ فَاغْفِرْ لَهَا“۔

”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَخْوَانِنَا وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَآلِفَ بَيْنِ قُلُوبِنَا اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ فَلَانُ بْنُ فَلَانٍ وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُ“۔

”اللَّهُمَّ إِنْ فَلَانُ بْنُ فَلَانٍ فِي ذِمَّتِكَ وَحَبْلِي جَوَارِكَ فَقِهِ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ وَأَنْتَ أَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَمْدُ، اللَّهُمَّ فَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمَهُ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ“۔

”اللَّهُمَّ اجْرُهَا مِنْ الشَّيْطَانِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ، اللَّهُمَّ جَافِ الْأَرْضِ عَنْ جَنَبَيْهَا وَصَعِدْ رُوحَهَا وَلَقِّهَا مِنْكَ رِضْوَانًا“۔

”اللَّهُمَّ إِنَّكَ خَلَقْتَنَا وَنَحْنُ عِبَادُكَ أَنْتَ رَبُّنَا وَإِلَيْكَ مَعَادُنَا“۔

”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِنَاوِ أَخِرِنَاوِ حَيِّنَاوِ مَيِّتِنَاوِ ذَكْرِنَاوِ أَنْثَى وَصَغِيرِنَاوِ كَبِيرِنَاوِ شَاهِدِنَاوِ غَائِبِنَا اللَّهُمَّ لَا تَحِرْ مِنَّا جَرَّهُ وَلَا تَفْتِنَا بَعْدَهُ“۔

علماء کرام کو چاہئے کہ ان تمام دعاؤں کو یاد کر کے مسلمانوں کی نماز جنازہ میں پڑھا کریں۔ نماز جنازہ میت کی طرف سے اُس کے پسماندگان، عزیز واقارب، دوست واحباب اور اہل محلہ پر آخری حق ہونے کے ناطے اس بات کی متقاضی ہے کہ ان تمام دعاؤں کو حضور قلبی اور عجز وانکسار کے

ساتھ پڑھ کر اُس کی بخشش کی شفاعت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی جائے۔ اگر ممکن ہو تو ان تمام دعاؤں کو پڑھنے کا حق ادا کرنے کے بعد ان کے مطابق مزید کچھ التجائیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ جوازی پہلو کے اس فقہی نکتہ کی بنیاد پر حضرت امام احمد رضا نور اللہ مرقدہ الشریف نے فتاویٰ رضویہ کے محولہ بالا کے مطابق ان سب کو بیان کرنے کے بعد آخر میں اپنی طرف سے بھی ایک ایمان افروز دعا کا اضافہ فرمایا ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

”اللَّهُمَّ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ يَا بَدِيعَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِأَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ، اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اللَّهُمَّ إِنَّ الْكَرِيمَ إِذَا أَمَرَ بِالسُّؤَالِ لَمْ يَرُدَّهُ أَبَدًا وَقَدْ أَمَرْتَنَا قَدْ عَوْنَاوْادْنَتْ لَنَا فَشَفَعْنَاوْ أَنْتَ أَكْرَمُ الْأَكْرَمِينَ فَشَفَعْنَا فِيهِ، وَارْحَمَهُ فِي وَحْدَتِهِ فِي وَحْشَتِهِ وَارْحَمَهُ فِي غُرْبَتِهِ وَارْحَمَهُ فِي كُرْبَتِهِ وَأَعْظَمْ لَهُ أَجْرَهُ وَنَزِّلْهُ قَبْرَهُ وَبَيِّضْ لَهُ وَجْهَهُ وَبَرِّدْ لَهُ مَضْجَعَهُ وَعَطِّرْ لَهُ مَنْزِلَهُ وَأَكْرِمْ لَهُ نَزْلَهُ يَا خَيْرَ الْمُنْزِلِينَ يَا خَيْرَ الْغَافِرِينَ وَيَا خَيْرَ الرَّاحِمِينَ آمِينَ آمِينَ آمِينَ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَى سَيِّدِ الشَّافِعِينَ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“۔

یہاں تک سوال نامہ کے حصہ اول کا جواب مکمل ہوا اور حصہ دوم کا جواب یہ ہے کہ نماز جنازہ کی فرضیت کا حکم ہجرت نبوی سے قبل یعنی مکی زندگی میں نازل نہیں ہوا تھا۔ بعثت نبوی ﷺ کے دسویں سال حضرت ام المومنین حمزہ اسلام خدمتِ اکبری رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی جن کی تدفین اُس وقت کے رواج کے مطابق بغیر نماز جنازہ کے ہوئی جس کی وجہ بتاتے ہوئے امام زرقانی نے لکھا ہے:

”وَلَمْ تَكُنْ يَوْمَئِذٍ الصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَازَةِ“ (۱)

یعنی اُن دنوں میں نماز جنازہ کی فرضیت مشروع نہ ہوئی تھی۔

نیز الاصابۃ فی تمییز الصحابہ میں امام المحدثین شہاب الدین ابن حجر نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے
”تَوَفِّيَتْ لِعَشْرِ خَلَوْنَ مِنْ رَمَضَانَ وَهِيَ بِنْتُ خَمْسٍ وَسِتِّينَ سَنَةً ثُمَّ أَسْنَدَ مِنْ حَدِيثِ حَكِيمِ ابْنِ حِزَامٍ أَنَّهَا تَوَفِّيَتْ سَنَةَ عَشْرِ مِنَ الْبُعْثَةِ بَعْدَ خُرُوجِ بَنِي هَاشِمٍ مِنَ الشَّعْبِ وَذُفِنَتْ بِالْحُجُونِ وَنَزَلَ النَّبِيُّ ﷺ فِي حُفْرَتِهَا وَلَمْ تَكُنْ شَرَعَتْ الصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَازَةِ“ (۲)

رمضان کے دس دن گزر جانے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وفات ہوئیں جبکہ وہ بیسٹھ سال کی عمر میں تھیں اس کے بعد واقدی نے حکیم ابن حزام کی یہ حدیث اپنی سند کے ساتھ بیان کی کہ حضرت خدیجہ بخت نبوی ﷺ کے دسویں سال فوت ہوئیں بنو ہاشم کا شعب عبدالمطلب سے نکلنے کے بعد اور حجون کے قبرستان میں دفنائی گئیں۔ اللہ کے رسول ﷺ اُن کی قبر میں اترے اور اُن دنوں میں نماز جنازہ مشروع نہ ہوئی تھی۔

اور ہجرت کے بعد سب سے پہلے جس کی نماز جنازہ پڑھائی گئی وہ حضرت اسعد بن زرارۃؓ کی ذات تھی جو ہجرت کے نویں مہینے میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔ حافظ الحدیث شہاب الدین ابن حجر عسقلانی نے الاصابۃ فی تمییز الصحابہ میں امام واقدی، ابن اسحاق اور امام بغوی کے حوالہ سے بالترتیب لکھا ہے:

”وَذَكَرَ الْوَاقِدِيُّ أَنَّهُ مَاتَ عَلَى رَأْسِ تِسْعَةِ أَشْهُرٍ مِنَ الْهَجْرَةِ، رَوَاهُ الْحَاكِمُ فِي الْمُسْتَدْرَكِ مِنْ طَرِيقِ الْوَاقِدِيِّ عَنِ ابْنِ أَبِي الرَّجَالِ وَفِيهِ، فَجَاءَ بَنُو النَّجَّارِ

(۱) الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، ج ۱، ص ۲۹۶۔

(۲) الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، ج ۴، ص ۲۸۳ مطبوعہ مصر۔

فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ مَاتَ نَفِيسُنَا، فَتَقَبَّ عَلَيْنَا، فَقَالَ: أَنَا نَفِيسُكُمْ، وَذَكَرَ ابْنُ اسْحَاقَ أَنَّهُ مَاتَ وَالنَّبِيُّ ﷺ بَيْنَى الْمَسْجِدِ، وَقَالَ الْوَاقِدِيُّ كَانَ ذَلِكَ فِي شَوَّالٍ، قَالَ الْبَغَوِيُّ بَلَّغْنِي أَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ مَاتَ مِنَ الصَّحَابَةِ بَعْدَ الْهَجْرَةِ وَأَنَّهُ أَوَّلُ مَيِّتٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ“ (۱)

یعنی امام واقدی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت اسعد ابن زرارۃؓ کی وفات ہجرت نبوی کے نویں مہینے کے آغاز میں ہوئی۔ حاکم نے ابن ابی الرجال سے واقدی کی سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ اُن کی وفات پر اُن کی قوم کے لوگ بنو نجار کے انصار نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارے زعیم وفات پا گئے ہیں۔ ہمارے لیے دوسرے زعیم مقرر فرما لیں تو اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارا زعیم ہوں اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ حضرت اسعد ابن زرارۃؓ نے اُن دنوں میں وفات پائی جب اللہ کے رسول ﷺ مسجد شریف کی تعمیر میں مصروف تھے اور امام واقدی نے کہا ہے کہ یہ ماہ شوال کا واقعہ ہے اور امام بغوی نے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ ہجرت کے بعد صحابہ کرام میں سب سے پہلے وفات پانے والے صحابی ہیں اور وہ صلوة جنازہ کی مشروعیت کی تاریخ میں اولین شخص ہیں جن کی سب سے پہلے اللہ کے رسول ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ایک مغلطہ کا ازالہ:- الاصابۃ کی اس عبارت کو دیکھ کر بہت سوں کو حضرت اسعد ابن زرارۃؓ کی بعدالہجرت جملہ صحابہ کرام سے پہلے اور علی الاطلاق متوفی فی الاسلام ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔ دوسری کتابوں میں بھی موجود اُن عبارات کو اس کے ساتھ ملانے سے تو اس مغلطہ کا امکان زیادہ قوی ہو سکتا ہے جن میں حضرت اسعد ابن زرارۃؓ کو جملہ صحابہ کرام سے پہلے بعدالہجرت وفات پانے والا قرار دینے کے ساتھ جنت البقیع کے بھی اولین مدفون ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے ان عبارات کے حقیقی

(۱) الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، ج ۱، ص ۳۴، مطبوعہ مصر۔

مفہوم کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

اس حوالہ سے اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کے طبقہ مہاجرین میں سب سے پہلے وفات پانے والے شخصیت حضرت عثمان ابن مظعون ص ہیں اور جنت البقیع کے بھی مہاجرین کی صف میں سب سے پہلے مدفون یہی ہیں جن کو صاحب ہجرتین ہونے، اللہ کے رسول ﷺ کے رضاعی بھائی ہونے اور مہاجرین کے زمرہ میں جنت البقیع کے اولین مدفون ہونے کی خصوصیات کے علاوہ یہ تاریخی کمال بھی حاصل ہے کہ قبر پر سنگ سنت کی تاریخ بھی اُن کی مقدس ذات کے ساتھ وابستہ ہے کہ اُن کی تدفین کے بعد منصور اللہ کے حبیب ﷺ نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ وہ پتھر اٹھا کر لائے تاکہ ان کی قبر پر بطور سنگ سنت علامت رکھا جائے وہ صحابی جا کر اُسے اٹھانہ سکے تو اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ نے خود جا کر اُسے اٹھالائے اور قبر پر رکھ کر ”أَعْلِمُ بِهِ قَبْرَ أَخِي وَأُذِّنُ إِلَيْهِ مَنْ مَاتَ مِنْ أَهْلِي“ (مرقاۃ شریا مشکوٰۃ، ج 2، ص 379، کتاب الجنائز) کا تاریخی ارشاد فرما کر سنگ سنت کی تاریخ کا آغاز فرمانے کے ساتھ حتی الامکان خاندانوں کی یکجا تدفین کرنے کے استحباب کا بھی اشارہ دے دیا۔

اور حضرت اسعد ابن زرارہ ص کو جملہ صحابہ کرام سے پہلے وفات پانے والے ہونے کے ساتھ جنت البقیع کے بھی سب سے اولین مدفون ہونے کی جتنی بھی روایات ہیں اُن میں صرف اور صرف صحابہ کرام کے طبقہ انصار مراد ہیں گویا ان متضاد روایات کے مابین تطبیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر روایت کے اندر اولیت سے مراد اولیت اضافی ہے حقیقی نہیں۔ جس کے مطابق معنی اس طرح ہونگے کہ صحابہ کرام کے طبقہ مہاجرین میں ہجرت کے بعد سب سے پہلے وفات پانے والے حضرت عثمان ابن مظعون ص ہیں جبکہ طبقہ انصار میں ہجرت کے بعد سب سے پہلے وفات پانے والے اسعد ابن زرارہ ص ہیں۔

یہی حال جنت البقیع کے اولین مدفون ہونے کے حوالہ سے بھی متضاد روایات کی تطبیق کا ہے کہ طبقہ مہاجرین میں سے اولین مدفون البقیع ہونے کا شرف حضرت ابوالسائب عثمان ابن مظعون ص کو حاصل

ہے جبکہ طبقہ انصار میں یہ شرف حضرت اسعد ابن زرارہ ص کو حاصل ہے۔ ہماری اس توجیہ پر دلیل صحابہ کرام کا کردار ہے کہ جب انصار کرام میں سے کوئی شخص حضرت اسعد ابن زرارہ کے اول مدفون البقیع ہونے کو فخر یہ انداز میں ذکر کرتا تو مہاجرین بھی حضرت عثمان ابن مظعون ص کا اول مدفون البقیع ہونے کا ذکر کر کے اُسے اپنے لیے شرف سمجھتے جیسے الاصابہ میں امام واندی کے حوالہ سے لکھا ہے؛

”قَالَ أَوَّلُ مَنْ دُفِنَ بِالْبَقِيعِ أَسْعَدُ ابْنِ زَرَّارَةَ هَذَا قَوْلُ الْأَنْصَارِ وَأَمَّا الْمُهَاجِرُونَ فَقَالُوا أَوَّلُ مَنْ دُفِنَ بِهِ عُثْمَانُ ابْنُ مَطْعُونٍ“ (۱)

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَسْرَارِهِ وَأَحْكَامِهِ

خَزَنَةُ الْعَبْدِ الضَّعِيفِ

پیر محمد چشتی

☆☆☆☆☆

(۱) الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ج 1، ص 34، مطبوعہ مصر۔

﴿احکام شرعیہ کی تفصیل﴾

میرا سوال یہ ہے کہ آواز حق شمارہ نومبر 2007ء کے صفحہ 14 میں احکام شرعیہ کی بالا جمال تین تفسیر اور بالتفصیل چار قسمیں بتاتے ہوئے چار میں سے صرف ایک قسم کو محل اجتہاد بتایا ہے جبکہ صفحہ 15 ضروریات دینیہ کے مقابلہ میں باقی تینوں کو قابل اجتہاد بتایا گیا ہے کیا یہ تدافع وتعارض نہیں ہے؟ محمد صدیق مولانا معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول شہر وانا جنوبی وزیرستان..... 22/11/2007

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں پر چار میں سے صرف ایک قسم کو محل اجتہاد کہا گیا ہے وہیں پر اجتہاد سے مراد فقہی اور اصطلاحی اجتہاد ہے اور اس کے بعد ضروریات دینیہ کے ماسوا باقی تینوں کو جو محل اجتہاد کہا گیا ہے وہیں پر اجتہاد سے مراد عام ہے جو اجتہاد فقہی لغوی اور عرفی تینوں کو شامل ہے لہذا وہ دونوں مقام درست ہیں تدافع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ اجتہاد کے دو مفہوم ہیں: ایک عام، دوسرا خاص۔

عام سے ہماری مراد اس کا لغوی مفہوم ہے جو مشقت اور محنت طلب کام کو پانے کے لیے حتی المقدور کوشش کرنا ہے جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی غیر صریح کلام سے مراد متکلم کو پانے کے لیے غور و فکر کیا جائے، دینی کاوش برداشت کی جائے اور فکری استطاعت کے مطابق محنت کی جائے۔ جیسے مفردات امام راغب میں ہے:

”وَالْاجْتِهَادُ اخْذُ النَّفْسِ بِبَذْلِ الطَّاقَةِ وَتَحْمِلِ الْمُسْقَئَةِ يَقَالُ جَهَدْتُ رَايِي وَاجْهَدْتُهُ اتَعَبْتُهُ بِالْفِكْرِ“ (۱)

یعنی اجتہاد کے معنی نفس انسانی کا اپنی طاقت کے مطابق محنت و مشقت کرنے کے ہیں، کہا جاتا

(۱) مفردات القرآن امام راغب الاصفہانی، مادہ (ج، ۵)، ص 100، مطبوعہ مصر۔

ہے کہ میں نے اپنی رائے قائم کرنے میں محنت کی اور کہا جاتا ہے کہ میں نے اس پر محنت کی یعنی اپنی قوت فکری کو اس کی تلاش میں تھکا دیا۔

لسان العرب میں ہے: ”وَالْاجْتِهَادُ وَالتَّجَاهُدُ بَذْلُ الْوُسْعِ وَالْمَجْهُورُ“ (۱)

المنجد میں ہے: ”اجتهد في الامر اجتهاداً وبذل وسعة“ (۲)

خاص اجتہاد سے ہماری مراد فقہی اجتہاد ہے جس کو قیاس فقہی بھی کہا جاتا ہے جو کسی غیر منصوصی اور جدید پیش آمد ہونے والے مسئلہ کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے اس کے منصوصی اشیاء و نظائر کی علت تلاش کر کے ان کے احکام کو اس پر جاری کرنے سے عبارت ہے یعنی منصوصی حکم جس علت پر مبنی ہے پیش آمدہ مسئلے کو بھی اسی پر مبنی قرار دے کر اس کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے فکری کاوش کی جائے، جیسے المستصفیٰ میں ہے:

”صَارَ اللَّفْظُ فِي عَرَفِ الْعُلَمَاءِ مَخْصُوصًا بِبَذْلِ الْمُجْتَهِدِ وَسُعَةِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ بِأَحْكَامِ الشَّرِيعَةِ“ (۳)

یعنی اجتہاد کا لفظ فقہاء کرام کے عرف میں خاص ہو چکا ہے مجتہد کا شریعت کے احکام کو جاننے کے لیے اپنی فکری استطاعت کو صرف کرنے کے ساتھ۔

مسلم الثبوت میں ہے:

”وَالْاجْتِهَادُ بَذْلُ الطَّاقَةِ مِنَ الْفَقْهِ فِي تَحْصِيلِ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ ظَنِّيٍّ“ (۴)

تحریر الاصول ابن ہمام میں ہے:

(۱) لسان العرب، ج 3، ص 135۔

(۲) المنجد، ص 106، مادہ (ج، ۵)۔

(۳) المستصفیٰ امام غزالی، ج 2، ص 350۔

(۴) مسلم الثبوت، ص 276۔

”هِيَ لُغَةٌ بَذَلُ الطَّاقَةِ فِي تَحْصِيلِ ذِي كُلْفَةٍ وَاصْطِلَاحًا ذَلِكَ مِنَ الْفَقِيهِ فِي تَحْصِيلِ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ ظَنِّي“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ لغت کی زبان میں اجتہاد کسی مشقت والی چیز کو پانے کے لیے فکری طاقت استعمال کرنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح کی زبان میں کسی شرعی حکم کو حاصل کرنے میں قوت فکری استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے ابن امیر الحاج نے تقریر والتجیر میں فرمایا:

”وَالْمُرَادُ بِبَذَلِ الْوَسْعِ اسْتِفْرَافُ الْقُوَّةِ بِحَيْثُ يَحْسُ بِالْعَجْزِ عَنِ الْمَزِيدِ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ شرعی احکام کو پانے کے لیے قوت فکری صرف کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس حد تک فکری محنت کریں کہ اس سے زیادہ کچھ کرنے سے عاجز ہونے کا احساس پیدا ہو جائے۔

منہاج الوصول الی علم الاصول قاضی بیضاوی میں ہے:

”هُوَ اسْتِفْرَافُ الْجُهْدِ فِي ذَرْبِ الْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ“ (۳)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ احکام شرعیہ کو پانے کے لیے حتی المقدور فکری قوت کو صرف کرنا۔

اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ اجتہاد کا یہ مفہوم حتی المقدور فکری قوت کو صرف کرنے کے ساتھ کچھ چیزوں کا بھی متقاضی ہے مثلاً مافیہ الاجتہاد کا انسانی فعل ہونا، حکم شرعی فرعی اور متعلق بافعال المكلفین ہونا اور منصوص علیہ حکم کے ساتھ مافیہ الاجتہاد کا مشترک فی العلت ہونا اور اصل علت کا ثابت بال نص ہونا، اور

(۱) تحریر الاصول، ابن ہمام، ص 291۔

(۲) التقرير والتجیر، ج 3، ص 291، مطبوعہ بیروت۔

(۳) منہاج الوصول الی علم الاصول علی هامش التقرير والتجیر، ج 3، ص 284،

مطبوعہ بیروت

اصل حکم کا مادراء العقل والقیاس نہ ہونا جبکہ اجتہاد کی پہلی قسم مافیہ الاجتہاد میں اللہ تعالیٰ کی مراد کو تلاش کرنے کے لیے حتی المقدور قوت فکری کے سوا کسی اور چیز کی متقاضی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی مفہوم اول دوسرے مفہوم سے عام ہے وہ یہ ہے کہ اجتہاد کا لفظ شریعت کی زبان میں یعنی عرف شرع میں لغوی مفہوم سے تو خاص ہے جبکہ اصطلاحی مفہوم سے عام ہے کیوں کہ لغت کی زبان میں اس کا مفہوم ”بَذَلُ الْجُهْدِ فِيمَا فِيهِ كُلْفَةٌ“ کے سوا اور کچھ نہیں ہے یعنی مشکل مسئلہ کو سمجھنے کے لیے حتی المقدور جدوجہد کرنا۔ جبکہ عرف شرع میں ”بَذَلُ الْجُهْدِ فِي تَحْصِيلِ الْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ النَّظَرِيَّةِ الْأُصُولِيَّةِ وَالْفُرُوعِيَّةِ“ ہے اور فقہاء کرام کی مخصوص اصطلاح میں ”بَذَلُ الْجُهْدِ فِي تَحْصِيلِ الْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ النَّظَرِيَّةِ الْفُرُوعِيَّةِ“ ہے جس کے مطابق لغوی مفہوم کا متعلق الہیات کے سوا بھی بہت کچھ ہو سکتے ہیں مثلاً عقلیات، لسانیات اور طبعیات وغیرہ جبکہ عرفی مفہوم کا متعلق الہیات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی اصول الہیات وفروع الہیات کو یکساں شامل ہے لیکن فقہاء کرام کی اصطلاح والا مفہوم الہیات کے فروع کے ماسوا اور کسی چیز کو بھی شامل نہیں ہے گویا اجتہاد کا اصطلاحی مفہوم خاص ہے لغوی مفہوم اعم العام ہے اور عرفی مفہوم من وجہ خاص، من وجہ عام ہے یعنی لغوی مفہوم کے مقابلہ میں خاص اور اصطلاحی مفہوم کے مقابلہ میں عام ہے۔

اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر نہایت السول فی شرح منہاج الوصول کے مصنف ”امام جمال الدین الاسنوی“ نے قاضی بیضاوی کی بیان کردہ مذکورہ تعریف کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

”وَقَوْلُهُ الشَّرْعِيَّةُ خَرَجَ بِهِ الْغَوِيَّةُ وَالْعَقْلِيَّةُ وَالْحِسِّيَّةُ وَدَخَلَ فِيهِ الْأُصُولِيَّةُ

وَالْفُرُوعِيَّةُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ الْمُرَادُ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ مَا تَقَدَّمَ فِي أَوَّلِ الْكِتَابِ

وَهُوَ خُطَابُ اللَّهِ تَعَالَى الْمُتَعَلِّقُ بِأَفْعَالِ الْمُكَلِّفِينَ بِالْإِقْضَاءِ أَوْ التَّخْيِيرِ“ (۱)

یعنی اجتہاد کی تعریف میں احکام شرعیہ کا لفظ جو کہا گیا ہے اس سے احکام لغوی، عقلی اور حسی نکل

(۱) نہایت السول فی شرح منہاج الوصول علی هامش التقرير والتجیر، ج 3، ص 286۔

گئے کہ اجتہاد کے مفہوم کا ان کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا جبکہ احکام اصولی و فروعی یعنی اعتقادی و عملی اس میں داخل ہو گئے مگر یہ کہ احکام شرعیہ سے مراد وہ لیا جائے جو اس کتاب کے شروع میں بیان ہوا ہے کہ شرعی حکم سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب ہے جو مکلفین کے افعال کے ساتھ متعلق ہے چاہے اقتضائی ہو یا اختیاری۔

فقہاء کرام کے علاوہ متکلمین اسلام نے بھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی عقائد کی دو قسمیں بتائی ہیں جیسے شرح عقائد میں انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی رسل ملائکہ پر اور رسل ملائکہ کی عام مسلمانوں پر اور عام مسلمانوں کی عام فرشتوں پر فضیلت کے اسلامی عقیدہ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

”إِنَّ الْمَسَائِلَ الْإِعْقَادِيَّةَ قِسْمَانِ أَحَدُهُمَا مَا يَكُونُ الْمَطْلُوبُ فِيهِ الْيَقِينُ كَوَحْدَةِ الْوَاجِبِ وَصِدْقِ النَّبِيِّ ﷺ وَثَابِتِهِمَا مَا يَكْتَفَى فِيهَا بِالظَّنِّ كَهَذِهِ الْمَسْئَلَةِ وَالْإِكْتِفَاءُ بِالذَّلِيلِ الظَّنِّي إِنْ مَالَ لَا يَجُوزُ فِي الْأَوَّلِ بِخِلَافِ الثَّانِي“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ بالیقین اعتقادی مسائل و احکام کی دو قسمیں ہیں جن میں سے اول وہ ہیں جنکے ساتھ یقین کرنا مطلوب فی الاسلام ہوتا ہے۔ جیسے واجب الوجود کو ایک جاننے کا عقیدہ اور رسول اللہ کی صداقت پر عقیدہ رکھنا اور دوسری قسم وہ ہیں جن میں غالب گمان پر اکتفا کیا جاسکتا ہے جیسے انسانوں اور ملائکہ کے مابین تفاضل کا مسئلہ ہے اور ظنی دلیل پر اکتفا کرنا صرف پہلی قسم میں جائز نہیں ہوتا۔

مفہیم ثلاثہ اجتہاد کے حوالہ سے اس تحقیق کو سمجھنے کے بعد مذکورہ مقامات سے مدافع کا اشتباہ آپ ہی رفع ہو جاتا ہے کیوں کہ پہلے جس مقام پر ہم نے شرعی احکام کی چار قسمیں بتانے کے بعد ان میں سے صرف ایک کو محل اجتہاد کہا ہے اس سے مراد فقہی اجتہاد ہے جس کے مطابق کچھ اجتہادی احکام ضرورت

(۱) النبراس علی شرح العقائد، ص 598۔

مذہبی کے قبیل سے ہو سکتے ہیں جن سے انحراف کرنے والے یا انحراف و تکذیب کی یقینی علامت کا ارتکاب کرنے والوں پر لزوم کفر کا فتویٰ صادر کرنا جائز ہے نہ التزام کفر کا کیوں کہ لزوم کفر اور التزام کفر کا تعلق صرف اور صرف ضروریات دینیہ کی تکذیب یا تکذیب کی یقینی علامت کے ارتکاب کرنے کیساتھ ہے جب یہ ضرورت دینی ہی نہیں ہیں تو ان سے انحراف کرنے والوں کی تکفیر کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ اور بعد میں جس مقام پر شرعی احکام کی تین قسموں کو قابل اجتہاد کہا ہے، وہیں پر صرف فقہی اجتہاد کیساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اپنے عموم و اطلاق کی بناء پر اجتہاد کے مفہیم ثلاثہ کو شامل ہے جسکے مطابق ضروریات دینیہ کے سوا باقی تینوں میں سے قسم دوم کا محل اجتہاد ہونے سے مراد عرفی اور فقہی اجتہاد ہیں۔

عرفی کے زمرہ میں اسلامی اعتقادات کے حصہ ظنیات کے تمام جزئیات آتے ہیں جس کی مثالوں میں عذاب قبر سے متعلق اہل سنت اور اہل اعتزال کے متضاد عقائد، اوصاف باری تعالیٰ کی تفصیل سے متعلقہ اہل سنت اور دیگر اہل قبلہ فرقوں کے متضاد عقائد جیسے وہ تمام اعتقادی ظنی مسائل شامل ہیں جو اہل قبلہ کے مابین اختلافی ہیں، جن سے ہر فرقہ کی کتب کلامیہ میں بحث کی جاتی ہے اور جن پر قطعی الثبوت والدالالت براہین کتاب و سنت میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہر فرقہ نے حق کی پہچان کی خاطر اپنی قوت فکری کو اس حوالہ سے صرف کرنے میں انہما کر دی، عرف شرع کے مطابق اس اجتہاد کے نتیجہ میں جس فرقہ کے سلف نے جو فتویٰ صادر کیا وہی اس فرقہ کے خلف کے لیے ضرورت مذہبی قرار پائے جن کو ہر فرقہ کی کتب کلامیہ میں اعتقادات ظنیہ اور ضروریات مذہبیہ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے شرح عقائد اور نبراس کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں جبکہ فقہی اجتہاد کے زمرے میں اہل قبلہ کے مختلف فقہی مسالک کے مابین پائے جانے والے تمام اختلافی فقہی مسائل شامل ہیں جن کو ہر فقہی مسلک کی کتب فقہ میں بیان کیا جاتا ہے، کنز الدقائق اور ہدایہ میں مذکور فقہی احکام کے 95% مسائل اسی قبیل سے ہیں گویا شرعی احکام کے ضروریات دینیہ والی قسم کے ماسوا باقی تینوں میں سے اول قسم کی دو قسمیں ہیں؛ اول:- اعتقادات ظنیہ ہیں جن کا تعین و تشخیص کرنے میں ہر فرقہ کے اوائل و اسلاف نے عرفی

اجتہاد سے کام لیا ہے۔

دوم:- فقہی اور فروعی احکام ہیں جن کا تعین و تشخیص کرنے میں ہر مسلک کے اوائل و اسلاف نے فقہی اجتہاد سے کام لیا ہے۔

جبکہ ان دونوں کے مقابلہ میں قسم سوم و چہارم والے احکام ہیں جو غیر بدیہی ہونے کی وجہ سے بطور حصہ اسلام ثابت کئے جانے کے حوالہ سے تفصیلی دلیل کے محتاج ہیں جس کے ضمن میں لغوی اجتہاد بھی پایا جاتا ہے کیوں کہ ہر نظری اور محتاج دلیل بات کو ثابت کرنے کے لیے فطری عمل تفصیلی دلیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور جہاں پر بھی تفصیلی دلیل ہوتی ہے وہیں پر لغوی اجتہاد کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے مثال کے طور پر قسم سوم کے مسائل میں سے گزشتہ مثالوں کے مطابق مطلقہ کے لیے ایام عدت کا ناان نفقہ و سکنی کا خاوند پر واجب ہونے کو بطور اسلام ثابت کر کے بے خبر لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کے لیے جب تفصیلی دلیل میں کہا جاتا ہے کہ:

یہ حصہ اسلام اس لیے ہے کہ اللہ کا حکم ہے۔

اور اللہ کا ہر حکم حصہ اسلام ہوتا ہے۔

لہذا یہ بھی حصہ اسلام ہے۔

تو لغوی اجتہاد کا مفہوم اس کے اندر پایا گیا جس کی بدولت استدلال کرنے والے کی قوت فکری کی رفتار حد اصغر سے حد اوسط کی طرف منتقل ہوئی اور ساتھ ہی حد اوسط سے حد اکبر کی طرف منتقل ہوئی اس کے بعد ترقی حرکت میں حد اکبر سے شروع ہو کر حد اوسط تک پہنچ گئی اس کے بعد حد اوسط سے حد اصغر تک پہنچ کر نتیجہ دیا، یہ سب کچھ لغوی اجتہاد کے ثمرات ہی تو ہیں۔

اسی طرح قسم چہارم کی مثالوں میں سے حسن اخلاق کا مطلوب فی الاسلام ہونے کا حکم جو بالا جماع حصہ اسلام ہے لیکن نظری ہونے کی بناء پر دیندار طبقہ کے کچھ حضرات کو معلوم نہیں ہیں جن کو سمجھانے کے لیے فقہی دلیل کے طور پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ:

یہ حصہ اسلام اس لیے ہے کہ مامور بنی الاسلام ہے۔

اور جو بھی مامور بنی الاسلام ہو وہ ہمیشہ حصہ اسلام ہوتا ہے۔

لہذا یہ بھی حصہ اسلام ہے۔

تو یہاں پر بھی نتیجہ کی برآمدگی لغوی اجتہاد کا ہی ثمر ہے۔ گویا شرعی احکام کی مذکورہ چار اقسام میں سے آخری تین کا کل اجتہاد ہونا ان تینوں کے مابین قدر مشترک ہے جبکہ قسم دوم میں پائے جانے والے اجتہاد کا عربی اور فقہی ہونا اور قسم سوم و چہارم میں پائے جانے والے اجتہاد کا لغوی ہونا ان کے مابین نکتہ تفریق ہے بہر تقدیر شرعی احکام کی مذکورہ اقسام اربعہ میں سے صرف قسم اول ”ضرورت دینیہ“ ہی لزوم کفر یا التزام کفر کا مصرف ہو سکتی ہے باقی تینوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے بلکہ ان تینوں سے انحراف کرنے والے کے خلاف بھی کفر کا فتویٰ صادر کرنا جائز نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ایک یا دو کی تکذیب کرنے والے کی تکفیر جائز ہو سکے۔

مفہیم ثلاثہ اجتہاد میں ایک بنیادی فرق:-

اصل اعتراض کا جواب یہاں تک مکمل ہو گیا کہ لزوم کفر اور التزام کفر کا تعلق شریعت کے ان احکام کے ساتھ ہے جو ضروریات دین کے قبیل سے ہیں اور ان کے سوا باقی تین قسمیں قابل اجتہاد ہونے کی وجہ سے تکفیر سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ اجتہاد کی نوعیت ان سب میں یکساں نہیں ہے تاہم کسی حوالہ سے نفاذ ان سب میں موجود ہے جبکہ تکفیر کے متعلق کا من کل الوجوہ ظاہر، واضح اور صریح و بدیہی ہونا شرط ہے یہاں تک کہ تکفیر سے بچنے کے لیے ایک فیصد نفاذ و احتمال موجود ہو پھر بھی تکفیر جائز نہیں ہوتی۔ مذکورہ اعتراض کے اس جواب کی تکمیل کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ مفہیم ثلاثہ اجتہاد میں جو بنیادی فرق ہے اس کو بھی واضح کر دوں وہ یہ ہے کہ اجتہاد کا جو لغوی مفہوم ہے اس پر عمل کرنا دین اسلام کے حوالہ سے جملہ نوع بنی آدم پر فرض ہے جس میں مسلم غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ جبکہ باقی دو مفہوم یعنی اجتہاد کے عربی و فقہی مفہوم پر عمل کرنا صرف مسلمانوں پر لازم ہے بلکہ مسلمانوں کے بھی خصوصی طبقہ

کالمین پر جو اجتہاد کی اہلیت رکھتے ہیں گویا اجتہاد کی ان دونوں قسموں پر عمل کرنا اسلام کے اُن احکام میں شامل ہے جو اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھ کر التزام اسلام کرنے والے خوش بختوں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ تفریق کے اس فلسفہ سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اسلام کی توفیق عطا کرنے کے بعد قابلِ اجتہاد چیزوں سے بچنے کی ہدایات دینے سے بے اعتنائی نہیں فرماتا۔

کیوں کہ کلمہ طیبہ پڑھ کر التزام کرنا بنیاد ہے جبکہ دوسرے اعمال اس کے فروغ و ترویج ہیں۔ جب تک ایک انسان اصل کو گلے نہیں لگاتا تو اس کے توابع و فروغ کو اس کے گلے میں ڈالنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کے جملہ فروعی احکام التزام اسلام کے توابع ہونے کی بنیاد پر مسلمانوں پر ہی عائد ہوتے ہیں اور ان کے ثمرات و برکات سے مستفیض ہونا بھی مسلمانوں کا ہی خاصہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی ہدایت پائی ہے اللہ تعالیٰ ان کے لیے احکام کی ہدایت افزوں فرماتا ہے۔

اس کے برعکس غیر مسلموں سے متعلق فرمایا:

”وَنُزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا“ (۳)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ التزام اسلام کرنے والوں کے لیے ہم قرآن شریف سے شفاء و رحمت نازل کرتے ہیں جبکہ یہی احکام رحمت غیر مسلموں کیلئے افزونی زیاں کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

(۱) التوبہ، ۱۱۵۔

(۲) مریم، ۷۶۔

(۳) بنی اسرائیل، ۸۲۔

غیر مسلموں کا فروعی احکام کے ساتھ مکلف ہونے یا نہ ہونے کے حوالہ سے اگرچہ اسلاف کے ذخیرہ کتب میں اختلاف پایا جاتا ہے، اگرچہ مکلفیت کا قول مرجوح ہے، نا قابلِ قبول ہے اور فروغ کو اصول کے مساوی قرار دینے کے مترادف ہونے کی بنیاد پر غیر معقول ہے تاہم اتنا غلط بھی نہیں ہے جتنا غیر مسلموں پر لغوی اجتہاد کے فرض نہ ہونے کا قول کرنا غلط ہے کیوں کہ اسلام کے تمام بنیادی احکام توحید سے لے کر رسالت تک اور بعث بعد الموت کے عقیدہ سے لے کر مجازۃ اعمال کی حقانیت تک جتنے بھی ہیں ان کی حقانیت کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جملہ نوع بنی آدم کو قوت فکری صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور ماحولیاتی اثرات و تقلیدی پابندیوں سے یک طرفہ ہو کر اس کی حقانیت کو عقل کے ترازو میں محض قوت فکری کے عمل سے تولنے کی ترغیب دی ہے۔ جیسے فرمایا:

”قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَحْيِهِ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَشْئًى وَقَدْ آذَىٰ ثُمَّ تَنفَكُّوْا وَأَمَّا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جَنْبٍ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے حبیب ﷺ! تم فرمادو کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے لیے دو، دو اور اکیلے اکیلے ہو کر کھڑے رہو پھر سوچو کہ تمہارے پیغمبر میں کوئی جنون نہیں ہے۔

تقلیدی اثرات اور معاشرتی آلودگیوں سے اپنی قوت فکری کو پاک و صاف اور خالی الذہن کر کے اس کی حقانیت پر سوچنے کی ترغیب دیتے ہوئے دوسری جگہ فرمایا:

”لَا يَمْسَسُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ (۲)

یعنی اس کی حقانیت کو نہیں چھو سکیں گے مگر وہی لوگ جو معاشرتی آلودگی سے پاک و صاف ذہن سے اس پر غور کریں گے۔

الغرض اسلامی عقائد کے حوالہ سے کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں ہے جس کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے

(۱) النساء، ۴۶۔

(۲) الواقعة، ۷۹۔

کفار و مشرکین کو آزاد ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنے اور اپنی قوت فکری کے اجتہاد کو اس میں کھپانے کی ترغیب نہ دی ہو۔ لغت کی زبان میں بھی اجتہاد کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ کسی قابل محنت اور مشکل چیز کو پانے کے لیے قوت فکری کی کاوش میں انتہا کر دی جائے جس پر کتب لغت اور عربی محاورات کا حوالہ گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ کفار و مشرکین کے لیے توحید و رسالت اور بعث بعد الموت جیسے بنیادی عقائد اسلام کو سمجھنا سب سے زیادہ مشکل نظر آتا تھا تبھی تو انہوں نے کہا:

”أَجْعَلِ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر کا ہمارے تمام خداؤں کو ختم کر کے صرف ایک خدا کی طرف بلانا قابل تعجب بات ہے۔

مزید مشکل و ناممکن تصور کرتے ہوئے کہا:

”اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوْ إِنْتَبِإْ بَعَذَابِ الْيَمِّ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے واقعی بات ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا دردناک عذاب ہم پر لا۔

غیر مسلموں کے اس طرح کے تعصب زدہ اور ماحول پرستی کی اندھی تقلید میں مبتلا لوگوں کی ماحولیاتی مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مرآت و کرات ان کو خالی الذہن ہو کر سوچنے کا فرمایا۔ ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بھی انہیں تعصب اور مخصوص ذہنی ترجیحات سے دل و دماغ کو یک طرف کر کے صرف قوت فکری کو حاکم بنانے کی ترغیب دی۔ سمجھانے کے حوالہ سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کبھی بھی ان پر سختی نہیں فرمائی۔ سمجھانے کی حد تک ان کے ساتھ

(۱) ص ۵۰۔ (۲) الانفال، ۳۲۔

کریمانہ انداز خطاب اختیار کرتے ہوئے ”الْأَعْرَابِ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ الْأَيْغُلُمُوا حُدُودَنَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ“ (التوبہ، ۹۷) فرما کر رہتی دنیا تک اسلامی مبلغین کو ان کے ساتھ نرمی برتنے کی راہ دکھائی۔

رحمت عالم ﷺ نے ابو جہل جیسے دشمنان اسلام کے ساتھ بھی کبھی تبلیغ کے حوالہ سے سختی نہیں فرمائی۔ جب غیر مسلموں کے ساتھ محراب و منبر کے حوالہ سے اتنی نرمی برتی گئی ہے تو پھر اہل قبلہ کو کسی اجتہادی و نظری حکم سے انحراف کی بنیاد پر غیر مسلم قرار دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ بلکہ اجتہاد کے مفاد میں تلاش میں سے ہر ایک کا پایا جانا تکفیر سے مانع ہے۔ اس حوالہ سے اگر اشتباہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف اجتہاد کے لغوی مفہوم کے اعتبار سے ممکن تھا جو ہماری اس تحقیق سے رفع ہو گیا کیوں کہ کسی بات کا نظری یا بدیہی ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ اگر نظری ہے تو ہر وقت، ہر شخص کے لیے اور ہر اعتبار سے نظری ہو۔ اگر بدیہی ہے تو ہر وقت، ہر شخص کے لیے اور ہر اعتبار سے بدیہی ہو نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک شخص کے نزدیک بدیہی دوسرے شخص کے نزدیک نظری ہو سکتا ہے جیسے دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے کی کیفیات کا علم بینائی والے شخص کو بدیہہ حاصل ہے جبکہ یہی کیفیت پیدائشی نابینا کے لیے نظری ہے اسی طرح جب تک قوت سماعت درست ہے اس وقت تک آواز کی خوب صورتی و بد صورتی کی کیفیات کو جاننا بدیہی ہے جبکہ قوت سماعت کا جواب دیئے جانے کے بعد یہی کیفیت نظری بن جاتی ہے۔ علی ہذا القیاس سنائی دینے والی آواز کی کیفیت کو جاننا اس کی طرف متوجہ اور تندرست شخص کے لیے بدیہی ہے جبکہ اسی آواز کی قوت سماعت تک رسائی کی نوعیت کو جاننا نظری ہے کہ کس طرح ہوا کی لہروں میں محفوظ ہو کر اس کے اتصالی رابطہ کے ذریعہ قوت سماعت تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح جو شخص اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہو یا کوئی اور مانع موجود ہو تو اس کے لیے بھی اس کو جاننا ممکن نہیں ہوتا چاہے بدیہی ہو۔

یہی حال دین اسلام کے بنیادی عقائد کا بھی ہے کہ التزام اسلام کرنے والا شخص چونکہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اندھی تقلید اور تعصب کی آلودگیوں سے اس کا دل و دماغ محفوظ و سلامت ہوتا ہے اور

ماحولیاتی قید و بند کی رکاوٹوں کو توڑ چکا ہوتا ہے تو پھر توحید باری تعالیٰ کی حقانیت کو جاننا اس کے لیے بدیہی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا، رسول خدا ﷺ کی صداقت کو پہچاننا اس کے لیے ضروری نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا، دنیوی زندگی کی شکل میں ہزاروں خلائق میں قدرت باری تعالیٰ کی عظمت کو مشاہدہ کرنے کے بعد بعث بعد الموت کو ممکن الوقوع اور سچ جاننے میں اس کے لیے کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جب تک کوئی رکاوٹ و موانع آڑے نہیں آئیں گے اور شیطان کے تسلط سے جب تک محفوظ رہے گا اس وقت تک دین اسلام کی ان بنیادی باتوں کو بدلیہ نہ جانتا رہے گا بخلاف غیر مسلموں کے کہ خلاف اسلام تعصب کے ماحول اور اسلام کے منافی مذہب کی قید بند ان کے لیے ایسے موانع ہیں جن کے ہوتے ہوئے اپنے کمال وضوح و بداہت کے باوجود اسلام کے بنیادی عقائد و احکام ان کے نزدیک نظری ہی نظری ہیں۔ قربان جاؤں اللہ کے فرمان پر ”الْاَعْرَابِ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ اُنْفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهِ“ (البقرہ، 97) کس جامع انداز سے فطرت کی عکاسی فرمائی ہے۔ اندھی تقلید کے حصار میں محصور لوگوں کو سمجھانے کے لیے فکری اجتہاد کی ترغیب دینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ جب ماحولیاتی رکاوٹوں معاشرتی آلودگیوں اور اکابر پرستی کی اندھی تقلید کی رکاوٹوں کی وجہ سے دین اسلام کے بدیہی عقائد اور بنیادی تعلیمات کو سمجھنا کفار و مشرکین کے نزدیک نظری قرار پائے اور وہ ان کے حوالہ سے ”اَلْاِنْسَانُ عَدُوُّ الْمَاجِہِلِ“ کے مصداق ٹھہرے تو ان احکام سے متعلق انہیں سمجھا کر اتمام حجت کرنے یا ان کی حقانیت کے قائل کرانے کے لیے اجتہاد فکری کی ترغیب دینے کے سوا کوئی اور صورت ممکن الفہم ہی نہیں ہے تو جس اجتہاد فکری کی ترغیب اللہ تعالیٰ نے اور اس کے معصوم پیغمبروں نے دی ہے وہ اجتہاد کے مذکورہ مفہیم ثلاثہ میں سے پہلی قسم یعنی لغوی اجتہاد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کیوں کہ باقی دو مفہوم یعنی اجتہاد عرفی اور فقہی مسلمانوں کا خاصہ ہونے کی بنا پر غیر مسلموں کو ان کی ترغیب دینے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے جبکہ کسی بھی نظری چیز کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے فکری اجتہاد کی ترغیب دینے اور اسے اپنانے کے سوا کوئی اور ذریعہ فہم غیر مسلموں

کے حق میں اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہیں فرمایا ہے۔ (اَلَا مَآ شَاءَ اللّٰہ)

ہماری اس تحقیق سے اجتہاد کے مفہیم ثلاثہ میں سے لغوی مفہوم کا باقی دونوں سے زیادہ عام بلکہ اعم العام ہونے کا فلسفہ بھی واضح ہو گیا کہ اجتہاد عرفی اور اجتہاد فقہی میں پائے جانے کے ساتھ ان کے بغیر بھی پایا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی تکفیر چاہے التزام کفر کی شکل میں ہو یا لزوم کفر کی صورت میں بہر تقدیر ضروریات دین سے متجاوز نہ ہونے کا فلسفہ بھی معلوم ہو گیا کہ اصلی کفر اور عارضی کفر میں صرف ارتداد کا فرق ہے کہ عارضی کفر میں جملہ ضروریات دین کا التزام کرنے کے بعد ارتداد کا عارضہ ہو جاتا ہے اور اصلی کفر میں ارتداد انہیں ہے جبکہ مافیہ الکفر دونوں میں ضروریات دین کے سوا کوئی اور شے نہیں ہے اور دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ عارضی کفر میں مرتد ہونے والوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:- مافیہ الکفر کو جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ اختیار کرے جس کو کافر معاند اور مرتد معاند کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم:- مافیہ الکفر کا ارتکاب انجانے میں کرے کہ جس قول و عمل کو دیدہ و دانستہ طور پر اپنی رضامندی و اختیار کے ساتھ وجود میں لا رہا ہے وہ صراحتاً ملت اسلام کی تکذیب یا کسی ضرورت دینی کی تکذیب ہو یا اس تکذیب کی یقینی علامت ہو یا ملت اسلام کی ضد و نقیض یا اس کے کسی ضرورت دینی والا حصہ کی ضد یا نقیض کا صریح ارتکاب ہو یا ایمان کے کسی لازمہ کی ضد یا نقیض کا صریح ارتکاب ہو۔

ان تمام صورتوں میں التزام کفر غیر عنادی ہوتا ہے اور دارالافتاء کے لیے قابل احتیاط و جائے خطر بھی ارتداد کی یہی شکلیں ہیں جبکہ عنادی ارتداد میں مرتد ہونے والے کا اپنا کردار و اقرار اس کے ارتداد کا مظہر و اشتہار ہونے کی بناء پر دارالافتاء کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی جبکہ اصلی کفر ہمیشہ عنادی ہی ہوتا ہے چاہے عناد حقیقی ہو یا حکمی۔ اصلی کفر اور عارضی کفر کی ان شکلوں میں مابہ الامتیاز کو جس نکتہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے بہر تقدیر ضرورت دینی کی تکذیب کرنے کے حوالہ سے اصل مابہ الکفر کا قطعاً کوئی فرق

نہیں ہے۔ کفر اصلی کی نوعیت جو بھی ہو، بہر تقدیر ہر غیر مسلم کو دعوت اسلام دینا تمام اہل قبلہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے جس اسلام کی طرف انہیں دعوت دی جاتی ہے اس کی حقانیت کو جاننا اہل قبلہ کے نزدیک بدیہی اور ضرورت دینی ہونے کے باوجود ان غیر مسلموں کے نزدیک نظری ہے اور محتاج دلیل ہے۔ لہذا اصول فطرت کے عین مطابق انہیں فکری اجتہاد کی ترغیب دیئے، تقلیدی مذہب اور تعصب سے خالی الذہن ہو کر صرف اور صرف قوت فکری کو حاکم بنا کر اجتہادی کاوش کی راہ پر ڈالنے کے سوا کوئی اور چارہ کار مسلم مبلغ کے پاس کل تھا نہ آج ہے اہل علم جانتے ہیں کہ اجتہاد کا لغوی مفہوم بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

خلاصہ الکلام:- لزوم کفر ہو یا التزام کفر بہر تقدیر اس کا مورد و محل ضروریات دینیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے لہذا ہر دارالافتاء کو تکفیری فتویٰ صادر کرنے سے قبل ان حقائق کو پیش نظر رکھنا لازم ہے ورنہ تکفیر مسلم کا مرتکب ہو سکتا ہے جو بجائے خود کفر کے قریب گناہ کبیرہ ہے۔ (أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ) اسی خطر کے پیش نظر فتاویٰ بحر الرائق کے مصنف اور دیا مصریہ کے عظیم مفتی اسلام نے ضروریات دینیہ کے سوا کسی بھی اجتہادی مسئلہ سے متعلق تکفیری فتویٰ صادر کرنے سے اجتناب کا التزام کرتے ہوئے فرمایا:

”وَلَقَدْ أَلْزَمْتُ نَفْسِي أَنْ لَا أُفْتِيَ بِشَيْءٍ مِنْهَا“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے کسی بھی اجتہادی مسئلہ سے متعلق منکر پر کفر کا فتویٰ نہ دینے کا التزام کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿لَوَازِمَاتِ خَمْسَةِ إِيْمَانٍ﴾

میرا سوال یہ ہے کہ اصول تکفیر کی جو چودہ قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے پہلی چار قسمیں یعنی ملت اسلام سے انکار یا اُس کی کسی ضرورت دینی والے حکم سے انکار، اسی طرح ملت اسلام کی ضد کا یا اُس کے کسی ضروری حکم کی ضد کا ارتکاب کرنے میں التزام کفر ہونا تو ظاہر ہے جبکہ باقی دس قسموں کا دار و مدار ایمان کے لوازمات خمسہ پر ہے کہ جب تک جذبہ عمل، محبت، تعظیم، تسلیم و رضا اور مومن بہ کے منافی جملہ مذاہب و حرکات سے بیزاری و نفرت کو بطور لازمہ ایمان ثابت نہیں کیا جاتا۔ اُس وقت تک یہ سب کے سب صیغہ خفاء میں ہیں ان میں التزام کفر واضح نہیں ہوتا اور ان کو لازمہ ایمان کے طور پر ثابت کرنے کے لیے قرآن و سنت کے نصوص کے ساتھ تقاضا عقل بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ اسلامی عقیدہ کی بحث ہے جس میں مسائل اعتقادیہ کا ثبوت عقلی دلائل سے ہونے کے ساتھ نصوص شرعیہ کی تائید پانا ضروری ہے۔ ایسے میں التزام کفر کی مذکورہ دس قسمیں وضاحت طلب ہیں۔

السائل..... قاری محمد انور بیگ، خطیب جامع مسجد سنہری، صدر پشاور

جواب اس کا یہ ہے کہ ایمان کے مذکورہ لوازمات خمسہ کا ثبوت عقلاً بھی ہے، شرعاً بھی اور سلف صالحین کے شرعی فتوؤں سے بھی اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل تین مسلمات کو بطور تمہید سمجھنا ضروری ہے۔

اول:- ایمان و کفر باہمی مخصوص ضدین ہیں کہ ایک کا وجود آپ ہی دوسرے کی نفی ہے۔ جس کے بعد اُس کی نفی پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جس کے نتیجہ میں ایک شخص ایک وقت میں مومن ہو گیا کافر، یعنی ایمان و کفر سے خالی بھی نہیں ہو سکتا اور دونوں اُس کے اندر جمع بھی نہیں ہو سکتے۔

دوم:- ہر چیز کو پوری طرح پہچاننے کے لیے نظام قدرت کے مطابق دو طریقے مقرر ہیں؛ پہلا طریقہ:- اُس کی ذاتیات کے ذریعہ سے جیسے انسان کو حیوان و ناطق کے واسطے سے پہچانا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ:- اُس کے لوازمات کے ذریعہ سے جیسے انسان کی پہچان اُس کے نام و نشان و شکل و صورت، گفتار و کردار کے واسطے سے ہوتی ہے۔

اسی طرح ایمان و کفر میں سے ہر ایک کبھی اپنی ذات و حقیقت سے پہچانا جاتا ہے اور کبھی لوازمات سے اسی طرح جہاں تک ایمان کی حقیقت ہے وہ ملت اسلام اور اُس کے تمام ضروری احکام کے ساتھ تصدیق بالقلب اقرار باللسان کرنے کا نام ہے۔ اس کے لوازمات میں وہی چیزیں آسکتی ہیں جن کے بغیر اس کا اعتبار نہیں ہوتا، اس کے وجود و عدم برابر ہوتے ہیں اور یہ اپنی موجودگی کے باوجود کالعدم ہوتا ہے اُن کی تعیین و تشخیص کے لیے قرآن و سنت کے مواقع استعمال کا متبع و استقراء کے ساتھ بزرگان دین کی تعبیرات و تشریحات کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔

سوم:- بزرگان دین اور کل مکاتب فکر آئمہ مجتہدین کے قابل ذکر مفتیان کرام نے تصدیق بالقلب اقرار باللسان کی موجودگی کے باوجود بعض افعال و اقوال کو بالیقین التزام کفر قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر؛

- (۱) معصیت کو حلال و جائز سمجھنا۔ (۲) معصیت کو ہلکا جان کر اُس سے کراہت نہ کرنا۔
- (۳) ملت اسلام یا اُس کے کسی حکم پر استہزاء کرنا۔
- (۴) زنا اور ناحق قتل کرنے کے حرام نہ ہونے کی آرزو کرنا۔
- (۵) اللہ تعالیٰ کے کسی مقدس نام یا صفت یا کام کو مذاق بنانا، اُس پر استہزاء کرنا۔
- (۶) نبی کی بعثت کے نہ ہونے کی تمنا کرنا۔ (۷) کسی کو کافر ہونے کا مشورہ دینا۔
- (۸) کسی قسم کے کفر کو پسند کرنا۔ (۹) کسی کو کافر ہونے کا مشورہ دینے کا پکا ارادہ کرنا۔

(۱۰) بلا جبر و اکراہ جان بوجھ کر بغیر وضو کے نماز پڑھنا۔

(۱۱) بت، چاند یا سورج کو سجدہ کرنا۔ (۱۲) پیغمبر کو قتل کرنا۔ (۱۳) پیغمبر کو گالی دینا۔

(۱۴) پیغمبر کی کسی صفت کو حقیر چیز کے ساتھ تشبیہ دینا۔

(۱۵) کسی اور مخلوق کو کسی کمال میں پیغمبر سے زیادہ افضل بتانا۔

(۱۶) نبی آخر الزمان رحمت عالم ﷺ کے بعد کسی دوسرے نبی کے پیدا ہونے کو جائز بتانا۔

(۱۷) بیت اللہ شریف کی توہین کرنا یا قرآن شریف کی توہین کرنا۔

(۱۸) سنت نبوی ﷺ کی توہین کرنا یا اُس پر استہزاء و تضحیک کرنا۔

(۱۹) زنا را باندھنا۔ (۲۰) فتنہ لگانا۔

الغرض اس قسم کے درجنوں اقوال و افعال کو کل مکاتب فکر علماء اعلام و مفتیان اسلام نے التزام کفر قرار دیا ہے جبکہ اس کا قائل مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور ملت اسلام اور اُس کے تمام ضروری احکام کے ساتھ تصدیق قلبی و اقرار لسانی بھی رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان و کفر ایک شخص میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے۔ ایسے میں کل مکاتب فکر علماء اسلام و مفتیان کرام کا بیک آواز ایسے مدعیان ایمان کو کافر و مرتد قرار دینے کا فلسفہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے واقعات میں مؤمن بہ کی ضد کا یعنی ملت اسلام یا اُس کے جس ضروری حکم پر ایمان و تصدیق کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اُس کی ضد کا ارتکاب کیا گیا ہے یا ایمان کے لوازمات میں سے کسی لازمہ کی ضد یا نقیض کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ ان دو صورتوں سے خالی ہونے کی صورت میں دنیا کے کسی بھی مفتی کو اُسے کافر و مرتد قرار دینے کی جرات نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ کہ کل مکاتب فکر علماء اعلام و مفتیان اسلام متفقہ طور پر اُس کو اسلام سے خارج قرار دیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مفتیان اسلام خود شارع نہیں ہوتے کہ جس کو چاہے ایمان قرار دیں اور جس کو چاہے کفر و ارتد اقرار دیں، نہیں ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ حقیقی علماء کرام و مفتیان اسلام قرآن و سنت سے مفہوم ہونے والے اصولوں کی روشنی میں یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اسلام کے

ان تینوں مسلمات کو سمجھنے کے بعد اصل مسئلہ آپ ہی واضح ہو جاتا ہے کیوں کہ قرآن و سنت کے ساتھ تقاضائے عقل سے بھی مذکورہ پانچ چیزیں ایمان کے لازمہ کے طور پر ناگزیر قرار پاتی ہیں۔ جن میں سے مُؤْمِنِ بے کے ساتھ محبت کا لازمہ ایمان ہونے اور اُس کی ضد یا نفیض کے ارتکاب کرنے کی صورت میں ایمان کا عدم ہونے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ“ (۱)

مشرکین کی اپنے جھوٹے خداؤں کے ساتھ محبت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کے ساتھ اہل ایمان کی محبت کو زیادہ قوی اور مضبوط بنانے کا واضح فلسفہ دو چیزیں ہیں:

پہلی چیز:- مشرکین کی اپنے جھوٹے خداؤں کے ساتھ جو محبت ہے وہ ہمیشہ قائم و دائم نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اُس کی بھیجی ہوئی ملت اسلام اور اُس کے جملہ ضروری احکام کے ساتھ مومنوں کے دلوں میں جو محبت ہے وہ ہمیشہ قائم و دائم اور لاینفک لازمہ ایمان ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی ضد یعنی عداوت و کراہت یا اُس کی نفیض یعنی عدم محبت کی صورت میں ایمان غیر معتبر اور کالعدم ہوتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے:

”لَا يُؤْمَرُ مِنْ أَهْلِكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ“ (۲)

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے مُؤْمِنِ بے کے حوالہ سے اپنی ذات اقدس کا جو ذکر فرمایا ہے، یہ اکتفاء بالفرد الاعلیٰ کے قیل سے ہے۔ ورنہ مُؤْمِنِ بے کے ہر فرد کا یہی حال ہے اور یہی انداز کلام مذکورہ آیت کریمہ میں بھی ہے کہ اُس میں اللہ تعالیٰ نے مُؤْمِنِ بے کی طویل فہرست اور ایمان مفصل میں معتبر جملہ ضروریات دینیہ میں سے صرف اپنی ذات کو بطور اکتفاء بالفرد الاعلیٰ ذکر فرمایا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت کا لازمہ ایمان ہونے کی طرح ملت اسلام اور اُس کے جملہ ضروری احکام کے ساتھ محبت کا بھی یہی حال ہے۔ جس پر دلیل یہ ہے کہ ملت اسلام ساتھ بغض و

عداوت یا نفرت و کراہت یا اُس کے کسی بھی ضروری حکم سے نفرت و کراہت یا بغض و عداوت رکھنے والے اشخاص کو کل مکاتب فکر اہل اسلام میں غیر مومن سمجھا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ“ (۱)

دوسری چیز:- اہل ایمان کے دلوں میں مُؤْمِنِ بے کے ساتھ جو محبت ہے اُس کے ساتھ جذبہ عمل بھی ہے کہ ہر مومن چاہے باعمل ہو یا بے عمل بہر حال مُؤْمِنِ بے کے ساتھ جذبہ عمل ضرور رکھتا ہے جبکہ مشرکین جذبہ عمل کا التزام کئے بغیر مخصوص ماحولیاتی رنگ میں رنگین اور باطل تقلید کی بنا پر جھوٹے خداؤں کے ساتھ مشرکانہ عمل کرتے ہیں جب مشکل میں پھنس جاتے ہیں تو اس کو بھی چھوڑ کر حقیقی خدا واحد لا شریک سے فریاد کرتے ہیں جبکہ مومن کے دل سے جذبہ عمل کسی حال میں بھی ختم نہیں ہوتا بالفرض اگر ختم ہو جائے تو وہ مومن بھی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی انسان ملت اسلام اور اُس کے تمام ضروری احکام کے ساتھ تصدیق قلبی و اقرار لسانی کا دعویٰ کرنے کے ساتھ جذبہ عمل کی ضد یعنی مُؤْمِنِ بے کے برعکس عمل کرنے کا جزم کرے یا اُس کی نفیض یعنی جذبہ عمل کے عدم یعنی اسلام پر عمل نہ کرنے کا جذبہ دل میں جمائے تو مومن نہیں کہلاتا۔ جس کی واحد وجہ یہی ہے کہ مُؤْمِنِ بے پر عمل کرنے کا جذبہ ایمان کے لیے لازم ہے جس کی ضد یا نفیض کی موجودگی آپ ہی اُس کے عدم کی دلیل ہے جس کے بعد اُس کی نفی پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب لازمہ ایمان منتهی ہوا تو ایمان بھی منتهی ہوا کیوں کہ لازمہ کی نفی آپ ہی ملزوم کی نفی پر دلیل ہے جس کے بعد اُس کی نفی پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مذکورہ آیت کریمہ کا جذبہ عمل اور محبت کا لازمہ ایمان ہونے پر دلالت کرنے کے علاوہ سورۃ حجرات کی یہ آیت کریمہ بھی مُؤْمِنِ بے کے ساتھ ایمان کو محبت لازم ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔

جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”حَبَبَ إِلَيْكُمْ الْإِيْمَانُ وَزَيْنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ“ (۱)

مومن بہ کی تعظیم کا لازمہ ایمان ہونے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَنْ يُعْظِمِ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی محترم کی ہوئی چیزوں کی جو بھی تعظیم کرے گا وہ اُس کے لیے اللہ کی نظر میں خیر ہوگا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ مومن بہ یعنی ملت اسلام اور اُس کے جملہ ضروری احکام محترم عند اللہ ہیں۔ جن کی تعظیم ہر مومن مسلمان کے دل میں موجود ہوتی ہے ورنہ اس کی ضد یعنی توہین یا نفیض یعنی عدم تعظیم کے ارتکاب کرنے والے کا اُس کے ساتھ اقرار لسانی و تصدیق قلبی کا عدم قرار پاتی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”لَتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا“ (۳)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لانے کے ساتھ اُن کی تعظیم و احترام کرو گے اور صبح و شام اُس کی پاکیزگی کا اظہار کرو گے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں بعثت رسول کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور اُن کے لائے ہوئے احکام پر ایمان لانے کے ساتھ تعظیم و احترام بھی کیا جائے۔ جیسے ذات اللہ، افعال اللہ، صفات اللہ اور احکام اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ اُن سب کی تعظیم و احترام لازمہ ایمان اور مقصد بعثت نبوی ﷺ بتایا گیا ہے۔ ویسے ہی پیغمبر کریم ﷺ کی ذات و افعال، صفات و اسماء اور احکام پر ایمان کے ساتھ ان سب کی تعظیم و احترام کو بھی اس آیت کریمہ میں لازمہ ایمان بتایا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی تعظیم کی ضد یعنی توہین یا اُس کے

بالیقین نفیض کے ارتکاب کرنے والے کو خارج از اسلام سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی کسی صفت یا کسی سنت کی تعظیم کی ضد یعنی توہین کے ارتکاب کرنے والے کو بالاتفاق و بالا جماع خارج از اسلام سمجھا جاتا ہے جو اس کا لازمہ ایمان ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ”وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ“ (الحج، 32) بھی مومن بہ کی تعظیم کا ایمان کے لیے لازم ہونے پر دلالت کر رہا ہے کیوں کہ ملت اسلام اور اُس کا ہر ضروری حکم اللہ تعالیٰ کی پہچان کا ذریعہ ہے شعائر اللہ بھی اُن ہی چیزوں کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محترم قرار دیئے جانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پہچان کا ذریعہ بھی ہوں۔ ایسے میں سورۃ الحج، آیت نمبر 30 اور آیت نمبر 32 کا ہر مومن بہ کی تعظیم کا ایمان کے لیے لازمہ ہونے پر دلالت کرنے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ تسلیم و رضا کا لازمہ ایمان ہونے پر آیت کریمہ:

”فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے رب کی قسم وہ ہر گز ایمان والے نہیں ہوں گے جب تک اپنے معاملات میں تمہیں حاکم نہ بنائیں پھر تمہارے حکم پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور دل سے مکمل تسلیم و رضا کا اظہار کریں۔

ظاہر ہے کہ دل سے مکمل تسلیم و رضا کے بغیر ایمان نہ ہونے کا اس کے سوا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ یہ لازمہ ایمان ہیں جس کی نفیض کی یعنی عدم تسلیم و رضا کی موجودگی یا اس کی ضد یعنی ناراضگی و انکار کی موجودگی انتفاء ملزوم کی دلیل بن رہا ہے جس کے بعد ایسے شخص کے ایمان کی نفی کرنے پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی۔ اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے:

”ذَاقْ طَعْمُ الْإِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولًا“ (۲)

(۱) النساء، 65۔ (۲) مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان بحوالہ صحیح مسلم شریف۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان کا ذاتی اُفقہ اُسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اللہ کی ربوبیت پر اور اسلام کا ضابطہ حیات ہونے پر اور محمد ﷺ کے رسول اللہ ہونے پر راضی ہو۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر بھی جن تین مُسوّمَن بہ کا ذکر آیا ہے اُن میں سے ہر ایک اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو تسلیم کر کے اُس پر راضی ہونے میں ذات اللہ من حیث صفت الربوبیت کے ضمن میں جملہ افعال اللہ، صفات اللہ، اسماء اللہ اور احکام اللہ شامل ہیں کہ ان میں سے ایک ایک پر راضی ہو کر تسلیم کرنا ایمان کے لیے لازم ہے۔ جس کے بغیر ایمان کا ذاتی اُفقہ کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ملت اسلام کو ضابطہ حیات و دستور العمل کے طور پر تسلیم کر کے اُس پر راضی ہونا اُس کے اُن تمام احکام کو شامل ہے۔ جو ضروریات دین کے قبیل سے ہیں۔ جس کے مطابق ملت اسلام کے کسی ایک ضرورت دینی والے حکم پر راضی ہو کر تسلیم کرنے کی ضد یا اُس کی نفی کا صراحتاً ارتکاب کرنے والے شخص کو ذاتی ایمان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح محمد ﷺ کی رسالت پر راضی ہو کر اُسے تسلیم کرنے سے متعلق جو کلام ہے یہ بھی رسالت نبوی ﷺ کے جملہ لوازمات و تقاضوں کو شامل ہونے کے ساتھ ذات محمدی، سنت و افعال محمدی، صفات محمدی، اسماء محمدی اور احکام محمدی کی اُن تمام قسموں کو شامل ہے جو ضروریات دین کے قبیل سے ہیں کہ اُن پر ایمان تب قابل قبول و معتبر عند اللہ و عند الشرع ہو سکتا ہے۔ جب دل و جان سے اُن پر راضی ہو کر انہیں تسلیم کی جائیں ورنہ اس کی ضد یا نفی کی موجودگی میں دعویٰ ایمان ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا کیوں کہ ”وَجُودُ أَحَدِ الصّٰدِقِیْنَ ذَلِیْلُ عَدَمِ الْآخَرِ“ اور ”وَجُودُ أَحَدِ النّٰفِیِّیْنَ ذَلِیْلُ عَدَمِ الْآخَرِ“ اور ”اِنْتِفَاءُ الْاِیْمَانِ اِنْتِفَاءُ الْمَلْزُومِ“ بدیہیات کے قبیل سے ہیں جس کے بعد کسی اور دلیل کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ مُوّمَن بہ کے مقابلہ میں جملہ مذاہب باطلہ اور اُس کی ہر ضد و منافی کردار سے کراہت و نفرت کا لازمہ ایمان ہونا بھی قرآن و سنت سے مفہوم ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرٰهَیْمَ وَآلِہِیْمَ الَّذِیْنَ مَعَهُ اِذْ قَالُوْا لَقٰوْمُہُمْ اِنَّا بَرّٰؤُ

اِیْنُكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ كُفْرًا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَ الْبُغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰی تَوْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ“ (۱)

ملت ابراہیمی کے پابند ہونے کی بنا پر اُمتِ اجابت کے تمام مومنوں پر اس اُسوہ ابراہیمی کی پابندی کو اللہ تعالیٰ نے لازم قرار دیا ہے جو ایمان کے ساتھ ہی حاصل ہو جاتا ہے اور لازمہ ایمان ہونے کی بنا پر اُس کے بغیر ایمان کی بقاء کا امکان ہی نہیں ہے۔ جس کی اہمیت بتاتے ہوئے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے محض ظاہر داری میں اس کے خلاف کرنے کو بھی ناپسند فرمایا حالانکہ دل میں کراہت و نفرت اور بیزاری کے ہوتے ہوئے کسی جائز مصلحت کے لیے یا تنقیہ کے طور پر ایسا کرنے سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی اس کے باوجود محض ظاہر داری میں ایسا کرنے کو بھی ممنوع قرار دینے سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس کا لازمہ ایمان ہونے سے متعلق فرمایا:

”وَكُرْہُ الْیْكُمُ الْكُفْرُ وَالْفُسُوقُ وَالْعِصْیَانُ“ (۲)

اہل علم جانتے ہیں کہ جس قسم کا کفر اور فسق و عصیان بھی ہو یہ سب کے سب تقاضاء ایمان کے منافی ہونے کے ساتھ مُسوّمَن بہ کے بھی منافی ہیں، جس سے نفرت و کراہت کو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا لازمہ قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس کو ذاتی ایمان کا مدار اور لازمہ ایمان قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی اہمیت بتائی ہے:

”وَمَنْ یْكُفِّرْہٗ اَنْ یَّعُوْذَ فِی الْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْقَذَہُ اللّٰہُ مِنْہٗ كَمَا یْكُفِّرْہٗ اَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ“ (۳)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ کفر میں جانے سے ایسی نفرت و کراہت کرتا ہے جیسے آگ میں ڈالے

(۱) الممتحنہ، 4۔ (۲) الحجرات، 7۔

(۳) مشکوٰۃ شریف بحوالہ بخاری و مسلم، کتاب الایمان۔

جانے سے کراہت و نفرت کرتا ہے۔

وضاحت در وضاحت :- ایمان کے یہ پانچوں لوازمات اتنے واضح دیتے ہیں کہ سب کے سب لازم بین بالمعنی الاخص کے قبیل سے ہیں جس میں محض طرفین یعنی موضوع و محمول کے تصور سے ہی محمول کا اپنے موضوع کو لازم ہونے پر جزم و یقین حاصل ہو جاتا ہے جس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی جیسے لازم بین بالمعنی الاعم میں جزم و یقین کا حصول بعد تصور طرفین اُن کے مابین نسبت کو جانے پر موقوف رہتا ہے۔ لازم بین کو اس دوسرے مفہوم یعنی بالمعنی الاعم میں بھی جزم بالزوم کا حصول اگرچہ بدیہی ہوتا ہے کہ کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی تاہم بالمعنی الاخص اجلی البدیہیات کے قبیل سے ہے۔ مثال کے طور پر:

الایمان محبة المؤمن به :- کہنے میں ایمان اور محبت مؤمن بہ کے تصور سے آپ ہی محبت مؤمن بہ کا ایمان کو لازم ہونے پر جزم و یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

الایمان جذبة العمل بالمؤمن به :- کہنے میں ایمان اور جذبہ العمل بالمؤمن بہ کے تصور سے آپ ہی جذبہ العمل بالمؤمن بہ کا ایمان کو لازم ہونے کے ساتھ جزم و یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

الایمان تعظیم المؤمن به :- کہنے میں ایمان اور تعظیم المؤمن بہ کے تصور سے آپ ہی تعظیم المؤمن بہ کا ایمان کو لازم ہونے پر یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

الایمان هو التسليم والرضا بالمؤمن به :- کہنے میں ایمان اور تسلیم و رضا بالمؤمن بہ کے تصور سے ہی تسلیم و رضا بالمؤمن بہ کا ایمان کو لازم ہونے پر یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

الایمان هو النفرة والكرهة عن جميع مضاد المؤمن به :- کہنے میں بھی محض تصور طرفین سے ہی محمول کا اپنے موضوع کو لازم ہونے کے ساتھ آپ ہی یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

مزید وضاحت :- ایمان کے یہ لوازمات جو لازم المابیت اور لازم بین بالمفہوم الاخص ہیں تقاضاء عقل سے ثابت ہونے کے بعد قرآن و سنت کے مذکورہ نصوص سے تائید و توثیق اور تبرک پانے کے بعد بزرگان دین کے دستاویزات میں بھی مذکور ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اسلاف نے ان کا محض اشارہ دیا ہے۔ جیسے ابن ہمام نے المسامرہ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھا ہے:

”وَالْمَقْطُوعُ بِهِ أَنَّ الْإِيمَانَ وَضَعُ الْهَيْئَةِ عِبَادَةً وَرَتَّبَ عَلَى فِعْلِهِ لَا زِمًا هُوَ مَاشَاءٌ مِنْ خَيْرٍ بِلَا انْقِصَاءٍ وَعَلَى تَرْكِهِ ضِدُّهُ بِلَا انْقِصَاءٍ وَهَذَا لَا زِمُ الْكُفْرِ شَرْعًا وَأَنَّ التَّصَدِيقَ بِمَا أَخْبَرَهُ النَّبِيُّ مِنْ انْفِرَادِ اللَّهِ تَعَالَى بِالْأُلُوْهِيَّةِ وَغَيْرِهِ إِنَّمَا كَانَ عَلَى سَبِيلِ الْقَطْعِ مِنْ مَفْهُومِهِ وَأَنَّهُ أُغْتَبِرَ فِي تَرْتِيبِ لَزِمِ الْفِعْلِ وَجُودُ أُمُورٍ عَدَمِهَا مُتَرَتَّبٌ ضِدُّهُ كَتَعْظِيمِ اللَّهِ تَعَالَى وَأَنْبِيَاءِهِ وَكُتْبِهِ وَبَيْتِهِ وَتَرْكِ السُّجُودِ لِلصَّنَمِ وَنَحْوِهِ وَالْإِنْقِيَادَ هُوَ الْإِسْتِسْلَامُ إِلَى قَبُولِ أَوَامِرِهِ وَتَوَاهِيهِ الَّذِي هُوَ مَعْنَى الْإِسْلَامِ. وَقَدْ اتَّفَقَ أَهْلُ الْحَقِّ وَهُمْ قَرِيبًا الْأَشَاعِرَةُ وَالْحَنَفِيَّةُ عَلَى أَنَّهُ لَا إِيْمَانُ بِلَا إِسْلَامَ وَعَكْسُهُ..... فَيُمْكِنُ اغْتِبَارُ هَذِهِ الْأُمُورِ أَجْزَاءً لِمَفْهُومِ الْإِيْمَانِ فَيَكُونُ انْتِفَاءُ ذَلِكَ الْإِمْكَانِ عِنْدَ انْتِفَائِهَا لِانْتِفَاءِ الْإِيْمَانِ وَإِنْ وَجَدَ التَّصَدِيقُ وَغَايَةَ مَا فِيهِ أَنَّهُ نُقِلَ عَنْ مَفْهُومِهِ اللَّغْوِ الَّذِي هُوَ مُجَرَّدُ التَّصَدِيقِ إِلَى مَجْمُوعٍ هُوَ مِنْهَا وَلَا بَأْسَ بِهِ فَإِنَّا قَاطِعُونَ بِأَنَّهُ لَمْ يَبْقَ عَلَى خَالِهِ الْأَوَّلِ إِذْ قَدْ أُغْتَبِرَ الْإِيْمَانُ شَرْعًا تَصَدِيقًا خَاصًا وَهُوَ مَا يَكُونُ بِأُمُورٍ خَاصَةٍ وَإِنْ يَكُونُ بِالْعَالِ إِلَى حَدِّ الْعِلْمِ إِنْ مَعْنَى الْإِيْمَانِ الْمُقْلِدُ وَالْأَفَالَجُزْمُ الَّذِي لَا يَجُوزُ مَعَهُ ثُبُوتُ النَّقِیْضِ وَهُوَ فِي اللُّغَةِ أَعْمُ مِنْ ذَلِكَ وَيُمْكِنُ اغْتِبَارُهَا شَرْطًا لِإِغْتِبَارِهِ شَرْعًا فَيَنْتَفِي إِضًا لِانْتِفَائِهَا الْإِيْمَانُ مَعَ وَجُودِ التَّصَدِيقِ بِمَحْلِهِ وَلَا يُمَكِّنُ إِغْتِبَارُهَا شَرْطًا لِثُبُوتِ الْإِمْكَانِ الشَّرْعِيِّ فَقَطْ فَيَنْتَفِي عِنْدَ انْتِفَائِهَا مَعَ قِيَامِ

الْإِيْمَانِ لِأَنَّ الْفَرَضَ أَنْ عِنْدَ انْتِفَائِهَا يَبْثُ ضِدُّ لَازِمِ الْإِيْمَانِ وَهُوَ لَازِمُ الْكُفْرِ. عَلَى مَا ذَكَرْنَا فَيَبْثُ مَلْزُومُهُ وَهُوَ الْكُفْرُ“ (۱)

حضرت ابن ہمام نے اس جاندار عبارت کے اندر جن معارف و حقائق کو جمع کیا ہے۔ ہماری اس پوری تحریر کو اُس کی حقیقی تشریح قرار دیا جائے تو بے محل نہیں ہوگا۔ بعض اسلاف نے اس سے بھی زیادہ مختصر کر کے ایمان کے صرف دو لوازم کو ذکر کر کے باقی کا اشارہ دیا ہے۔ جیسے امام احمد رضا خان محدث بریلوی نے تمہید ایمان میں کیا ہے، بعض نے اس سے بھی مختصر اور باریک اشارہ میں ”الْإِيْمَانُ هُوَ التَّصَدُّيقُ بِالْقَلْبِ مَعَ الثَّقَةِ وَطَمَئِنَّةِ النَّفْسِ عَلَيْهِ“ کہہ کر ان میں سے بعض لوازمات کا اشارہ دیا ہے۔

جیسے تفسیر الفتوحات الالہیہ میں ہے۔ حضرت امام فخر الدین الرازی نے بھی صرف لازمہ محبت کو اصل الاصول اور باقی چاروں کے لیے بنیاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”وَقَدْ دَلَّلْنَا أَنَّ الْحُبَّ مِنْ لُؤْزَامِ الْعِرْفَانِ“ (۲)

التفسیر الکبیر، جلد 3، صفحہ 234 تحت آیت ”وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ“ جبکہ بعض نے پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جیسے حافظ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان اور فتاویٰ کبریٰ میں کیا ہے۔ کتاب الایمان اول سے آخر تک اسی موضوع سے متعلق ہے جبکہ فتاویٰ کبریٰ کی جلد 7، صفحہ 122 تا صفحہ 655 اس موضوع سے متعلق ہے۔ اور نہ سہی ابن ہمام کی مذکورہ عبارت کی طرح حافظ ابن تیمیہ کی مندرجہ ذیل عبارت ہی تکفیر کے لیے شرعی معیار کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ جس میں موصوف نے سورۃ الجادلہ کی آیت نمبر 22 کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ”بَيِّنْ سُبْحَانَهُ إِنَّ الْإِيْمَانَ لَهُ لُؤْزَامٌ وَلَهُ أَضْدَادٌ مَوْجُودَةٌ يَسْتَلْزِمُ ثُبُوتَ لُؤْزَامِهِ وَانْتِفَاءُ أَضْدَادِهِ وَمِنْ أَضْدَادِهِ مَوَادَّةٌ مِنْ خَادِ

(۱) المسامره، ص 281 تا 285۔

(۲) تفسیر الفتوحات الالہیہ، ج 4، ص 186۔

اللَّهُ وَرَسُولُهُ“ (الفتاویٰ کبریٰ، ج 7، ص 161) لیکن اُن کا انداز بیان چونکہ محدثانہ ہے جس وجہ سے مختصر مقاصد کے لیے بھی طویل کلام کرتے ہیں جس وجہ سے اُن کی عبارت النص اور ماسبق لہ الکلام تک رسائی ہر قاری کے لیے آسان نہیں ہوتی جبکہ ہم نے اس تحریر میں فقہاء کرام سے لے کر محدثین عظام اور مفسرین قرآن سے لے کر متکلمین اسلام تک سب کے مقاصد کا خلاصہ ضوابط کی شکل میں آسان انداز سے پیش کیا اور بتایا کہ تکفیر کے لیے قرآن و سنت اور بزرگان دین کی روشنی میں چند اصول و ضوابط مقرر ہیں۔ جن کے بغیر کسی کو کافر قرار دینے کا جواز ہرگز نہیں ہے۔

ہم نے اس تحریر میں فقہاء کرام کی اُن عبارات کا حقیقی مفہوم بھی واضح کیا جہاں پر انہوں نے لکھا ہے کہ ”شریعت نے بعض اقوال و افعال کو کفر کی علامت قرار دیا ہے۔ جن کے قائل و عامل کو دل میں تصدیق بالقلب اقرار باللسان کی موجودگی کے باوجود بالیقین کافر قرار دیا جائے گا۔“ یا لکھا ہے کہ ”سلف صالحین نے بعض اعمال و اقوال کو تصدیق قلبی و اقرار لسانی کی موجودگی کے باوجود کفر قرار دیا ہے۔“ مثال کے طور پر فقہاء کرام اور متکلمین اسلام کا:

استحلال معصیت کو یا استحلال وطن الحائض کو کفر قرار دینا فقہی اجتہاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت دینی کی ضد کے ارتکاب کی بناء پر ہے کیوں کہ ان دونوں کا ممنوع فی الاسلام و حرام ہونے کا جو اسلامی حکم ہے وہ ضرورت دینی ہے جبکہ ان کو حلال سمجھنے والے نے اسلامی عقیدہ کی ضد کا ارتکاب کیا ہے۔

اسی طرح عدم حرمت الزنا یا عدم حرمت قتل النفس بغیر الحق کی تمنا کرنے والے کو جو کافر قرار دیا گیا ہے وہ اس اصول کے تحت آیا ہے کہ حرمت زنا اور حرمت قتل النفس بغیر حق کی حقانیت کو ماننے اور اُس کے ساتھ ایمان لانے کے لوازمات محبت، جذبہ عمل، تسلیم و رضا، تعظیم اور اُس کے تمام اضداد سے کراہت و بیزاری کی ضد کا ارتکاب کیا گیا ہے گویا اُس نے ایک ہی عمل میں پانچ بار التزام کفر کیا۔ یہی حال شریعت کے ساتھ یا شریعت کے کسی ضرورت دینی والے حکم کے ساتھ

اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ، کے ساتھ استہزاء کر نیوالے کا ہے اور پیغمبر کی ذات یا صفات کی توہین واستہزاء کرنے کی بھی یہی نوعیت ہے کہ لوازمات ایمان کی ضد کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اس لیے مرتد قرار دیا جا رہا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس مذکورہ اصولوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کے ماتحت آنے پر سو فیصد یقین حاصل ہوئے بغیر فتویٰ کفر جاری کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

فَلِلَّهِ الْحَمْدُ أَوَّلًا وَآخِرًا ظَاهِرًا وَبَاطِنًا

☆☆☆☆☆

سورة الصف، آیت 4 کی قابلِ فہم تفسیر

میرا سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں مجاہدین اسلام کو قابلِ تقلید اور دوسروں کے لیے نمونہ عمل بتاتے ہوئے فرمایا ”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ بُنْيَانُ مَرُصُوصٌ“ (الصف، 4) جس کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین کرام نے ”صفًّا“ اور ”كَانَتْهُمْ بُنْيَانُ مَرُصُوصٌ“ کو بالترتیب حال متداخلہ ہونا بتایا ہے اور اس کے ساتھ مجاہدین فی سبیل اللہ کی صفوں کے باہمی متصل، متلاصق اور غیر متحرک ہونے کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے ساتھ ان ہی اوصاف میں تشبیہ دی ہے۔ مفسرین کرام کی ان تصریحات کے مطابق آیت کریمہ کا واضح مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مجاہدین فی سبیل اللہ کو پسند فرماتا ہے جو اہل حرب کے ساتھ قتال کے وقت سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے اجزاء کی طرح باہمی متصل، متلاصق اور غیر متحرک صفیں باندھ کر لڑتے ہیں۔ کیا لڑتے وقت مجاہدین فی سبیل اللہ کی صفوں کی یہ صفات قتال کی متنافی نہیں ہیں؟ کیوں کہ قتال میں دشمن کے خلاف حرکت کی جاتی ہے، صفوں کے اتصال میں یعنی دائیں بائیں جانبوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ملنا کہ کندھوں اور بازوؤں میں فاصلہ نہ آنے پائے اور متلاصق میں یعنی آگے پیچھے سے متصل ہونا کہ دو صفوں کے بیچ میں فاصلہ نہ آنے پائے اور دیوار کی طرح غیر متحرک ہونا یعنی اپنی جگہ سے نہ ہلنا، ان تینوں صفات کے ہوتے ہوئے قتال کا عمل ممکن نظر نہیں آتا۔ ایسے میں آیت کریمہ کے اندر ”يُقَاتِلُونَ“ کو عامل اور ”كَانَتْهُمْ بُنْيَانُ مَرُصُوصٌ“ کو اس کے لیے معمول بطور حال کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے جبکہ عامل کی موجودگی کے عین وقت میں معمول کی موجودگی ضروری ہوتی ہے، جو یہاں پر ممکن نہیں ہے۔

الاسائل..... محمد صاحب الحق کھٹانہ عربی استاد گورنمنٹ ہائی سکول تہکال پشاور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جواب: مجاہدین فی سبیل اللہ کے جس کردار پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ بُنْيَانٌ مَرُصُوصٌ“ (۱)

اس کی نحوی ترکیب کے حوالہ سے جمہور مفسرین نے جو فرمایا ہے کہ ”صَفًّا، كَانَتْهُمْ بُنْيَانٌ مَرُصُوصٌ“ کی یہ دونوں صفات ”يُقَاتِلُونَ“ کے ضمیر فاعل سے متداخلہ احوال ہیں اپنی جگہ بالکل درست ہے اور اس کے تقاضے سے وارد ہونے والا سوال بھی عین مقتضاء فطرت ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ مجاہدین کا دشمن کے ساتھ قتال کرتے وقت ہر چاروں طرف متصل و متلاحق، متلاحم اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح غیر متحرک رہنے کو کس طرح ممکن کہا جاسکتا ہے۔ مجاہدین کی صفوف جہاد نماز کی صفوں کی طرح تو ہیں نہیں کہ جب تک رکوع و سجود کے لیے حرکت و انتقالات کی نوبت نہیں آتی۔ اس وقت تک بغیر کسی حرکت صرف قیام قابل ستائش عمل ہے جبکہ صفوف جہاد کا میدان کارزار میں اس طرح بے حرکت رہنے کا کوئی مطلب ہی نہیں لہذا ہماری نگاہ میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کے حوالہ سے جمہور کے مقابلہ میں بعض مفسرین کرام کے اس قول کو ترجیح ہے۔ جس میں انہوں نے اس آیت کریمہ کو توحید کلمۃ المسلمین یعنی اتحاد بین المسلمین کے فریضہ پر عمل کر کے بیضۃ الاسلام کی حفاظت کی ترغیب پر محمول سمجھا ہے۔ جیسے روح المعانی میں آیت کریمہ کے تحت جمہور مفسرین کرام کی مذکورہ توجہ کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

”وَقِيلَ: الْمُرَادُ اسْتَوْءِيَتْهُمْ فِي الثَّبَاتِ حَتَّى يَكُونُوا فِي اجْتِمَاعِ الْكَلِمَةِ

كَالْبُنْيَانِ الْمَرُصُوصِ وَالْأَكْثَرُونَ عَلَى الْأَوَّلِ“ (۲)

یعنی یہ بھی کہا گیا ہے کہ توحید کلمہ پر ثبات رہنے میں ان کی نیوٹن کا برابر ہونا مراد ہے تاکہ اجتماع کلمہ کے حوالہ سے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو سکے اور اکثر مفسرین پہلے قول پر ہیں۔

(۱) الصف، 4۔ (۲) تفسیر روح المعانی، ج 28، ص 84۔

ان دو قولوں کے مابین ترکیب نحوی اور مفردات کے لغوی معنوں کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں ہے، مشتبہ بہ بھی دونوں کے نزدیک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہی ہے۔ اختلاف صرف تشبیہ کی نوعیت میں ہے کہ جمہور یہاں پر تشبیہ المحسوس بالمحسوس کے قائل ہیں جس کے مطابق وہ مجاہدین فی سبیل اللہ کی متصل، متلاحق متلاحم اور غیر متحرک سیدھی صفوں کو جو امر محسوس ہے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے ساتھ تشبیہ دے کر آگے پیچھے سے متلاحق و متلاحم، دائیں بائیں طرف سے متصل، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سیدھی اور غیر متحرک ہو کر لڑنے میں اللہ کی پسندیدگی بتا رہے ہیں۔ جبکہ دوسرے قول والے یہاں پر تشبیہ المعقول بالمحسوس کے قائل ہیں جس کے مطابق وہ مسلمانوں کے مابین ماہ الاتحاد یعنی اصول دین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلاء کلمۃ الحق کے مخالفوں کو مائل بحق کرنے کے لیے جدوجہد کرنے کو جو امر معقول ہے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے ساتھ تشبیہ دے کر بے اعتدالوں کو راہ اعتدال و صراط مستقیم پر لانے کے لیے کیے جانے والے ہر عمل میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اتحاد پر قائم رہنے میں اللہ کی پسندیدگی بتا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جمہور مفسرین اس آیت کریمہ میں ”الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ“ سے مراد میدان کارزار کے مسلح مجاہدین لیتے ہیں جبکہ دوسرے قول والوں کے نزدیک ایسا نہیں ہے بلکہ اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر ہر قسم ظلم و بے اعتدالیوں کے خلاف لڑنے والے تمام مخلصین اسلام کو یکساں طور پر شامل ہیں چاہے یہ لڑائی فکری ہو یا جسمانی، قولی ہو یا فعلی، مسلح ہو یا غیر مسلح یہ اس لیے کہ لغت میں مقاتلہ صرف مسلح تصادم کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مطلق لڑائی، مقابلہ، مدارک و مزاحمت سے لے کر مسلح تصادم تک سب کو شامل ہے۔ جیسے حدیث شریف میں نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو دفع کرنے کے لیے ”فان ابني ففقتله“ کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ معمولی مزاحمت و اشارات سے اگر منع نہیں ہوتا تو مناسب حال لڑائی لڑ کر بھی اسے دفع کیا جائے ایک اور

حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”أَمُرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“

یعنی کلمہ طیبہ اور اس کے جملہ تقاضوں کو قبول کرنے تک مجھے لوگوں کی بے اعتدالیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

الغرض لغت و محاورہ اور قرآن و حدیث میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے دیکھ کر یہ حضرات آیت کریمہ میں بھی اس کو صرف مسلح تصادم اور خونی لڑائی میں منحصر کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں بلکہ باطل کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کی جانے والی ہر لڑائی کو شامل کہتے ہیں۔ بے اعتدال، گمراہوں کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے ہر مجاہدہ کو شامل سمجھتے ہیں اور نظام مصطفیٰ ﷺ کی راہ میں رکاوٹ بننے والی طاغوتی قوتوں کے خلاف ہر دفاعی عمل کو اس کا مقصد بتاتے ہیں دران حال کہ مخلصین اسلام کا یہ عمل تو حید کلمہ کی صف میں ہو، تو حید کلمہ کی صف بندی کرنے والے اپنے اس عمل اتحاد میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو جن کا ایک ایک جزد دوسرے کے ساتھ متصل و متلاحق اور اس کے لیے مدد و معاون ہوتا ہے۔ ہماری فہم کے مطابق آیت کریمہ کی عندا الجمہور اور مشہور تفسیر کے مقابلہ میں اس کو ترجیح ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا جو جمہور والی تفسیر پر وارد ہو رہا ہے۔

دوسری وجہ ترجیح: یہ قرآن و سنت میں اتحاد بین المسلمین اور تو حید کلمہ کے لیے جو تائیدی احکام موجود ہیں ان کے زیادہ مناسب ہے۔

تیسری وجہ ترجیح: قرآن شریف کا رہتی دنیا تک انسانوں کے لیے نظام حیات ورہنما ہونے کے حوالہ سے جو اسلامی عقیدہ ہے یہ اس کے زیادہ مناسب ہے، جو مشہور تفسیر میں نہیں ہے اس لیے کہ حربی کافروں کے ساتھ مسلح جہاد میں قلب مَقْدَم، ساقہ، میمنہ، میسرہ کی صفوں کا رواج زمانہ نزول قرآن میں مروج تھا جبکہ موجودہ دور میں جنگوں کے حوالہ سے زمینی حقائق کچھ اور ہیں۔ بالخصوص موجودہ دور کی میزائل جنگوں میں صفِ قلب سے لے کر مَقْدَم، ساقہ اور میمنہ و میسرہ کی صفوں میں فوجی جتھوں کو یکجا کرنے کا جو خطرناک نتیجہ ہو سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ایسے میں کیا قرآن شریف کی اس آیت

کریمہ کو دقیانوسی کہہ کر موجودہ دور کے لیے یا آئندہ وجود میں آنے والے نت نئے انداز ہائے حرب کے لیے ناقابل عمل کہنے کی جرات کوئی کر سکتا ہے ”الْعَيَاذُ بِاللَّهِ“ کسی بھی حقیقی مسلمان سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی کیوں کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق قرآن شریف نہ کتاب حکایت ہے کہ صرف گزشتہ حالات و واقعات پر اللہ کی رضا مندی و ناراضگی بتانے پر اکتفا کرے اور نہ ہی آئندہ کے لیے ناقابل عمل کہ اس کے کسی حکم، کسی آیت اور اللہ کی رضا مندی یا ناراضگی کے موجب بننے والے کسی حکم پر آئندہ کے کسی دور میں عمل کرنا ممکن نہ رہے لہذا قرآن شریف کی ابدیت اور رہتی دنیا تک ہر دور کے انسانوں کے لیے ضابطہ حیات ورہنما ہونے کے زیادہ مناسب ہونے کی بناء پر اسی کو ترجیح اور اسی کو موضوع تبلیغ بنانا بہتر ہے۔

چوتھی وجہ ترجیح: آیت کریمہ کے سیاق و سباق کے ساتھ یہ زیادہ مناسب ہے کیوں کہ اس سے پہلے ان لوگوں سے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے فرمایا:

”لَمْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ“ (۱)

جس میں بغیر عمل کے یوں ہی باتوں کے غازی بننے والوں سے ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان آیات کے نزول کا سبب مختلف روایات کے مطابق چاہے کچھ بھی ہو حکم ان سب کا عام ہے کیوں کہ اصول تفسیر کا سلمہ کلیہ ہے کہ ”الْإِغْتِيَابُ لِلْعُمُومِ الْأَلْفَاظِ لَا لِلسَّبَبِ خَاصِّ“ یعنی آیت کریمہ کے الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے چاہے اس کے نازل ہونے کے خصوصی اسباب کچھ بھی ہوں۔ آیت کا حکم اس کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ تو ظاہر ہے کہ ﴿لَمْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ کے ساتھ بعد والے الفاظ یعنی ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ اپنے عموم کے اعتبار سے ہر قول و عمل کو شامل ہیں جس کے مطابق مسلمانوں کا ہر وہ کردار اللہ تعالیٰ کو ناپسند اور مقوت ہے جس میں قول و عمل کی مطابقت نہ ہو اور عمل کے بغیر یوں ہی زبانی جمع خرچی ہو اور عمل و کردار کے غازی بننے کے بجائے محض

گفتار کے غازی بننا ہو جب یہ عام ہیں تو اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے موجب بننے والے جس عمل کا ذکر کیا گیا ہے وہ کیوں عام نہ ہو اہل علم جانتے ہیں کہ مقابلہ عام و خاص کے مابین نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ خاصین یا عابین کے مابین ہوتا ہے۔ ان ناقابل انکار حقائق کی موجودگی میں اکثریت کی مذکورہ تفسیر کی کیا گنجائش باقی رہتی ہے۔ مذکورہ کمزوریوں کے علاوہ جمہور والی تفسیر مندرجہ ذیل دو کمزوریوں سے بھی خالی نہیں ہے۔

پہلی کمزوری:- اس کی شان نزول کے حوالہ سے جو مختلف روایات منقول ہیں ان میں سے اگر کسی ایک سبب کے ساتھ آیت کریمہ کے ان احکام کو خاص کرتے ہیں تو ”اَلَا عِبَسَا لَعَلَّكُمْ اَلَا لَفَاطِ لَا لِسَبِّ خَاصٍ“ کے مسلمہ اصول سے انحراف لازم آتا ہے اور اگر اس اصول پر عمل کر کے قول و عمل کو عام رکھتے ہیں تو خاص و عام کا مقابل لازم آتا ہے جو جائز نہیں ایسے میں بعض مفسرین سے منقول یہ تفسیر سیاق و سباق کے مطابق ہونے کے ساتھ ہر باطل کے خلاف عملی طور پر صف آراء ہونے کی ترغیب بھی ہے بشرطیکہ صف آراء ہونے کا یہ عمل اتحاد بین المسلمین کے حوالہ سے سیرہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو جس میں اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال کے ہلنے اور ٹیڑھے ہونے کا بھی امکان نہ ہو اور بنیادی نظریات و عقائد میں تفرقہ ڈال کر ایک دوسرے سے جدائی کا امکان بھی نہ ہو۔ اس عمل کا اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا موجب ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اتحاد بین المسلمین کا یہ عمل مقصد رسالت کی تکمیل کے لیے سنگ میل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰى الدِّيْنِ كَلِمَةً وَلَوْ كَفَرَةً الْمُبَشِّرِ كُوْنُ“ (۱)

اس میں اللہ تعالیٰ نے مقصد رسالت یہ بتایا ہے کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا جملہ ادیان باطلہ پر غلبہ ہو، پوری روئے زمین پر قرآن شریف کی حکمرانی ہو اور سب پر دین حق کا کنٹرول ہو۔ ظاہر ہے کہ تمام روئے

زمین کے ادیان باطلہ پر دین حق کو غالب کرنا کسی طلسماتی عمل یا کسی معجزہ کے تحت ہونا مراد الہی نہیں ہو سکتا کہ اس کے ماننے والے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، اللہ تعالیٰ خود آ کر یہ کام کرے یا محض دعاؤں کے پھونکوں سے ایسا ہونا ممکن ہو بلکہ دین اسلام کو روئے زمین کے جملہ ادیان باطلہ پر غالب و فاتح کرنے کو مقصد رسالت بتانے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ رسالت نبوی ﷺ پر ایمان لانے والے جملہ مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر رہا ہے کہ جس رسالت کو امر واقعی اور حکم خداوندی سمجھ کر تم اس پر ایمان لائے ہو، دل و جان سے اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر رضامندی ظاہر کی ہے، اس کے احکام پر عمل کرنے کا جذبہ رکھتے ہوئے اور اس کو قابل تعظیم و احترام سمجھتے ہوئے اس کے مقابلہ میں جملہ ادیان و مذاہب کو باطل سمجھتے ہو۔ تو تمہارے اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جملہ ادیان باطلہ پر اس کو غالب کرو، اسی کا جھنڈا بلند کرو اور اسی کے استحکام و غلبہ کو تمام عالم کی صفوں میں اپنی سر بلندی و غلبہ تصور کرو۔ گویا مقصد رسالت کی تبلیغ کے لیے نازل ہونے والی اس آیت کریمہ ”لِيُظْهِرَ عَلٰى الدِّيْنِ كَلِمَةً“ (التوبہ، 33) کا جملہ لفظ کے اعتبار سے جملہ خبریہ ہے جو متعلق تصدیق ہے جبکہ معنوی طور پر جملہ انشائیہ ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ جملہ اہل ایمان کو دین حق کو تمام روئے زمین کے جملہ مذاہب و ادیان باطلہ پر غالب کرنے کے لیے جدوجہد کرنے کا امر فرما رہا ہے۔ یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں دین حق کو جملہ ادیان باطلہ پر غالب و فاتح کرنے کا یہ فریضہ اس وقت تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ان کا کلمہ ایک نہ ہو، اتحاد بین المسلمین کے فریضہ پر عمل نہ ہو اور بیضۃ الاسلام کی مرکزیت و وحدت کو جان سے زیادہ عزیز نہ جانتے ہوں گویا مقصد رسالت کی تبلیغ پر مشتمل اس آیت کریمہ میں جہاں اللہ تعالیٰ مسلم امت پر دین حق کو جملہ ادیان باطلہ پر غالب کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کو فرض قرار دے رہا ہے وہاں اتحاد بین المسلمین کے لیے حسب استطاعت جدوجہد کرنے کو بھی بطور اقتضاء انص فرض عین بتا رہا ہے۔

دوسری کمزوری:- یہ ہے کہ اس میں لفظ ”يُقَاتِلُوْنَ“ کا مظہر صرف اور صرف جہاد بالسیف کرنے

والے مخلص حضرات ہیں جو دوسری تفسیر کے عموم کے مقابلہ میں وسیع نہیں ہے تو پھر کمزور نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے ان مفسرین کرام کو جنہوں نے جمہور مفسرین کی مشہور تفسیر کے مقابلہ میں مذکورہ آیت کریمہ کی اتنی جامع و مفید اور اعتراضات سے محفوظ تفسیر کی نشان دہی کر کے ہمارے لئے کام آسان کر دیا۔ (فَجَزَاهُمْ اللَّهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ)

اگر ان حضرات کا یہ احسان نہ ہوتا تو اللہ بہتر جانتا ہے ہم کو کتاب اللہ کا حق ادا کرنے کے لیے کتنا وقت لگانا ہوتا اور اکثریت سے منقول تفسیر پر وارد ہونے والے اعتراضات سے اللہ کے اس مقدس کلام کا تحفظ اہل دنیا کو سمجھانے کے لیے کتنی فکری کاوشوں کی ضرورت ہوتی۔

والسلام

وَأَنَا الْعَبْدُ الضَّعِيفُ

پیر محمد چشتی جامعہ غوثیہ معینیہ پشاور

☆☆☆☆☆

شفاء العی والنعل

سوال یہ ہے کہ اس سے قبل لزوم کفر کی تفصیل میں بے نمازی کو قابلِ نفرت جرم نہ کہنے کو کلمہ کفر اور لزوم کفر قرار دیا گیا ہے جبکہ کلمہ کفر ہمیشہ التزام کفر کو کہا جاتا ہے جیسے فتاویٰ درالختار میں ہے:

”وَرَكْنُهَا اجْرَاءُ كَلِمَةِ الْكُفْرِ عَلَى اللِّسَانِ بَعْدَ الْإِيمَانِ“

یعنی مرتد ہونے کے لیے رکن یہ ہے کہ ایمان کے بعد کلمہ کفر زبان پر جاری کیا جائے۔ (۱)

تو ظاہر ہے کہ کلمہ کفر کا لزوم کفر ہونے کی صورت میں ارتداد نہیں ہوتا کیوں کہ ارتداد کے لیے لزوم کفر نہیں بلکہ التزام کفر کا ہونا ضروری ہے۔ کلمہ کفر بولنے کو ارتداد کے لیے رکن قرار دینے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جہاں پر بھی بعد الايمان کلمہ کفر بولا جائے وہیں پر ارتداد ثابت ہو جاتا ہے جو التزام کفر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ ارتداد اور التزام کفر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں جس کے پائے جانے کے لیے کلمہ کفر بولنا کرنا ہے ایسے میں کلمہ کفر کا لزوم کفر کہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک التزام کفر کو ارتداد کو مساوی فی المصداق کہہ کر ایک چیز کے دو نام کہنا ہے یہ تو درست ہے کہ ارتداد اور التزام کفر کے مفہوم ایک دوسرے سے جدا ہونے کے باوجود مصداق دونوں کا ایک ہے کہ ارتداد کا پایا جانا التزام کفر کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی طرح التزام کفر کا پایا جانا ارتداد کے بغیر ناممکن ہے لیکن ہر کلمہ کفر کو التزام کفر کہنا حقیقت کے خلاف ہے۔ فتاویٰ درالختار کی مذکورہ عبارت سے اس پر استدلال کرنا سوء فہم کا نتیجہ ہے کیوں کہ صاحب درالختار کا ”اجْرَاءُ كَلِمَةِ الْكُفْرِ عَلَى اللِّسَانِ بَعْدَ الْإِيمَانِ“ کو ارتداد کے لیے رکن قرار دینے کا مقصد کسی پر مرتد کے احکام جاری کرنے کے لیے ظاہری رکن بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جب تک اپنی رضا و اختیار کے ساتھ

(۱) درالمختار، باب المرتد، ج ۱، ص 355۔

بلا جبر و اکراہ صراحۃً کلمہ کفر نہیں بولتا اس وقت تک کسی بھی مدعی اسلام کو غیر مسلم قرار دے کر مرتد کے احکام اس پر جاری کرنا جائز نہیں ہے۔ فتاویٰ رد المحتار علی الدر المختار میں حضرت ابن عابدین (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے بھی در مختار کی اس عبارت کو اسی مقصد پر محمول قرار دیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

”هَذَا بِالنِّسْبَةِ إِلَى الظَّاهِرِ الَّذِي يُحْكُمُ بِهِ الْحَاكِمُ وَالْأَقْفَدُ تَكُونُ بِدُونِهِ كَمَا لَوْ عَرَضَ لَهُ إغْبَاقُ بَاطِلٍ أَوْ نَوَى أَنْ يَكْفُرَ بَعْدَ حِينَ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ صاحب در المختار کا ”بَعْدَ الْإِيمَانِ إِجْرَاءُ كَلِمَةِ الْكُفْرِ عَلَى اللِّسَانِ“ کو ارتداد کے لیے رکن قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شریعت کے ظاہری احکام اس پر جاری کرنے کے لیے ہے ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر نفس ارتداد کے لیے اس کو رکن قرار دینا غلط ہوگا کیوں کہ نفس ارتداد اس کے بغیر بھی پایا جاتا ہے جیسے کوئی شخص بعد الایمان کی ضرورت دینی کی ضد یا نقیض کا عقیدہ کرے یا بعد میں کسی وقت کافر ہونے کی نیت کرے۔ ان صورتوں میں ارتداد بالیقین پایا جاتا ہے جبکہ إِجْرَاءُ كَلِمَةِ الْكُفْرِ عَلَى اللِّسَانِ موجود نہیں ہے۔

حضرت ابن عابدین کے معاصر سید احمد طحاوی نے طحاوی علی الدر المختار میں فتاویٰ رد المحتار کے اس کردار پر اعتراض کرنے کے بعد اس کو ارتداد کی صرف ظاہری قسم کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

”فِيهِ أَنَّهَا تَتَحَقَّقُ بِالْإِعْتِقَادِ الْقَلْبِيِّ كَمَا إِذَا اِعْتَقَدَ اِتِّصَافَهُ تَعَالَى بِمَا لَا يُلِيقُ بِهِ فَإِنَّهُ يَرْتَدُّ وَإِنْ لَمْ يَسْلُطْ بِهِ وَكَمَا إِذَا نَوَى الْكُفْرَ بَعْدَ حِينَ وَقَدْ يُقَالُ إِنَّ الْمَوْضُوعَ الرَّدَةَ الظَّاهِرَةَ“

جس کا مفہوم یہ ہے کہ فتاویٰ رد المحتار کا ارتداد کے لیے ”إِجْرَاءُ كَلِمَةِ الْكُفْرِ عَلَى اللِّسَانِ“ کو رکن قرار دینا اس لیے غلط ہے کہ ارتداد اس کے بغیر بھی پایا جاتا ہے جیسے کوئی مدعی ایمان اللہ

(۱) فتاویٰ رد المحتار علی الدر المختار، باب المرتد، ج ۳، ص ۳۱۰۔

تعالیٰ کو اس کی شان کے منافی کام سے متصف ہونیکا عقیدہ کرے یا بعد میں کسی وقت کافر ہونے کی نیت کرے۔

رد المحتار کی اس عبارت کو اس اعتراض سے بچانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد صرف ظاہری ارتداد ہے کہ مصنف نے اسی کو موضوع کلام بنایا ہے۔ الغرض کتب فقہ میں موجود اس عبارت سے یہ استدلال کرنا کہ کلمہ کفر ہمیشہ التزام کفر ہوتا ہے سو فہم اور اس کے متعلقہ تشریحات و تصریحات سے غفلت کا نتیجہ ہے جس پر مذکورہ اعتراض کو بنا کر بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

کلمہ کفر، لزوم کفر، التزام کفر کے مفہیم ثلاثہ کی باہمی مناسبت:-

مذکورہ اعتراض کے اس اجمالی جواب کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کی مکمل تفصیل پیش کریں جو کلمہ کفر، لزوم کفر، التزام کفر کے مفہیم ثلاثہ کے ماصدق علیہ اور ان کے افراد کے حوالہ سے مناسبت کو واضح کئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ ارتداد اور التزام کفر ایک چیز کے دو نام ہیں لہذا ان کے افراد کا ایک دوسرے سے انفکاک اور ایک دوسرے کے بغیر پائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز لزوم کفر اور التزام کفر کے مابین بتائیں کلی اور ان کے افراد کا جمع نہ ہونا بھی بیان ہو چکا ہے۔ ایسے میں کلمہ کفر کے حوالہ سے صرف لزوم کفر اور التزام کفر ہی محتاج بیان رہ جاتے ہیں تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ لزوم کفر و التزام کفر میں سے ہر ایک کلمہ کفر کے ساتھ عموم و خصوص کی نسبت رکھتا ہے کہ التزام کفر بغیر کلمہ کفر کے پایا جاتا ہے جیسے زبان سے کچھ کہے بغیر محض دل ہی دل میں کسی ضرورت دینی سے انکار یا اس کی ضد یا نقیض کے ساتھ عقیدہ رکھنے کی صورتوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کلمہ کفر بھی التزام کفر کے بغیر پایا جاتا ہے جیسا کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ ”جب چاہے غیب کی بات جاننا خدا کی صفت ہے“ کلمہ کفر ضرور ہے لیکن التزام کفر نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے بغیر علیحدہ علیحدہ پائے جانے کی ان صورتوں کے علاوہ کبھی اکٹھے بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے زبان سے کسی ضرورت دینی سے صراحۃً انکار کرنے یا اس کی ضد یا نقیض کے ساتھ عقیدہ کا زبان سے اقرار کرنے یا اس کے ساتھ ایمان لانے کے

لوازمات میں سے کسی ایک کی ضد یا نقیض کا زبان سے اقرار کرنے کی صورتوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح لزوم کفر اور کلمہ کفر میں سے ہر ایک من وجہ عام اور من وجہ خاص ہے کہ لزوم کفر کلمہ کفر کے بغیر ان تمام صورتوں میں پایا جاتا ہے جہاں پر کسی مدعی ایمان کا زبان سے کچھ بولے بغیر کسی ضرورت دینی کے بظاہر منافی کسی بھی غیر صریح عمل کا ارتکاب کرتا ہے مثال کے طور؛

کسی بد نصیب کا قرآن شریف کو موجودہ دور کے لیے ناقابل عمل اور غیر مفید کہنے پر سننے والے کا ہنسنے ہوئے سر ہلانا جو بالیقین لزوم کفر ہے۔

کیوں کہ یہ رضا بالکفر کی علامت ہے۔

اور رضا بالکفر کی ہر علامت کفر ہوتی ہے۔

لہذا یہ بھی کفر ہے۔

لیکن التزام کفر اس لیے نہیں ہے کہ یہ صریح فی الکفر نہیں ہے جبکہ التزام کفر کے لیے صریح فی الکفر ہونا ضروری ہے۔ نیز اس میں کفر نہ ہونے کا احتمال بھی موجود ہے کہ شاید اُس کے اس کفر کو مجنون کی بڑھ سمجھ کر ایسا کیا ہو یا کھلے بند و اتنی بڑی جرات کرنے پر تعجب کی بنا پر ایسا کیا ہو تو ظاہر ہے کہ عدم کفر کے احتمال کی موجودگی میں التزام کفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کلمہ کفر کا لزوم کفر کے بغیر پائے جانے کی مثالوں میں کفر التزامی قولی کی تمام صورتیں شامل ہیں کیوں کہ لزوم کفر اور التزام کفر کے مابین تباہی کلی کی نسبت کا لازمہ ہے کہ ان میں سے ایک کے ساتھ جمع ہونے والا دوسرے کے ساتھ جمع نہ ہو ورنہ تباہی کلی کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ جائین کا ایک دوسرے کے بغیر پائے جانے کی ان صورتوں کے علاوہ کلمہ کفر اور لزوم کفر کی اجتماعی موجودگی کی مثالوں میں لزوم کفر کی تمام قولی و کلامی اور زبان سے متعلقہ صورتیں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر؛

قرآن شریف کو موجودہ دور کے لیے ناقابل عمل اور غیر مفید کہنے والے مرتد کے اس جملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ ”یہ عام سی بات ہے“ لزوم کفر اس لیے ہے کہ یہ اس ارتداد سے عدم

بیزاری پر مشتمل ہے۔

جو کلمہ بھی ارتداد سے عدم بیزاری پر مشتمل ہو کفر ہوتا ہے۔

لہذا یہ بھی کفر ہے۔

التزامی کفر اس کو اس لیے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ کلمہ ارتداد سے عدم بیزاری پر مشتمل ہونے میں صریح نہیں ہے جبکہ التزامی کفر صریح ہوتا ہے۔ نیز اس میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس نے صریح کفر کے اس کردار سے بیزاری، افسردگی اور دنیا کے زیادہ انسانوں کو اس میں مبتلا دیکھ کر ازر وئے افسوس یہ کہہ دیا ہو کہ اس کفر میں یہ تنہا نہیں ہے بلکہ خدا ناشناسوں کی عام دنیا اس میں مبتلا ہے تو ظاہر ہے کہ کفر سے بچنے کے احتمال کی موجودگی میں التزام کفر نہیں ہو سکتا۔

نیز التزامی کفر اپنی ہدایت کی وجہ سے خود اپنے آپ پر دلیل ہوتا ہے کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا جبکہ یہاں پر ایسا نہیں ہے کیوں کہ قرآن شریف کا ہر دور تاریخ کے لیے قابل عمل اور مفید ضابطہ حیات ہونے پر ایمان کے لازمہ یعنی اس کے ساتھ محبت و جذبہ عمل اور اس کے مقابلہ میں کسی اور نظام سے بیزاری کے نقیض کو جب تک واسطی فی الاثبات بنا کر تفصیلی دلیل نہیں بنائی جاتی تب تک کفر کا ثبوت نہیں ہوتا۔ ایسے میں التزامی کفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کلمہ کفر، التزام کفر اور لزوم کفر کے مابین مناسبت کے حوالہ سے اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد مذکورہ سوال نامہ میں کلمہ کفر کو ہر جگہ میں التزام کفر سے عبارت قرار دینے کی غلطی آپ ہی واضح ہو گئی اس کے ساتھ نو خیز مفتیان کرام و علماء اسلام کو بھی رہنمائی مل گئی کہ کتب فتاویٰ میں کلمہ کفر، لفظ کفر اور کفر یہ کلام یا کفر یہ عبارات جیسے الفاظ جو کثرت کے ساتھ لکھے ہوئے ملتے ہیں وہیں پر ہمیشہ اور ہر جگہ التزام کفر ہی مراد نہیں ہوتا بلکہ ایسے الفاظ و مقامات کو التزام کفر و لزوم کفر میں سے کسی ایک کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے جنس کفر کے ماتحت ان دو تباہی انواع کی حقیقتوں کو جاننا ضروری ہے جس کے بغیر کوئی بعید نہیں ہے کہ دارالافتاء کے نا تجربہ کار اہل کاروں کے ہاتھوں کسی غیر ملزم الکفر کو مرتد قرار دینے کی غلطی ہو سکے جو اصلاح کے بجائے فساد ہے ”الاسلام“

يَعْلَمُوا“ کے بجائے اسلام کو کمزور کرنے کا سبب ہے اور مسلمانوں کی رہنمائی کی جگہ التباس الحق بالباطل کی بدترین صورت ہے۔ ہمارے موجودہ دور کے دینی مدارس کی روش اس حوالہ سے قابل رحم ہے کہ سالانہ ہزاروں کی تعداد میں فارغ تحصیل ہونے والوں میں دو فیصد بھی ایسے نظر نہیں آ رہے ہیں جو لزوم کفر اور التزام کفر کے مابین بنیادی فرق کو ہی سمجھ سکیں چہ جائیکہ ان سے کلمہ کفر کی لزوم کفر اور التزام کفر کے ساتھ نسبت کو سمجھنے کی توقع کی جاسکے۔ ایسے میں مذکور فی السؤال جیسے ”بِنَاءُ الْغَلَطِ عَلَى الْغَلَطِ“ کا اشتباہ ان حضرات کو نہ ہوگا تو اور کس کو ہوگا۔ (فَالِیَ اللّٰهِ الْمُمَشْتَكِلِ)

مزید برآں جن مدارس میں مفتی کو رس کرایا جاتا ہے اصل مسئلہ کی طرف توجہ دیے بغیر اس کا نتیجہ بھی وقت ضائع کرنے والوں کا مزید وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ اس کو رس میں رسم المفتی کے چند طریقے بتانے کے علاوہ ہر نظریہ کے مفتیان کرام ماضی قریب میں اپنے مخصوص نظریہ و پسند کے مفتیوں کی لکھی ہوئی مخصوص دستاویزات کی تمرین و مشق کراتے ہیں۔ جہاں تک فتویٰ نویسی کے مخصوص طریقے ہیں وہ حقیقت میں ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ کے اسباق نہیں ہیں تو پھر ان پر ایک سال کا طویل دورانیہ صرف کر نیکی ضرورت ہی کیا ہے اور جہاں تک اپنے مخصوص نظریہ کی مخصوص کتابوں کے مندرجات کی تمرین کرانے کا مسئلہ ہے تو یہ نوخیز متلاشیان علم کے لیے خود فریبی کے مترادف ہے، دینی مدارس سے وابستہ عوامی امیدوں کے مطابق نہیں ہے اور اسلام کی جامعیت و گہرائی کے برعکس سطحیت و محدودیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس روش کے بجائے اگر درس نظامی کی حقیقی تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا جائے تو اس کی افادیت زیادہ ہو سکتی ہے سچ کہا گیا ہے۔

خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے اس پورے خطے کے دینی مدارس میں درس نظامی کا خالی نام و ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے جس کو گلے کا بار اور ماتھے کا جھومر بنا کر اصحاب مدارس حسن تماشا دکھا رہے ہیں، غیر معیاری مدارس کی شرح پیداوار میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور جس شرح تناسب سے ان

مدارس اور ان کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے اسی شرح تناسب سے تفقہ فی الدین کا تنزل ہو رہا ہے اس افتادگی کی بنیادی وجہ میں نے اپنی دوسری تصنیف ”اسباب زوال اُمت“ میں تفصیل کے ساتھ لکھی ہوئی ہے یہاں پر چونکہ یہ ضمیمہ ذکر ہو رہا ہے لہذا صرف اس کی تاریخ کے ذکر کرنے پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ درس نظامی اور دینی مدارس کے حوالہ سے اس شرم ناک تنزل کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی جب سے خصوصی مقاصد کے تحت دینی مدارس کے لیے کامیابی کا معیار کثرت رؤس کو سمجھا جانے لگا۔

طلباء کے حوالہ سے کثرت رؤس بھرتی کرنے کی اس تقابلی روش نے اہل مدارس کو اصل مقصد بھلادیا جس کے نتیجے میں معکوس العملی کا عالم کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ اگر کچھ بامقصد مدارس میں اکائیوں یا سینکڑوں کی تعداد کو پڑھا کر بامقصد بنایا جا رہا ہے ان کے مقابلہ میں ان اداروں کو کامیاب تصور کیا جاتا ہے جن میں غیر معیاری معلمین ہزاروں کی تعداد کو لیے بیٹھے ہوئے ہیں، جن سے فارغ تحصیل ہونے والے مخصوص مسلکی مفادات کے پرچارک ہونے، فرقتہ واریت و مذہبی تفرقہ بازی کو فضیلت کا معیار تصور کرنے اور جو میرے نظریہ پر نہیں وہ مسلمان بھی نہیں کی تبلیغ کرنے کے سوا اور کوئی وزن نہیں رکھتے ہیں۔ ایسے میں واقف حال حضرات افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ قربان جاؤں اللہ کے حبیب رحمۃ عالم ﷺ کی دور بین نگاہ بصارت پر ساڑھے چودہ سو سال قبل ان ہی حالات کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ“ (۱)

لگتا ہے کہ دینی مدارس کی شرح پیداوار اور ان کے ساتھ مربوط مفیدین و مستفیدین کے تفقہ فی الدین کے حوالہ سے قابل رحم حالت کے متلاطم موجوں میں مستغرق ہو کر اصل موضوع سے کافی دور نکل

(۱) مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم، ص 38۔

گیا۔ کلمہ کفر کا لزوم اور التزام کفر کے ساتھ تناسب کی ہماری یہ تحقیق جہاں اسلامی مدارس کے دارالافتاء سے مربوط مفیدین و مستفیدین کے لیے رہنما اصول ہے وہاں پڑھے لکھے ان عوام کے لیے تنبیہ بھی ہے جو فقہ اسلامی کی مختلف کتابوں میں کچھ باتوں سے متعلق کلمہ کفر لکھا ہوا دیکھ کر مسلمانوں کو کافر کہتے پھرتے ہیں، انہیں سوچنا چاہئے کہ کس قدر خطرناک غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان حضرات کو بے محل کسی مسلمان کو کافر کہنے کے انجام بد کا علم ہو یا کوئی انہیں سمجھانے والا ہو یا کم از کم لزوم کفر و التزام کفر کی حقیقتوں کا ادراک ہو تو ایسی بے محل جسارت کبھی نہ کریں۔ یہ سب کچھ بے علمی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ)

☆☆☆☆☆

﴿کفرون کفر﴾

سوال یہ ہے کہ آپ نے عارضی کفر کی صرف دو قسمیں بتائی جبکہ حدیث شریف میں گناہ کبیرہ کے مرتکب کی بھی تکفیر کی گئی ہے جیسے مسلم و بخاری کی مرفوع حدیث میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے آیا ہے:

”قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَرْغَبُوا عَنْ اِثْمِكُمْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ اِثْمِهِ فَقَدْ كَفَرَ“ (مشکوٰۃ شریف)

اپنا نسب مت بدلو اور جس نے اپنا نسب تبدیل کیا بے شک وہ کافر ہو گیا۔

تو ظاہر ہے کہ لزومی اور التزامی کفر میں سے ایک بھی اس کو شامل نہیں ہے ایسے میں عارضی کفر کو صرف دو قسموں میں منحصر کرنے کا کیا جواز ہے؟

السائل..... قاری محمد انور بیگ، خطیب جامع سنہری مسجد پشاور صدر

اس کا جواب یہ ہے کہ کفر کے دو مفہوم ہیں، ایک: شرعی، دوسرا: لغوی۔

شریعت کی زبان میں کفر ضرورتاً دینی کی تکذیب سے عبارت ہے چاہے اصلی ہو یا عارضی۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے کفر کا لفظ دنیا بھر میں غیر مسلموں کے جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان سب کو شامل ہے۔ لیکن ہمارا موضوع بیان چونکہ کسی مدعی اسلام کی تکفیر سے متعلق ہے جس کو عارضی کفر کہا جاتا ہے، اس لیے ہم اسی کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کر رہے ہیں۔ ہمارے موضوع سخن کا تعلق لغوی کفر کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ صرف اور صرف شرعی مفہوم میں عارضی کفر کے ساتھ خاص ہے اور ہم نے کسی مدعی اسلام کی تکفیر کے حوالہ سے اس کو مذکورہ دو قسموں میں جو منحصر بتایا ہے وہ عین حقیقت ہے۔ جہاں تک کفر کے لغوی مفہوم کی بات ہے وہ یہ ہے کہ عربی لغت میں کفر کا لفظ کسی چیز کو چھپانے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور اس کا مادہ یعنی (ک، ف، ر) کا مجموعہ اس ترتیب کے ساتھ جس شکل و صورت میں بھی پایا جاتا

ہے وہیں پر چھپانے کا مفہوم کسی طریقے سے ضرور پایا جاتا ہے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

”الْكُفْرُ فِي اللُّغَةِ سَتْرُ الشَّيْءِ وَصِفَ اللَّيْلِ بِالْكَافِرِ لَسْتَرِهِ الْأَشْخَاصَ وَالزُّرَاغَ لَسْتَرِهِ الْبُنْدَرُ فِي الْأَرْضِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ لغت میں کفر کسی چیز کے چھپانے کو کہتے ہیں اور رات کو اس لیے کافر کہتے ہیں کہ وہ بھی اشخاص کو چھپاتی ہے اور زمیندار کو کافر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی ختم کو زمین کے اندر چھپاتا ہے۔

لغت کے حوالہ سے اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اصل سوال آپ ہی حل ہو جاتا ہے وہ اس طرح کہ قرآن و سنت میں جہاں کہیں گناہ کبیرہ کے مرتکب کو یا ناشکری کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے یا لزوم کفر کا غیر حقیقی فتویٰ صادر کر کے بے گناہوں پر لزوم کفر کے شرعی احکام جاری کیے جاتے ہیں جبکہ حقیقت میں لزوم کفر نہیں ہوتا اس قسم کے تمام مواقع کا جائزہ لینے کے بعد کسی مدعی اسلام کو کافر قرار دینے یا کافر کہنے کی مندرجہ ذیل شکلیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی شکل: التزام کفر جس میں صاحب کردار کا کفر اپنے شرعی مفہوم میں متعین و یقینی اور بدیہی ہوتا ہے، جس کو کافر جاننے اور کافر کہنے کے وجوب کے ساتھ مرتد کے جملہ احکام کو اس پر جاری کرنا مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہوتا ہے۔

دوسری شکل: لزوم کفر جس میں صاحب کردار کا کفر اپنے شرعی مفہوم میں ظنی طور پر ثابت ہوتا ہے جو نظری اور محتاج دلیل ہونے کی بنا پر دلیل کی نوعیت کا تابع اور غیر یقینی ہے جس وجہ سے صاحب کردار کو کافر جاننا اور کافر کہنا ناجائز و ظلم ہے۔ جس پر تجدید اسلام، تجدید نکاح اور التوبہ والا استغفار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۱) مفردات القرآن، امام الراغب الاصفہانی، مادہ (ك، ف، ر)۔

تیسری شکل: لزوم کفر کی وہ ظاہری اور غیر حقیقی شکل ہے جو کسی غیر معیاری مفتی کے غیر حقیقی فتویٰ کی وجہ سے کفر مشہور ہوا ہے جس کی تمیز بعد میں کسی حقیقی مفتی کی تحقیق کی بدولت ہوتی ہے یہاں پر صاحب کردار دوسرے عام مسلمانوں سے مختلف نہ ہونے کی بنا پر اس کے لیے کوئی خاص احکام بھی نہیں ہیں۔

چوتھی شکل: زجری کفر یعنی کسی گناہ سے لوگوں کو بچانے کی غرض سے اس کے ارتکاب کرنے والوں کو کافر کہنا۔ تکفیر کی اس نوعیت کا حق صرف ان صاحب محراب و منبر کو حاصل ہے جن کو علماء حق کہا جاسکتا ہے، جو مذہبی تعصب، فرقہ واریت اور تنگ نظری سے پاک ہونے کے ساتھ با کردار اور مسلمانوں کے خیر خواہ مشہور ہوں۔ جن کو حقیقی معنی میں پیغمبر کریم ﷺ کے جانشین اور ورثہ الانبیاء کہا جاسکتا ہو۔ اصحاب محراب و منبر حضرات کی طرف سے زجر آؤ تو بیجا اور وعظاً و تبلیغاً کسی گناہ پر تکفیر کرنے کے اس کردار کا تعلق حقیقت میں کفر کے شرعی مفہوم کے ساتھ متعلق نہ ہونے کی وجہ سے لزوم کفر کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے نہ التزام کفر کے ساتھ۔

پانچویں شکل: تعصبی کفر یعنی مذہبی تعصب کی بنا پر جان بوجھ کر بلا وجہ اپنے مخالف نظریہ والوں کی تکفیر کرنا جس میں حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جس کا اصل منشاء جہل اور خدا ناستی ہوتا ہے۔ جس میں تکفیر کرنے والے متعصب کا مقصد معاشرہ میں اپنے مذہبی حریف کو بدنام و ذلیل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب کفر کے شرعی مفہوم کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے تو پھر لزوم کفر یا التزام کفر میں سے کسی ایک زمرہ میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چھٹی شکل: شتمی کفر یعنی گالی کے طور پر کسی مسلمان کو کافر کہنا جس میں تکفیر کرنے والا مغلوب انفس ہوتا ہے اور اپنے مد مقابل پر غصہ نکالنے کے سوا کوئی اور مقصد اس کا نہیں ہوتا، اس کا تعلق بھی کفر کے شرعی مفہوم کے ساتھ نہیں ہے لہذا اس کی کسی قسم میں مندرج ہونے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ تکفیر کی ان قسموں کو سمجھنے کے بعد مذکورہ سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا کہ کسی کبیرہ گناہ کے مرتکب کو قرآن و سنت میں جو کافر کہا گیا ہے اس کا تعلق محراب و منبر کے ساتھ ہے دارالافتاء کے

ساتھ نہیں، زجر و توبخ اور تہدید و تحذیر کے ساتھ ہے حقیقت کے ساتھ نہیں اور کفر کے لغوی معنی کے ساتھ ہے شرعی مفہوم کے ساتھ نہیں جبکہ عارضی کفر کو لزومی و التزامی میں منحصر کہنے میں شرعی مفہوم کے اعتبار سے حقیقی کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ (فَلِلَّهِ الْحَمْدُ أَوَّلًا وَآخِرًا ظَاهِرًا وَبَاطِنًا)

دارالافتاء کی رہنمائی کے لیے حاشیتی افادے:-

لزوم کفر اور التزام کفر میں سے ہر ایک کے جدا گانہ احکام کی تفصیل سے گزشتہ صفحات میں ہم فارغ ہو کر آئے ہیں لہذا یہاں پر صرف باقی چاروں قسموں کے احکام و عقوبات کو بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ دارالافتاء کی رہنمائی ہونے کے ساتھ عام قاریوں کے لیے بھی ہدایت کا سامان ہو سکے۔

تکفیر کی تیسری قسم یعنی تکفیر کرنے میں اجتہادی غلطی سے کسی نازل مسلمان پر لزوم کفر کے احکام جاری کرنے والے اگر معیاری مفتی ہوں جنہوں نے لزوم کفر کی علت کو تلاش کرنے اور وجہ لزوم کو متعین کرنے میں اجتہادی غلطی کرنے کی بنا پر ایسا کیا ہو تو ان پر کوئی وبال نہیں ہے کیوں کہ شریعت کے مسئلہ اصول "الْمُجْتَهِدُ قَدْ يُخْطِئُ وَقَدْ يُصِيبُ" کے مطابق وبال و عذاب کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جبکہ اخلاص کے ساتھ حق تک پہنچنے کی کوشش کرنے کا اجر ملنا ممکن ہے۔ اور اگر غیر معیاری ہو تو پھر قابل ملامت و مستحق عذاب ہو سکتا ہے کیوں کہ نااہل کو منصب افتاء پر بیٹھنے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔ جس کی بد انجامی سے متعلق اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ کی حدیث ہے:

"مَنْ أَفْتَى بِغَيْرِ عِلْمٍ لَعَنَتْهُ مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ" (۱)

جبکہ مفہوم یہ ہے کہ جس نے معیاری علم کے بغیر فتویٰ دیا تو اس پر آسمان و زمین کے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔

دارالافتاء پر ایسے ہی نااہلوں کے مسلط ہونے کی بد انجامی کی خبر دیتے ہوئے اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

"فَسْتَلُوا فَافْتُوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا" (۱)

(۱) کنز العمال شریف، ج 10، ص 193، حدیث نمبر 29018، مطبوعہ بیروت۔

(۲) مشکوٰۃ شریف، ص 33، کتاب العلم بحوالہ مسلم و بخاری شریف۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقی علماء دین کے فقدان کے وقت لوگ نااہلوں سے مسئلہ پوچھیں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دے کر خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ فتاویٰ بحر الرائق میں ہے:

"وَأَمَّا صَابَتْ عَنْ غَيْرِهِ فَلَا يُفْتَى بِهِ فِي مِثْلِ التَّكْفِيرِ" (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر غیر معیاری مفتی کسی بات کو لزوم کفر قرار دیں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

فتاویٰ فتح القدر میں بھی "وَلَا عَجْرَةَ بِغَيْرِ الْفُقَهَاءِ" کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب غیر معیاری مفتی کا دیا ہوا لزوم کفر کا فتویٰ حسن اتفاق سے درست بھی ہو پھر بھی اپنی حیثیت سے تجاوز کرنے کی بنا پر وہ سزا کا مستحق قرار پاتا ہے اور غلط ہونے کی صورت میں دوسری سزاؤں کا مستحق ہوتا ہے جبکہ معیاری مفتی کا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ اسے غلط ہونے کی صورت میں ایک اجر اور درست ہونے کی صورت میں دو چند اجر کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ جیسے منہاج الوصول، ج 4، ص 556 پر لکھا ہوا ہے کہ اہل سنت کے تمام مسالک میں ایسا ہی ہے۔

تکفیر کی چوتھی قسم کا شرعی حکم یہ ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف نہ ہونے کی بنا پر جائز عمل ہے اور اس بنیاد پر بھی موجب اجر ہے کہ ان کے اس انداز تبلیغ کے نتیجہ میں جتنے لوگ گناہوں سے بچتے ہیں یا نفرت کرتے ہیں ان سب کے برابر اجر و ثواب کا استحقاق انکو بھی حاصل ہوتا ہے۔ جیسے مرفوع حدیث شریف میں آیا ہے۔ اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

"لَإِنَّ يَهْدِي اللَّهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ" (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ تیری تبلیغ کی برکت سے ایک آدمی کا ہدایت پانا بھی تیرے لئے سرخ

(۱) بحر الرائق، ج 5، ص 129۔

(۲) بخاری شریف، ج 2، ص 606۔

اُنوں سے زیادہ بہتر ہے۔

تکفیر کی پانچویں قسم کا شرعی حکم یہ ہے کہ تعصب کی بنا پر دیدہ دانستہ ایک دوسرے کی بے محل تکفیر کرنا کبیرہ گناہ ہے لہذا جو سزا اُنیں اور عذاب دوسرے کبیرہ گناہوں کے مرتکبوں کے لیے مقرر ہیں اُن سب میں یہ بھی ان کے ساتھ برابر شریک ہیں اس کے علاوہ حدیث شریف میں ایسی تکفیر کو قتل کے برابر جرم قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

”مَنْ رَمَى مُؤْمِنًا بِكُفْرٍ فَهُوَ كَقَتْلِهِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے کسی مسلمان کی بے محل تکفیر کی تو وہ اس کے قتل کرنے کے برابر جرم ہے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:

”وَمَنْ دَعَا جُلًّا بِالْكُفْرِ أَوْ قَالَ عَدُوَّ اللَّهِ وَلَيْسَ كَذَلِكَ إِلَّا حَارَ عَلَيْهِ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے بھی کسی مسلمان شخص کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا جبکہ حقیقت میں وہ ایسا نہیں ہے تو اس کا وبال واپس اسی پر آئے گا۔

تیسری حدیث میں آیا ہے کہ:

”أَيُّمَا امْرَأَةٍ قَالَ لِأَخِيهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَالْأُخْرَى جَعَلَ عَلَيْهِ“ (۳)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے بھی اپنے کسی اسلامی بھائی کو کافر کہا تو ان میں سے ایک بالیقین اس کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اگر حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسے اس نے کہا ہے تو پھر ٹھیک کہا ہے ورنہ اس کا وبال واپس اسی پر آ جائے گا۔

(۱) جامع الصغیر مع فیض القدیر، ج 6، ص 139۔

(۲) مسلم شریف، ج 1، ص 57۔

(۳) مسلم شریف، ج 1، ص 57۔

تعصب کی بنا پر اپنے کسی مخالف نظریہ والے مسلمان کو یا جماعت کو کافر کہنے والے نہ صرف ایک بار گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ کم از کم تین بار اللہ کے عذاب و لعنت کا استحقاق پارہے ہیں؛ پہلی بار:- تعصب جیسی حرام کاری میں مبتلا ہیں۔

دوسری بار:- تکفیر مسلم کی لعنت میں مبتلا ہیں۔

تیسری بار:- مسلم معاشرہ میں نفرت و تعصب پھیلانے کے جرم میں مبتلا ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ بعض حدیثوں کے مطابق تعصب کی وجہ سے اپنے مخالف نظریہ والوں کو کافر قرار دے کر مسلم معاشرہ میں فرقہ واریت پھیلانے اور بیضۃ الاسلام کو پراگندہ کر نیوالوں کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔ جیسے:

”سَيَكُونُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَانِئَامَنْ كَانَ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ آئندہ تم پر شر و فساد کا دور آئے گا تو جس نے بھی اس امت کی جمعیت کو متفرق کرنے کا ارادہ کیا اسے شمشیر کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا۔

تکفیر کی چھٹی قسم کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے لہذا گناہ کبیرہ کے مرتکب سیاہ کاروں کے لیے جو عذاب مقرر ہے وہ ان کے لیے بھی ہے اس کے علاوہ انفرادی سزاؤں کے سلسلہ میں ان کے خود کافر ہونے کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے جیسے اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا:

”وَمَنْ دَعَا جُلًّا بِالْكُفْرِ أَوْ قَالَ عَدُوَّ اللَّهِ وَلَيْسَ كَذَلِكَ إِلَّا حَارَ عَلَيْهِ“

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے بھی کسی مسلمان شخص کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا جبکہ حقیقت میں وہ ایسا نہیں ہے تو اس کا وبال خود اسی پر آئے گا۔ (مسلم شریف، ج 1، ص 57)

☆☆☆☆☆

(۱) مشکوٰۃ شریف، کتاب الامارۃ بحوالہ مسلم شریف، ص 320۔

﴿علم الغیب ماہو﴾

آواز حق میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ مختص علم غیب پر رسولوں کو مطلع فرماتا ہے جب رسولوں کو اطلاع کردی تو وہ خاص کہاں رہا۔ کیوں کہ خاصہ کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ جس کا خاصہ ہوتا ہے اس کے سوا کسی اور میں نہیں پایا جاتا کیوں کہ ﴿خَاصَّةُ الشَّيْءِ مَا تُوجَدُ فِيهِ وَلَا تُوجَدُ فِي غَيْرِهِ﴾ اور شان الوہیت کا مسئلہ دوسرے مسائل سے اور بھی زیادہ اہم ہے جس میں کسی قسم کی تخصیص یا استثنا کی بھی گنجائش نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ الوہیت بھی کسی کو عطا کریں اس لیے کہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونے میں وصف الوہیت اور وصف علم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس کے جواب دو ہیں۔ پہلا جواب :- خاصہ کی دو قسمیں ہیں، ایک حقیقی، دوسرا عرفی۔

خاصہ حقیقی :- جس کے ساتھ خاص ہے اس کے سوا کسی اور میں قطعاً نہیں پایا جاتا جس میں کسی اور کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

خاصہ عرفی :- میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے یعنی لوگوں کے عرف میں ایسا ہو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نامعلوم چیز کو معلوم کرنے کے لیے اس کے متعلقہ چند معلومات کو مرتب کر کے نظر عقلی استدلال کے ذریعہ اسے حاصل کیا جاتا ہے جو انسان کے لیے حقیقی خاصہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور مخلوق میں قطعاً نہیں پایا جاتا کیوں کہ انسان کے ماسوا ہر نوع مخلوق جن چیزوں کا علم و ادراک رکھتی ہے وہ فکری نہیں بلکہ فطری انداز عمل ہے جس کو استدلال کہا جاسکتا ہے نہ نظر عقلی نہ فکر، اس کے مقابلہ میں کتابت بھی انسان کا خاصہ ہے کیوں کہ دوسرے جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ فکر و فکر کی طرح نہیں ہے کہ کسی اور میں قطعاً نہ پایا جائے بلکہ فرشتوں میں بھی پایا جاتا ہے جیسے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِن رَّسَلْنَا يَكْتُوبُونَ مَا تَمْكُرُونَ“ (۱)

ہمارے فرشتے ان تمام باتوں کو لکھتے ہیں جن کی تم سازش کرتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا: ”يَكْرَهُمَا كَاتِبَتَيْنِ“ (۲)

یعنی فرشتوں میں ایک معزز طبقہ لکھنے والوں کا بھی ہے۔

پیش نظر مسئلہ بھی اسی طرح ہے کہ جن مفسرین کرام نے اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کے ساتھ مختص علم غیب پر رسولوں کو مطلع فرمانے کا کہا ہے اس سے مراد عرفی خاصہ ہے حقیقی نہیں اور اس کا مصداق علم غیب اضافی مالیں علیہ الدلیل ہے تو ظاہر ہے کہ علم غیب کی مالیں علیہ الدلیل والی قسم انسانوں کے عرف کے مطابق اللہ ہی کا خاصہ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جس کسی میں بھی علم غیب کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے اس پر کوئی دلیل ضرور ہوتی ہے چاہے نقل ہو یا عقل، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہو جیسے ذوات قدسہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بتانے سے ہو جیسے عام اہل ایمان کو جنت و دوزخ جیسے غیب پر علم و یقین ہے، ہر اطاعت کا موجب اجر و ثواب ہونے اور ہر معصیت کا موجب سزا و نقصان ہونے جیسے غیب کے ساتھ جو ایمان و یقین ہے یہ صرف پیغمبر اکرم رحمہ اللہ کے بتانے سے ہے۔ ہمارے لیے اس پر دلیل رسول اللہ ﷺ کا بتانا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے دلیل اللہ کا بتانا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جب تک رسول اللہ ﷺ کو نہ بتائے تو انہیں پتہ نہیں چل سکتا اور رسول اللہ ﷺ جب تک ہمیں نہ بتائیں تو ہمیں جنت، دوزخ، تقدیر، ذات اللہ، صفات اللہ اور اطاعت کا موجب اجر و ثواب ہونے اور معصیت کا موجب سزا و نقصان ہونے کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ الغرض اللہ کا فرمان ”يُؤْمِنُونَ بِالسَّغِيْبِ“ جن ضروریات دینیہ کو شامل ہے وہ سب امور غیبیہ ہیں جن کا علم رسول اللہ ﷺ کو حاصل

(۱) یونس، ۲۱۔

(۲) الانفطار، ۱۱۔

ہونے پر اللہ کا بتانا دلیل ہے اور ہمیں حاصل ہونے پر رسول اللہ ﷺ کا بتانا دلیل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ آیت کریمہ ”يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ“ میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے لے کر اس کے اسماء و اوصاف تک اور اس کے افعال سے لے کر جملہ کمالات تک، جنت اور اس کے احوال سے لے کر دوزخ اور اس کے احوال تک، قبر کے حالات سے لے کر احوال آخرت تک، اطاعت کا موجب اجر و ثواب ہونے سے لے کر معصیت کا سزا و نقصان کے موجب ہونے تک اور کس اطاعت پر کتنا ثواب، کب اور کیسا اور کہاں پر ملتا ہے اور کس معصیت پر کتنا عذاب، کب، کیسا اور کدھر ملتا ہے اس قسم ”كُلُّ مَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ رَبِّهِ وَأَخْبَرَ بِهِ وَرَعَبَ فِيهِ أَوْ رَهَبَ عَنْهُ“ کا ایک ایک مظہر و مصداق امور غیبیہ کے قبیل سے ہیں جن پر ایمان لانا اور انہیں حق جاننا صرف مومن مسلمان کا ہی طرہ امتیاز ہے۔ اہل ایمان کو یہ سعادت رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے بغیر ممکن ہی نہیں تھی اور رسول اللہ ﷺ کو ان توفیقات و سعادتوں کا مجسمہ ہونا اللہ تعالیٰ کی توفیق و تعلیم کے بغیر ناممکن تھا۔ ایسے میں اللہ کے فرمان ”يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ“ کے مفہوم میں پائے جانے والے ان تمام امور غیبیہ کو جاننا انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی اور امتِ اجابت کے لیے بھی علم غیب کی اس قسم میں شامل ہیں جس کو جملہ مفسرین کرام نے ماعلیہ الدلیل سے تعبیر کیا ہے یہاں پر دلیل کی نوعیت اگرچہ مختلف ہے کہ انبیاء و مرسلین کے لیے اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے اور امتِ اجابت کے لیے دلیل رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو علم غیب مختص ہے وہ مایس علیہ الدلیل ہے کیوں کہ ہر چیز پر واقعی دلیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے صفت علم بھی اس کے دوسرے تمام اوصاف کمالیہ کی طرح ہر قسم دلیل سے ماوراء و بے نیاز ہے اس کا کسی اور کو منتقل ہونے یا عطیہ ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا ذات باری تعالیٰ سے ناقابل انفکاک اور اس کے ماسوا میں پایا جانا ایسا ہی محال ہے جیسا وصف الوہیت کا کسی غیر اللہ میں پایا جانا محال ہے۔ لہذا سورۃ الجن کی آیت 26 کی تفسیر کرتے ہوئے جن مفسرین کرام نے ”لَا يُطْلَعُ عَلَىٰ غَيْبِهِ الْمُخْتَصَّ بِهِ أَحَدًا إِلَّا الرُّسُلُ“ کہا ہے۔

ان سب کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے یعنی علم غیب اضافی مایس علیہ الدلیل اس پر اطلاع و آگاہی نہیں فرماتا مگر ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین کو تو اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ میں پیغمبر کے شریک ہونے یا جو علم غیب اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ ہے اس کا غیر اللہ کو عطیہ ہونے کا تصور کرنا سوافہم کا نتیجہ ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ورنہ اصل مسئلہ واضح ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفت مختصہ ہے وہ علم غیب ذاتی ہے جو مایس علیہ الدلیل ہے، ناقابل انتقال، متمنع الانفکاک اور انسان کی فہم و ادراک سے ماوراء ہے جب تک اللہ تعالیٰ اس کی کچھ جھلک و عکس کسی کو عطا نہیں فرماتا از خود اس پر اطلاع و آگاہی نہ کسی ملک مقرب کے لیے ممکن ہے نہ کسی نبی مرسل کے لیے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مایس علیہ الدلیل اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ اور ماعلیہ الدلیل پیغمبر کی صفت مختصہ ہونا ایک دوسرے سے جدا حقیقت ہونے کی طرح جو خاصۃ اللہ ہے وہ قدیم اور واجب ہے، ازلی، ابدی ہے غیر متناہی اور محیط ہے جبکہ خاصۃ الرسول حادث و ممکن ہے اور متناہی و غیر محیط لجمع معلومات اللہ ہے۔ ایسے میں مفسرین کرام کا یہ کہنا کہ ”اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ مختص علم غیب پر رسولوں کو مطلع فرماتا ہے“ اس کے سوا اور کوئی مفہوم نہیں رکھتا کہ علم غیب ماعلیہ الدلیل سے آگاہی و اطلاع فرماتا ہے جو انہی کا خاصہ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و عطیہ کے بغیر ان حضرات کے لیے علم کا یہ انداز ممکن ہی نہیں تھا اور انہیں آگاہی و اطلاع کی توفیق عطا کرنے کے بعد بھی ان چیزوں کے ساتھ اس وحدہ لاشریک کا علم پہلے کی طرح ہی مستمر و غیر متغیر ہے، نیز پہلے کی طرح اب بھی مایس علیہ الدلیل ہے۔

نیز ان چیزوں میں سے ایک ایک شے سے متعلق پہلے کی طرح اب بھی اس کا علم غیر متناہی و محیط ہے جیسے فرمایا ”وَأَخْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا“ (الحج، 28) جس کے نتیجہ میں ان ذوات قدسیہ کو توفیق و عطیہ ہونے والا یہ علم مذکورہ تمام مابہ الامتیاز کے ساتھ ساتھ ان چیزوں سے متعلق علم الہی کے مقابلہ میں اتنی نسبت بھی نہیں رکھتا جتنی قطرے کو دریا کے ساتھ ہے، نہیں رکھتا واللہ نہیں رکھتا کیوں کہ یہاں پر قطرہ بھی متناہی ہے دریا بھی متناہی ہے جبکہ ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ان چیزوں

سے متعلق جو علم ہے وہ متناہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا جو علم ان کے ساتھ وابستہ ہے وہ غیر متناہی ہے۔ نیز ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین کو ان چیزوں کا علم عطا کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں کے ساتھ علم غیب اضافی مالیس علیہ الدلیل ہونے کی طرح ہی بعد العطاء والتوفیق بھی مالیس علیہ الدلیل ہے۔ نیز قبل العطاء والتوفیق جیسے کوئی ملک مقرب و نبی مرسل تک ان چیزوں کے علم میں اس کے ساتھ شریک نہیں تھا بعد التوفیق والعطاء بھی نہیں ہے۔ یہ تمام امتیازات صرف ان چیزوں کے علم سے متعلق ہیں جن کی اطلاع و آگاہی اس وحدہ لاشریک نے ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو دی ہے جو فرمان الہی:

”وَعَلَّمَكُمَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُونَ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا“ (۱)

”وَكَذَلِكَ نُبَيِّنُ لِبَنِي إِسْرَءِيلَ مَا لَمْ يُلْقِ اللَّهُ عَلَيْهِم مَّلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“ (۲)

”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْهِرَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهِ مَنْ يَّشَاءُ“ (۳)

”عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيُعْلَمَ اَنْ قَدْ اُبْلَغُوْا رِسَالٰتِ رَبِّهِمْ وَاَخَاطُ

بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَخْصٰی كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا“ (۴)

”يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ“ (۵)

فرمان نبوی ﷺ ”اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ“ (مسلم شریف، ج ۲، ص ۵۰۶، ابواب الزہد) جیسے نصوص سے ثابت ہو رہا ہے جبکہ ان کے علاوہ وہ چیزیں جن کے علم کی توفیق و عطیہ ابھی نہیں ہوا جو فرمان خداوندی ”وَمَا یُعْلَمُ جُنُوْدُ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ“ (الدر، ۳۱) ”قُلْ لَوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَفَیْدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا“ (الکہف،

(۱) النساء، ۱۱۳۔ (۲) الانعام، ۷۵۔ (۳) آل عمران، ۱۷۹۔

(۴) الجن، ۲۶، ۲۷، ۲۸۔ (۵) البقرہ، ۳

(۱۰۹) ”وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامًا وَ الْبَحْرُ یَمْدُہُ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ“ (القمان، ۲۷) اور فرمان نبوی ﷺ ”فَاَحْمَدُ رَبِّیْ بِمَا حَمَدَہُ یُعْلَمُ مِنْہَا“ (مسلم شریف، ج ۱، ص ۱۱۱، باب الثناء) جیسے نصوص کے مقتضاء ابھی صیغہ خفا اور ماوراء عطا ہیں وہ ماوراء العد والحد ہونے کی بنا پر ان چیزوں کی ان کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہے جس کی وضاحت بخاری شریف کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کے مطابق چڑیا کا دریا سے اپنی چونچ میں قطرہ پانی لینے کو دیکھ کر خضر نے حضرت موسیٰ نے کہا:

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم دونوں کا علم مل کر بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے اتنی نسبت بھی نہیں رکھتا جتنا اس چڑیا نے دریا سے اٹھایا ہے۔

خلاصہ الجواب بعد التحقیق:- مفسرین کا یہ کہنا کہ ”اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ مختص علم غیب پر انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو مطلع فرماتا ہے“ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ انسانوں کے عرف میں جس قسم علم غیب کو اللہ تعالیٰ کا خاصہ سمجھا جاتا ہے وہ وہی ہے جو ذات الہی کا مقتضاء اور انسانوں کی فہم و ادراک سے ماوراء اور مالیس علیہ الدلیل ہے اس کے کچھ عکس و جھلکیوں سے ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو مطلع فرماتا ہے تاکہ ان کی عزت افزائی یا ان کی نبوت پر دلیل و مجرہ ہو جائے یا امت کے لیے رہنمائی اور اصلاح احوال کی سامان رسانی ہونے کے ساتھ عاقبت نااندیشوں پر اتمام حجت ہو جائے کیوں کہ ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اللہ تعالیٰ اور اس کے عام بندوں کے مابین ایسے وسائل و روابط ہیں جو بیک وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی شان کے لائق و اصل و مربوط ہونے کے ساتھ انسانوں کے ساتھ ان کی شان کے لائق مربوط ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے امور تشریعی سے متعلقہ پردہ غیب کا عکس پانے کے ساتھ مجازۃ اعمال کے غیبی نظام قدرت سے لوگوں کو آگاہ فرماتے ہیں اور مصب نبوت سے متعلقہ امور غیبیہ کا عطیہ و توفیق پانے کے باوجود علم غیب علی الاطلاق کو خاصہ الہی سمجھ کر ”لَا عَلَمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا“ (البقرہ، ۳۲) کہتے ہیں، اور امور غیبیہ سے

متعلقہ اپنے اس منصب کو اللہ تعالیٰ کے علم الغیب المطلق المحیط الغیر المتناہی مایس علیہ الدلیل کے مقابلہ میں بیچ تصور کرتے ہوئے ”لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبُ لَأَسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ“ (الاعراف، 188) کی بندگی کرتے ہیں۔ اس میں خاصۃ اللہ کا غیر اللہ میں پائے جانے کا تصور ہی خلاف حقیقت ہے۔ اس کو وصف الوہیت پر قیاس کرنا اس لیے غلط ہے کہ وصف الوہیت کو خاصۃ اللہ سمجھنے میں لوگوں کے عرف کو دخل نہیں ہے بلکہ خاصہ حقیقی ہونے کی بنا پر کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو کسی بھی طریقے سے غیر اللہ میں اس کی موجودگی کا تصور کر سکے۔ ایسے میں مطلق علم الغیب مایس علیہ الدلیل کی کچھ جھلکیوں کی توفیق و عطیہ کو ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم میں دیکھ کر وصف الوہیت کو اس پر قیاس کرنے کی کوئی تک ہی نہیں ہے۔

دوسرا جواب:- جن مفسرین کرام نے علم غیب کے حوالہ سے خاصۃ اللہ پر انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے بجانب اللہ مطلع ہونے کا قول کیا ہے اس میں خاصۃ اللہ کے اندر انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے شریک ہونے کا تصور ہی نہیں ہے چہ جائیکہ وصف الوہیت کو اس پر قیاس کر کے مذکورہ معارضہ کی گنجائش ہو سکے۔ اس کا تصور تب ممکن ہوتا اگر اللہ تعالیٰ کا خاصہ یعنی علم غیب ذاتی، اضافی، المطلق المحیط الغیر المتناہی، مایس علیہ الدلیل کے جزئیات و مندرجات میں سے کسی فرد ان حضرات کی شرکت ممکن ہوتی یا اس کا ان حضرات کو عطیہ ہونا ممکن ہوتا جب ایسا ہونا عقلاً و نقلاً ناممکن ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ میں ان حضرات کے شریک ہونے یا اللہ تعالیٰ کی اس صفت مختصہ کی ان حضرات کو منتقل ہونے اور وصف الوہیت کو اس پر قیاس کر کے مذکورہ اشتباہ پیدا کرنے کا کیا جواز باقی رہتا ہے۔ درحقیقت مفسرین کرام نے یہ جو کہا ہوا ہے اس میں تین چیزیں ان کے پیش نظر ہیں:

پہلی چیز:- علم الغیب الذاتی، الاضافی المطلق، المحیط الغیر المتناہی مایس علیہ الدلیل ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہونے کی وجہ سے کسی اور کا اس کے ساتھ متصف ہونا محال ہے چاہے ملک مقرب یا نبی مرسل ہی کیوں نہ ہو۔

دوسری چیز:- مطلق علم غیب العطائی الحقیقی اوالاضافی، المحمود المتناہی، مایس علیہ الدلیل ہے جو ذوات قدسیہ انبیاء مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا خاصہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شان اقدس کے مناسب نہیں ہے۔

تیسری چیز:- خاصۃ اللہ کے کچھ مظاہر کے عکس و جھلکیوں پر ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہے جو بعد عطاء اللہ انفعال کے درجہ میں مطلق علم الغیب العطائی الحقیقی اوالاضافی، المحمود، المتناہی، مایس علیہ الدلیل کہلانے کے ساتھ خاصۃ الانبیاء و المرسلین علیہم الصلوٰۃ کہلاتا ہے، مفسرین کرام کی مذکورہ عبارات ان تینوں مفہومات پر واضح دلالت کر رہی ہیں۔

اُن کی نگاہ بصیرت کو آفرین کہ اس مختصر عبارت میں خاصۃ اللہ اور خاصۃ الرسول کو جدا جدا ظاہر کرنے کے ساتھ خاصۃ الرسول کے حصول کا جو ذریعہ ہے اسے بھی واضح کر دیا کہ اللہ کی عطاء کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو قرآن شریف کے انداز بیان کے مطابق اطلاع اللہ، اظہار اللہ، وحی اللہ، ارادۃ اللہ جیسی تعبیرات میں بیان ہو رہے ہیں جن کی بالترتیب مثالیں مندرجہ ذیل آیات کریمہ میں موجود ہیں:

”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْهِرَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ“ (۱)

”عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا ۖ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۖ لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رَسُولًا رِسَالَتِ رَبِّهِمْ وَأَخَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا“ (۲)

”بَلِّغْ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ“ (۳)

”وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (۴)

ان حقائق کی موجودگی میں مفسرین کرام کی مذکورہ عبارات کو مشکوک قرار دینا ہرگز قرین

(۱) آل عمران، 179۔ (۲) الجن، 26، 27، 28۔

(۳) ہود، 49۔ (۴) الانعام، 75۔

انصاف نہیں ہے کیوں کہ ان عبارات میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو خاصۃ اللہ کو انبیاء و مرسلین کو منتقل کرنے یا خاصۃ اللہ میں ان کے شریک ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ مذکورہ اشتباہ صفت اللہ کا کسی کو منتقل و عطاء ہونے اور صفت اللہ پر مطلع ہونے کے مابین فرق کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے جو بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ صفت اللہ کا کسی کو عطیہ ہونا اور منتقل ہونا ناممکن و محال ہے جبکہ بجانب اللہ اس پر مطلع کیا جانا ممکن ہے مفسرین کرام نے اسی امکانی صورت کو ذکر کیا ہے یہی منطوق القرآن اور جملہ اہل اسلام کا مشترکہ عقیدہ ہے۔

☆☆☆☆☆

مسند ارشاد و امام سے متعلق سوال کا جواب

کیا فرماتے ہیں علماء دین ایسے شخص کے بارے میں (جو عوام میں سنی خفی بریلوی عالم دین و پیر طریقت جانا جاتا ہے) کہ وہ کسی دوسرے شخص کو (جو خود بھی سنی خفی بریلوی مسلک کا داعی و پیر ہے) کہ متعلق کہے کہ دیوبندی ہے۔ مذکورہ اوّل مذکور دوم کو چند لوگوں کی موجودگی میں ”دیوبندی“ بتاتا ہے (یعنی گستاخ رسول) پھر کسی دوسری مجلس میں انہی لوگوں کی موجودگی میں اپنے قول سے انکار کرتا ہے۔

کیا ایسا شخص پیر طریقت کے حوالے سے صحیح ہے اور ایسے شخص کی بیعت کرنا یا اس کا مرید رہنا چاہئے؟

کیا ایسے شخص کی امامت و خطابت درست ہوگی۔ اور اہلسنت و جماعت خفی بریلوی مسلک کی مساجد میں ایسے شخص کو امام اور خطابت کی اجازت دینی چاہئے۔ جبکہ پہلے ہی اُس کے اس بیان کی وجہ سے خفی بریلوی مسلک (جو کہ اپنا عقیدہ خفی بریلوی مسلک خود بھی بتاتا ہے) بدنامی ہو رہی ہو؟ ایسے شخص کے اپنے عقیدہ کے متعلق کیا رائے رکھی جائے؟

کیا اُس کا لوگوں کے سامنے دوسرے عقیدہ کا الزام لگانا اور اُس کے بعد منکر ہو جانے سے حالات بگڑ جانے پر اُس کو امامت و خطابت سے علیحدہ کیا جائے؟ تاکہ آئندہ کوئی بھی شخص خواہش نفس کی پیروی کرتا ہو اور دوسرے پر بغیر کسی ثبوت کے الزام لگانے کی جسارت نہ کرے۔

الساؤل:- محمد رضوان داؤدی، 113 چوہدری پارک 2، شاد باغ لاہور پنجاب پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الجواب:- سوال نامہ لہذا کے مبنی بر حقیقت ہونے کی صورت میں مذکور فی السؤال شخص فاسق معلن ہے جس وجہ سے اُسے امام و خطیب مسجد بنانا محض حرام ہے چہ جائے کہ شیخ طریقت یا پیر و مرشد بننے کے

لائق ہو کیوں کہ امام مسجد بننے کے لیے جو معیار ضروری ہے اس سے وہ معیار بہت اہم و مقید اور مخصوص ہے جو پیر و مرشد کے منصب پر فائز ہو کر لوگوں کو بیعت دینے والوں کے لیے معتبر ہے جب وہ اپنے علانیہ فسق کی بنیاد پر امام و خطیب بننے کے لائق نہیں ہے تو پھر پیر و مرشد بن کر لوگوں کو بیعت کرنے کے جواز کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ امام مسجد ہونے کے لیے نماز سے متعلق ضروری مسائل، جماعت سے متعلق ضروری احکام اور لوازماتِ امامت سے متعلق شرعی حدود کو جاننے کے ساتھ علانیہ فاسق نہ ہونا شرط ہے جبکہ مرشد عام کے منصب پر فائز ہو کر ارادت عامہ کی فرضی عبادت کے طلب گار مسلمانوں کو بیعت دینے کے لیے ان تمام باتوں کے ساتھ ولایت عامہ کے منصب پر فائز ہونا بھی ضروری ہے جیسے حضرت مجدد الف ثانی (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے فرمایا:

”وَجَوْنُ صُورَةٍ شَرِيعَةٍ دَرَسَتْ كَرْدَ وَلايَتِ عَامَةٍ حَاصِلِ نَمُودِ وَاللّٰهُ وَلِيَّ الدِّينِ آمَنُوا وَابْنِ زَمَانٍ بَعْنَايَتِ اللّٰهِ سَبِّحَانَهُ سَالِكِ مُسْتَعِدِّ اَنْ هَاسِتْ كِه قَدَمِ دَر طَرِيقَتِ نَهْدِ وَ دَر وَلايَتِ خَاصَه اَرْدِ“
اس کے بعد فرماتے ہیں:

”وَاجْتِنَابِ اَز مَنَاهِي شَرْعِيَه نِيْز اَز ضَرْوَرِيَّاتِ اِيْنِ دَا اَسْتُ“ (۱)

پھر اس میں بھی ہر ولی اللہ کو پیر بن کر لوگوں کو بیعت دینا جائز نہیں ہے بلکہ ولایت عامہ کے حوالہ سے اولیاء اللہ کی ہزاروں قسموں میں سے صرف ان حضرات کو اس منصب پر آنا جائز ہے جو باعمل علماء ہونے کے ساتھ لوگوں کی روحانی تربیت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ اور ارادت خاصہ کی نفی عبادت کے طلب گار مسلمانوں کو بیعت دینے کے لیے ان تمام کمالات کے حامل ہونے کے ساتھ توبہ سے لے کر رضا تک تمام منازل سلوک پر کم از کم اجمالی عبور و تمیز کا با ترتیب حاصل ہونا ضروری ہے جس کے لیے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے اجتناب اولین شرط ہے۔ جبکہ مذکور فی السؤال

(۱) نور الخلائق، ص 134، مکتوب نمبر 50۔

شخص علانیہ فسق میں مبتلا ہونے کی بنا پر خود قابل تنبیہ و قابل اصلاح ہے۔ ایسے میں اس کے ہاتھ پر کسی قسم کی بھی بیعت ناجائز اور اس کو پیر و مرشد بنانا حرام ہے۔ اس لیے کہ حقیقی پیر و مرشد واجب التکریم اور قابل احترام ہوتا ہے جبکہ فاسق معطن واجب التوحین ہے۔ جیسے فتاویٰ زیلیعی میں ہے:

”وَقَدْ وَجِبَ عَلَيْهِمْ اِهَانَتُهُ شَرْعًا“ (۱)

یعنی علانیہ فاسق کی اہانت کرنا از روئے شرع مسلمانوں پر واجب ہے۔

اعلیٰ حضرت بریلوی (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے بھی فتاویٰ زیلیعی کی اس عبارت کو فتاویٰ رضویہ، جلد 6، صفحہ 601 پر مع سیاق و سباق نقل فرمایا ہے۔

خلاصۃ الکلام بعد التفصیل:- مذکور فی السؤال شخص علانیہ فاسق ہونے کی وجہ سے امام مسجد بنانے کے قابل ہے نہ اسے پیر بنانا جائز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجاب کی زمین پیری مریدی کے حوالہ سے نخی و زرخیز ہے۔ جس میں معیاری و غیر معیاری کی تمیز نہیں ہوتی۔ ایسی جہالت خیزی سے اللہ تعالیٰ سب کو بچنے کی توفیق دے، آمین۔

اس اجمالی جواب کے بعد تفصیل کے درجہ میں مذکور فی السؤال شخص کے علانیہ فاسق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کھلے بندوں ایک مسلمان کو دیوبندی کہہ کر اس کی توہین، بغیبت، بہتان اور دل آزاری کے چار کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہونے کے بعد حالات کو دگرگوں ہوتے ہوئے دیکھ کر ایسا نہ کہنے کے جھوٹ کا ارتکاب کرنا ایسے کھلے جرائم ہیں جن کا مرتکب علانیہ فاسق قرار پاتا ہے، کیوں کہ لغت و شریعت مقدسہ کی زبان میں ایسے جرائم کے مرتکب کو فاسق کہا جاتا ہے۔ جیسے لسان العرب میں ہے:

”الْفِسْقُ الْعِصْيَانُ وَالتَّرْكُ لِأَمْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالْخُرُوجُ عَنْ طَرِيقِ الْحَقِّ“ (۲)

فتاویٰ رضویہ میں ہے: ”فاسق وہ کہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو“ (۳)

(۱) فتاویٰ زیلیعی، ج 1، ص 134، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

(۲) لسان العرب، ج 10، ص 308۔ (۳) فتاویٰ رضویہ، جلد 6، صفحہ 601۔

اور اس سے پہلے یوں فرمایا:

”کبیرہ کا علانیہ مرتکب فاسق معطن اور فاسق معطن کو امام بنانا گناہ اور اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی کہ پڑھنی گناہ اور پھیرنی واجب“ (۱)

علانیہ فاسق کو نہ امام مسجد بنانا جائز ہے نہ پیر و مرشد بنانا۔ اگر کسی ناواقف حال نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کی ہو تو اُس کے فسق کا شرعی ثبوت معلوم ہو جانے کے بعد اُسے چھوڑنا واجب ہے۔ جیسے فتاویٰ رضویہ، جلد 26، صفحہ 571 میں اور صفحہ 568 میں اسی طرح لکھا ہوا موجود ہے۔

الغرض مذکور فی السوال شخص کا شرعی حکم علانیہ فاسق ہونے کی بنیاد پر تا وقتی علانیہ توبہ نہ کرے اُس وقت تک مردود الشہادۃ ہونے، امامت کے قابل نہ ہونے اور لوگوں کو بیعت کرنے کے اہل نہ ہونے جیسے احکام کے سوا اور کچھ نہیں ہے التزام کفر یا لزوم کفر کے احکام اُس پر جاری کرنے کا موجب کوئی شے یہاں موجود نہیں ہے۔ ایسے میں مرکزی دارالافتاء بریلی شریف کے حضرت مولانا محمد مظفر حسین قادری رضوی مدظلہ کا اس حوالے سے لکھے ہوئے فتویٰ کا وہ حصہ درست نہیں ہے جس میں حضرت نے فرمایا ہے:

”اور اگر مرتد جان کر دیوبندی کہا ہے تو بعد توبہ صحیح تجدید ایمان کرے اور اگر بیوی رکھتا ہے تو تجدید نکاح کرے“

مولانا موصوف کے فتویٰ کا یہ حصہ اس لیے غلط ہے کہ علم ہمیشہ معلوم کے تابع اور اُس کے مطابق ہوتا ہے۔ لہذا یہ کلام تب درست ہو سکتا ہے کہ جب متعلقہ شخص کے ارتدادی عقیدہ یعنی تجدید الناس، براہین قاطعہ اور حفظ الایمان کے مندرجات جیسے عقیدہ کا حامل ہونا اُسے معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس وقت وہ اپنے علم کے مطابق درست کہہ رہا ہے جس میں کوئی قباحت ہے نہ گناہ۔ ایسے میں تجدید ایمان و تجدید نکاح کے احکام اُس پر جاری کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ حالاں کہ تجدید ایمان

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج 6، ص 600۔

ونکاح لزوم کفر کے احکام میں شمار ہوتے ہیں۔ جب یہاں پر لزوم کفر کی کوئی شے ہی موجود نہیں ہے بلکہ جیسے جان رہا ہے ویسے اُس کے متعلق بول رہا ہے۔ جس میں کوئی معصیت ہی نہیں ہے تو پھر لزوم کفر کے ان احکام کو اُس پر لاگو کرنے کی کیا تلک ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ اپنے سابقہ کردار سے انکار کر کے جھوٹ کا ارتکاب کر رہا ہے جس وجہ سے فاسق معطن کی تعریف اُس پر صادق آ رہی ہے۔

نیز اس فتویٰ کے سوال نمبر 3 کا جواب سوال نمبر 1 کے جواب کے مذکورہ حصہ کے ساتھ متضاد ہے کہ پہلے اُس پر تجدید ایمان و تجدید نکاح واجب قرار دینے کے بعد اُسے بدعقیدگی سے پاک کہنا جمع بین التقضیین ہے۔ کیوں کہ تجدید ایمان و نکاح لزوم کفر کے احکام ہیں جبکہ کفر کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ عقیدہ کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں حضرت موصوف کے ان دونوں فتوؤں کا مفاد متعلقہ شخص کو بیک وقت بدعقیدہ و غیر بدعقیدہ کہنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو ہرگز قابل التفات نہیں ہے۔

نیز سوال نمبر 3 کے جواب میں متعلقہ شخص کو بدعقیدگی سے بچانے کے لیے اُس کے دوسرے کردار یعنی پہلے کردار سے انکار کرنے کو دلیل بنانا بھی غلط ہے کیوں کہ اُس کا اپنے پہلے کردار سے انکار کرنا جو شہادتوں کی رو سے سراسر جھوٹ ہے اُس کی بدعقیدگی کے ثبوت و عدم ثبوت سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتا کیوں کہ پہلے کردار میں اُس کا متعلقہ شخص کو دیوبندی کہنا جو شہادتوں سے ثابت ہو چکا ہے دو حال سے خالی نہیں ہے:

پہلا حال:- اُسے دیوبندی العقیدہ جان کر ایسا کہہ دیا ہے تو اپنی معلومات کے مطابق اظہار خیال کرنے کا اُسے حق تھا۔ جس میں نہ کسی قسم کی بدعقیدگی ہے نہ گناہ اگرچہ یہ سب کچھ کسی مغالطہ یا غلط فہمی پر مبنی ہو پھر بھی اس صورت میں اُسے معصیت کا کہنا ہی غلط ہے چہ جائے کہ بدعقیدہ قرار دے کر تجدید ایمان و نکاح کا حکم جاری کرنا درست ہو سکے۔

دوسرا حال:- مرتد جان کر نہیں بلکہ مغلوب النفس ہو کر بدعتی اور اہانت و غیبت یا بہتان یا گالی کے طور پر ایسا کہہ دیا ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں علانیہ فسق کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور انکار

کرنے یا نہ کرنے کا فرق صرف اس بات میں ہے کہ پہلے والا کردار سے انکار نہ کرنے کی صورت میں صرف اُن ہی پہلے والے چار پانچ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ جبکہ انکار کرنے کی صورت میں اُن کے ساتھ انکار کے جھوٹ والے گناہ کو بھی پہلے والے گناہوں کے ساتھ جمع کر کے فسق در فسق میں علانیہ مبتلا ہو رہا ہے۔ بہر تقدیر اس کے انکار کرنے کو بدعتیہ ہونے یا نہ ہونے میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ لہذا موصوف کا یہ انداز فتویٰ بے محل ہے۔

نیز سوال نمبر ۴ کے جواب کا دوسرا حصہ کمزور ہے جس میں حضرت موصوف نے لکھا ہے:

”ہاں اگر حکم مذکور پر عمل نہ کرے تو امامت سے معزول کرنا جائز ہے“

اس کی کمزوری اور شرعی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علانیہ فاسق بعد التنبیہ بھی اگر علانیہ توبہ نہ کرے تو اسے امامت سے نکالنا محض جائز نہیں بلکہ واجب ہے اور توبہ تا تب نہ ہونے کے باوجود اسے امام رکھ کر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنی گناہ ہے۔ امام اہلسنت کا ایسی صورت حال سے متعلق حقیقی فتویٰ یہ ہے کہ اس فاسق معین واجب العزل شخص کو معزول کر کے اس کی جگہ اگر قابل امامت شخص دستیاب نہ ہوتا ہو تو پھر بھی اس کی اقتداء میں جماعت کے ساتھ پڑھنے کی بجائے تنہا پڑھے۔ جیسے فتاویٰ رضویہ میں ہے۔ جس کی پوری عبارت مندرجہ ذیل ہے:

”اگر علانیہ فسق و فجور کرتا ہے اور دوسرا کوئی امامت کے قابل نہ مل سکے تو تنہا نماز پڑھیں“ فَإِنَّ تَقْدِيمَ الْفَاسِقِ اِنَّمُ وَالصَّلَاةُ خَلْفَهُ مَكْرُوْهُةٌ تَحْرِیْمًا وَالْجَمَاعَةُ وَاجِبَةٌ فَهَمَّا فِیْ ذَرْجَةٍ وَاحِدَةٍ وَقَدْ رُوِيَ الْمَفَاسِدُ اَھَمُّ مِنْ جُلْبِ الْمَصَالِحِ“ اور اگر کوئی گناہ چھپا کر کرتا تو اس کے پیچھے نماز پڑھے اور اس کے فسق کے سبب جماعت نہ چھوڑیں۔ (لَاِنَّ الْجَمَاعَةَ وَاجِبَةٌ وَالصَّلَاةُ خَلْفَ فَاسِقٍ غَیْرِ مُعْلِنٍ لَا تُکْرَهُ اِلَّا تَنْزِیْہًا) (۱)

خلاصہ الفتویٰ:- مذکور فی السؤال شخص اپنے مذکورہ کردار کی بنا پر فاسق معین ہے جس وجہ سے اس کی

امامت جائز ہے نہ اس کے ہاتھ پر بیعت روا، اگر کسی ناواقف نے بیعت کی ہو تو معلوم ہو جانے کے بعد اسے چھوڑنا واجب ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ اَتَمُّ

خَرَرَهُ الْعَبْدُ الضَّعِیْفُ

پیر محمد چشتی

دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ، بیرون یکہ توت پشاور شہر

16/08/2006

سورة البقرة، آیت نمبر 49 کا ترجمہ

میرا سوال یہ ہے کہ آیت کریمہ ”وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ“ (البقرہ، 49) کا جو ترجمہ کنز الایمان میں کیا گیا ہے کہ:

”یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ وہ تم پر بڑا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام۔“

اس میں ”بلاء“ کے ترجمہ میں تردید اور شک ظاہر ہو رہا ہے اگر مصنف کو شک نہ ہوتا تو ”بڑی بلا تھی یا بڑا انعام“ کہہ کر ڈبل ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی۔ ان دونوں ترجموں کے مابین حرف ”یا“ کے آنے سے شک کو اور بھی تقویت ملتی ہے کیوں کہ لفظ ”یا“ کو ہمیشہ شک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز کنز الایمان سے پہلے اور بعد میں کیے جانے والے تراجم میں ڈبل ترجمہ کے اس انداز کے نہ پائے جانے سے بھی یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ کے اس انداز کو شک پر محمول سمجھنا سوافہم کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ حرف ”یا“ ہمیشہ شک کے لیے استعمال ہوتا ہے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ محل شک میں شک کے لیے اور محل یقین میں تنویع یا مانعہ الجمع اور مانعہ الخلو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس مقام پر حرف ”یا“ کے مابعد و ماقبل دونوں اپنی اپنی جگہ امر یقینی ہونے کی بنا پر محل شک نہیں ہیں کیوں کہ کنز الایمان کے مذکورہ ترجمہ میں اس کے ماقبل کے الفاظ ”اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی“ کا مضمون یعنی اس واقعہ کا بنی اسرائیل کے لیے بڑا امتحان و آزمائش ہونا

امریقینی ہے، جس میں نہ کسی کو کبھی شک ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے مابعد کے الفاظ ”یا بڑا انعام“ کا مفہوم بھی امر یقینی ہے کہ فرعونوں کے ہاتھوں بدترین عذاب اور استحصال کی زندگی سے اللہ تعالیٰ کا ان کو نجات دینا بالیقین ان پر انعام و احسان تھا جس میں نہ کسی کو کبھی شک ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے ایسے میں یہاں پر شک کا وہمہ کرنا بد فہمی نہیں تو اور کیا ہے جبکہ حقیقت میں آیت کریمہ کے اس قابل فخر ترجمہ میں حرف ”یا“ محض تنویع اور مراد الہی کے اعتبار سے محض احتیاط کے لیے ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ مفسرین کرام کی تصریحات کے مطابق لفظ ”بلاء“ کے اندر یہاں پر پانچ احتمالات ہیں۔ پہلا احتمال:- اس سے مراد غم و صدمہ ہے جو فرعونوں کے مظالم کی وجہ سے بنی اسرائیل کو پہنچتا تھا جس کے مطابق آیت کا مفہوم ہوگا کہ ”تمہارے رب کی طرف سے کائنات میں جاری نظام تکوین کے تحت فرعونوں کے ہاتھوں میں تمہیں پہنچنے والا عذاب جو تمہارے لیے بڑا غم و صدمہ تھا جس سے ہم نے تم کو نجات بخشی۔“

دوسرا احتمال:- اس سے مراد زحمت تکلیف بالחסنات ہو جس کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا ”فرعونوں کے مظالم سے نجات دینے کے احسان میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی زحمت تکلیف تھی۔“

تیسرا احتمال:- اس سے مراد زحمت تکلیف بالسیئات ہو جس کے مطابق آیت کریمہ کا مفہوم یوں ہوگا ”فرعونوں کے مظالم و استحصال میں رکھنے میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی زحمت تکلیف تھی۔“

ان دونوں کی تائید و تصدیق اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے جہاں ”وَبَلَّوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ“ (الاعراف، 168) فرمایا ہے۔

”یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کبھی راحتوں اور کبھی تکلیفوں کے ساتھ آزمایا۔“

چوتھا احتمال:- اس سے مراد مطلق امتحان و آزمائش ہو جو آیت کریمہ ”وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ“ سے لے

کر آخر تک کے مجموعہ سے مستفاد ہے۔ اس مقام پر آیت کریمہ کے لفظ ”بَلَاءَ“ کے یہ چاروں مفہوم وہ ہیں جن کو کنز الایمان کے ترجمہ میں مذکور لفظ ”بَلَاءَ“ یکساں شامل ہو رہا ہے۔

جبکہ اس کے پانچویں مفہوم کو شامل نہیں ہے کیوں کہ لفظ ”بَلَاءَ“ کا پانچواں مفہوم بمعنی احسان و انعام ہے جبکہ اُردو لغت کے مطابق اس معنی میں ”بَلَاءَ“ استعمال نہیں ہوتا۔ اس معنی کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ کا مفہوم ہوگا؛

”فرعونیوں کے مظالم سے تمہیں نجات بخشنے میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر بڑا احسان و انعام تھا۔“

اہل فہم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان پانچوں معانی و احتمالات میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ یقینی امر ہے متعدد آیات قرآنی کے مدلول ہیں اور بلا تخصیص تمام مسلمانوں کے عقائد میں شامل ہے کہ فرعونوں کے مظالم بنی اسرائیل کے لیے بڑے غم تھے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین اور سر القدر کے ماتحت ہو رہا تھا اور ابتلاء بالחסنات والسیات کی زحمت بڑا امتحان ہے اور ان مظالم سے نجات بخشنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر بڑا احسان و انعام تھا۔ ایسے میں پیش نظر آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنے کا جواز نہیں رہتا جب کسی ایک کو بھی چھوڑنے کی گنجائش نہیں ہے تو پھر ترجمہ میں ان میں سے ایک ایک کا اظہار کرنا اور ہر ایک پر دلالت کرنے کے لیے الفاظ لازماً ضروری قرار پاتا ہے جس کی جائز و ممکن صورتیں صرف تین ہو سکتی ہیں؛

پہلی صورت:- ان میں سے ہر ایک کے لیے مستقل اور جدا جدا الفاظ استعمال کیے جائیں جس کی کچھ جھلک ابھی ہم بیان کر آئے ہیں لیکن اس صورت کو ممکن و جاز ہونے کے باوجود ترجمہ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ترجمہ لفظ کا تابع ہوتا ہے معانی کا نہیں۔

دوسری صورت:- سب کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کر کے اُسی سے ان سب کا اظہار کیا جائے جو یہاں پر ممکن نہیں ہے کیوں کہ زحمت تکلیف سمیت غم و صدمہ اور انعام و احسان کو یکساں

شامل ہونے والا لفظ پیدا کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے یہ تو اللہ وحدہ لا شریک کی صفت مختصہ ہے کہ لفظ ”بَلَاءَ“ میں ان پانچوں کو جمع کرنے کی طرح قرآن شریف کے اور بھی متعدد مقامات پر اس ناممکن کو ممکن بنایا ہے۔

تیسری صورت:- ان کو دو حصوں میں تفریق کر کے بعض کو شامل ایک لفظ لایا جائے اور باقی بعض کے لیے دوسرا لفظ لایا جائے یہاں پر کنز الایمان کے خن دان و قرآن شاس مصنف نے اسی صورت پر عمل کیا ہے کہ لفظ ”بَلَاءَ“ کے پہلے چار معانی کی ترجمانی کے لیے ”اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی کہا“ کیوں کہ لفظ ”بَلَاءَ“ کے یہ چاروں معانی اُردو لغت میں پائے جاتے ہیں جن کے لیے یہ کثیر الاستعمال اور سہل الفہم بھی ہے اور خوب صورت بھی اور پانچویں معنی کی ترجمانی کے لیے ”یا انعام“ کہا اس کے ساتھ ایک کمال یہ کیا ہے کہ پہلے تینوں کی کثرت کو ملحوظ خاطر رکھ کر مقدم ذکر کیا جبکہ پانچویں معنی کو اُس کی وحدت و تنہائی کے پیش نظر موخر کر دیا۔

عرفان بالالائے عرفان:- وحدت و کثرت کے مابین فرق مراتب کی خاطر پہلے تینوں کو سلاست تحریر پر رکھا جبکہ پانچویں کو بین القوسین کر دیا۔ ترجمہ القرآن کے حوالہ سے حفظ مراتب کا یہ کمال، قرآن شریف کی جامعیت کو پیش نظر رکھنے کا یہ عرفان اور متن کے اندر موجود احتمالات و معانی کے اظہار میں کوتاہی سے بچنے کے لیے احتیاطی عمل کی یہ مثال دوسرے تراجم میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتی۔ ایسے میں اسے تردد اور شک پر محمول سمجھنے کو کج فہمی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے جس کا منشاء تردد فی الشیء اور عدم تعین الشیء کے مابین تمیز کو نہ سمجھنا ہے اس لیے کہ یہاں پر حرف ”یا“ کے ماقبل و مابعد میں سے ہر ایک کا امر واقعی ہونے پر یقین ہونے کے باوجود آیت کریمہ میں مراد اللہ ہونے کی حیثیت سے متعین ایک بھی نہیں ہے ورنہ کل مکاتیب فکر مفسرین کرام میں سے کوئی تو حتماً و جزاً اُس کا ذکر کرتا جبکہ دنیائے تفسیر کے اُس سر سے لے کر اس سر تک کہیں بھی ایک کو حتماً و جزاً مراد الہی ہونے کی حیثیت سے ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ سب نے انعام اور آزمائش والے دونوں مفہوموں کا یہاں پر

مراد الہی ہونے کا احتمال بتایا ہے۔ مثال کے طور پر السید محمود البغدادی الاوی الھمی التوتنی 1270ھ نے اسی آیت کریمہ کے تحت لکھا ہے:

”إِشَارَةٌ إِلَى التَّذْبِيحِ وَالْأَسْتَحْيَاءِ أَوْ الْإِنْجَاءِ“

اس کے بعد لکھا ہے:

”وَيَجُوزُ أَنْ يُشَارَ بِذَلِكَ إِلَى الْجُمْلَةِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے فرمان ”وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ“ میں اسم اشارہ سے ہو سکتا ہے کہ ”يَذْبَحُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَهُمْ“ کی طرف اشارہ ہو یا ہو سکتا ہے کہ ”وَإِذْ نَجَّيْنَاهُمْ“ کی طرف اشارہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں کی خصوصیت سے قطع نظر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے:

”فَإِنْ حُمِلَتْ الْإِشَارَةُ عَلَى الْمَعْنَى الْأَوَّلِ فَالْمُرَادُ بِالْبَلَاءِ الْمِخْنَةُ وَإِنْ عَلَى الثَّانِي فَالْمُرَادُ بِهِ النِّعْمَةُ وَإِنْ عَلَى الثَّلَاثِ فَالْمُرَادُ بِهِ الْقَدَرُ الْمُشْتَرَكُ كَالْإِمْتِحَانِ الشَّائِعِ بَيْنَهُمَا“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسم اشارہ ”وَفِي ذَلِكُمْ“ اگر پہلے معنی پر محمول ہو تو ”بَلَاءٌ“ سے مراد محنت و مشقت ہوگی اور اگر دوسرے معنی کی طرف عائد ہو تو اس سے مراد انعام و نعمت ہوگی اور اگر تیسرے معنی پر محمول ہو تو اس سے مراد قدر مشترک ہوگی یعنی مطلق امتحان و آزمائش جو امتحان بالחסنات اور امتحان بالسیات کے مابین قدر مشترک ہے۔

قاضی ناصر الدین الدیھاوی الشافعی التوتنی 685ھ نے لکھا ہے:

”مِخْنَةٌ أَنْ أُشِيرَ بِذَلِكَ إِلَى صَنِيعِهِمْ وَنِعْمَةٌ أَنْ أُشِيرَ بِهِ إِلَى الْإِنْجَاءِ“

(۱) تفسیر روح المعانی، ج 1، ص 54۔

اس کے دو سطر بعد لکھا ہے:

”وَيَجُوزُ أَنْ يُشَارَ بِذَلِكَ إِلَى الْجُمْلَةِ وَيُرَادَ بِهِ الْإِمْتِحَانُ الشَّائِعُ بَيْنَهُمَا“ (۱)

اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو حنفی المذہب مفسر کی عبارت کا ابھی بیان ہوا ہے۔

جابر اللہ الزخری المعتزلی التوتنی 538ھ نے لکھا ہے:

”وَالْبَلَاءُ الْمِخْنَةُ أَنْ أُشِيرَ بِذَلِكَ إِلَى صَنِيعِ فِرْعَوْنَ وَالنِّعْمَةُ أَنْ أُشِيرَ بِهِ إِلَى الْإِنْجَاءِ“

الامام الشوکانی من اہل الحدیث التوتنی 1250ھ نے لکھا ہے:

”إِلَى جُمْلَةِ الْأَمْرِ وَالْبَلَاءُ يُطْلَقُ تَارَةً عَلَى الْخَيْرِ وَتَارَةً عَلَى الشَّرِّ فَإِنْ أُرِيدَ بِهِ هُنَا الشَّرُّ كَانَتْ الْإِشَارَةُ بِقَوْلِهِ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ إِلَى مَا حَلَّ بِهِمْ مِنَ النِّعْمَةِ بِالدَّبْحِ وَنَحْوِهِ وَإِنْ أُرِيدَ بِهِ الْخَيْرُ كَانَتْ الْإِشَارَةُ إِلَى النِّعْمَةِ الَّتِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ بِالْإِنْجَاءِ“ (۲)

یہی حال فقہ جعفریہ اور فقہ مالکی و حنبلی مفسرین کرام کا ہے کہ ان سب نے لفظ ”بَلَاءٌ“ کا من حیث اللفظ اور ترکیبی تقاضوں کے مطابق یہاں پر مذکورہ متعدد معانی کا احتمال ذکر کیا ہے۔

ایسے میں کنز الایمان کے سوا دوسرے مترجمین کا متضاد انداز میں آیت کریمہ کے ترجمہ کو ایک کے ساتھ خاص کرنا مقام افسوس نہیں تو اور کیا ہے جبکہ لُغْتاً، ترکیباً، سیاقاً و سابقاً آیت کریمہ کا مذکورہ پانچوں معانی پر مشتمل ہونے کے ساتھ کل مکاتیب فکر مفسرین کرام کی بلا تکلیف ان تصریحات سے صرف نظر کر کے آیت کریمہ کے ترجمہ کو آزمائش کے ساتھ یا انعام کے ساتھ خاص بتانے کو معیاری ترجمہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا بلکہ اسے سیاق و سابق اور ترکیبی تقاضوں کا خلاف تو کہا جاسکتا ہے لیکن آیت کریمہ کا

(۱) تفسیر بیضاوی، ج 1، ص 300، مع الشیخ زادہ۔

(۲) تفسیر فتح القدیر، ج 1، ص 83۔

ترجمہ نہیں کہا جاسکتا، تقاضائے لغت کے منافی تو کہا جاسکتا ہے جبکہ معیاری ترجمہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا اور کل مکاتب فکر مفسرین کرام سے انحراف تو قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ ترجمہ القرآن کے حوالہ سے فرض شناسی ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ کنز الایمان کے صاحب بصیرت مصنف کا جملہ اُردو دان مسلمانوں پر احسان ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ کرنے کے حوالہ سے اس قسم تمام فکر آزمائش مقامات کے ترجمہ کرنے کا حق ادا کر کے مسلمانوں کو معیاری ترجمہ کرنے کا سبق دیا ہے۔ (فَجَزَاهُ اللَّهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ)

☆☆☆☆☆

خطاب اللہ احلیٰ لرسولہ الاعلیٰ

میرا سوال یہ ہے کہ آواحق کے شمارہ مارچ میں شمار مقدسہ جو پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف راجع ہوتے ہیں اُن کی تعبیر و ترجمہ بتانے میں کنز الایمان نے ”اے محبوب، اے حبیب، تم فرماؤ، تم فرماؤ“ جیسے الفاظ جو اختیار کیے ہیں انہیں تقاضائے ادب اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حوالہ سے شرعی حکم کے مطابق بتانے کے ساتھ اے محمد، اے پیغمبر، اے رسول، اے نبی، تم کہہ دو“ جیسے تعبیرات و تراجم کو تقاضائے ادب کے منافی کہا گیا ہے۔

جہاں تک اے محمد کہنے کو خلاف ادب اور منشاء الہی سے برعکس کہنا ہے یہ تو درست ہے کہ آیت کریمہ ”لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا“ (النور، 63) کے منافی ہے لیکن ”اے پیغمبر، اے رسول، اے نبی“ جیسے الفاظ کو اس آیت کریمہ کے ماتحت لا کر نامناسب قرار دینے کا مسئلہ ناقابل فہم ہے اس لیے کہ لفظ پیغمبر اور لفظ نبی و رسول کا ایک ہی مفہوم ہے جب اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ (المائدہ، 41)، ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ (الاعراف، 64) جیسی صفات کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کو یاد کیا ہے تو پھر اس قسم استعمالات کو ”لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا“ کے حکم میں شامل کر کے منشاء الہی کے منافی قرار دینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ نبی اور رسول کا قرآن شریف میں استعمال ہونے اور عجمی امتیوں کی زبان میں استعمال ہونے میں بڑا فرق ہے کہ لسان قرآنی میں بالخصوص قرآن شریف کے اندر جہاں پر بھی استعمال ہوئے ہیں، وہیں پر ان کے اسی مفہوم نہیں بلکہ لغوی اور وضعی مفہوم غالب ہے جس کے

مطابق ”يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ“ کے معنی ہیں ”اے وہ ذات جو متصف ہے وصف رسالت کے ساتھ“ اور وصف رسالت سے مراد عام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمائندگی و پیغام رسان اور واسطے بین اللہ و بین العباد ہے۔ یہ اس لیے کہ لفظ رسول فَعُول کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے جو مادہ ر، س، ل سے مشتق ہے۔ لسان قرآنی کی یہ خصوصیت ہے کہ مشتق کو سنتے ہی اُس کی نوعیت کے مطابق مشتق منہ بھی مفہوم ہو جاتا ہے جبکہ عجمی زبانوں میں اُمَتیوں کی زبان پر استعمال ہونے والے رسول بمنزلہ عِلْم ہے جو اسم خاص ہے اپنے مثنیٰ کے ساتھ جس کے بولنے اور استعمال کرنے والوں کا ذہن اُس کے مثنیٰ کے سوا کسی اور معنی و صنفی کی طرف متوجہ نہ ہونے کی طرح سننے والوں کا ذہن بھی اُس کے سوا کسی وصف کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتا گویا اُمَتیوں کی زبان پر استعمال ہونے والا یہ لفظ اسماء غالبہ کے حکم میں ہے۔ جیسے لفظ ”الْبُغْم، الصَّعْق“ عرف عام میں مخصوص اشخاص کے لیے نام اور بمنزلہ عِلْم ہونے کی وجہ سے ان کا استعمال مخصوص اشخاص کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہوتا۔ اُمَتیوں کی زبان پر استعمال ہونے والے لفظ رسول کا بھی یہی حال ہے کہ نبی اکرم رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کسی اور کے لیے نہ کوئی اسے استعمال کرتا ہے اور نہ سننے والے کا ذہن ذات نبوی ﷺ کے سوا کسی اور کی طرف جاسکتا ہے۔ یہ ایسا عام فہم مسئلہ ہے کہ درسی کتابوں تک لکھا ہوا موجود ہے۔ ایسے میں ضامراً مقدسہ جو ذات نبوی ﷺ کی طرف راجع ہوتے ہیں کی تعبیر و ترجمہ ”اے رسول“ کے ساتھ کرنا، اے محمد کہنے سے مختلف نہیں ہے جو تقاضائے ادب کے منافی اور آیت کریمہ ”لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرُّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا“ (النور، 63) کے خلاف ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تقریباً یہی حال ”اے نبی“ کہنے کا بھی ہے کیوں کہ لفظ ”نَبِيٌّ“ فَعِيل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے جو اشتقاق کے اعتبار سے خالی نہیں ہے ناقص واوی بھی ہو سکتا ہے جس کے مطابق اس کی اصل نَبُو ہوگا جو عظمت و رفعت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کے نبی کو بھی اس لیے نبی کہا جاتا ہے کہ وہ رفیع الشان اور عظیم المرتبت ہستی ہیں۔ جیسے مفردات امام الراغب الاصفہانی میں ہے؛

”وَسُمِّيَ نَبِيًّا لِرَفْعَةِ مَحَلِّهِ عَنْ سَائِرِ النَّاسِ“ (۱)

مہوز الام بھی ہو سکتا ہے جس کے مطابق اس کی اصل ”نَبَاء“ ہوگا جو لسان قرآنی کے ماہرین کے مطابق اُس خبر کو کہا جاتا ہے جو ایسے فائدے پر مشتمل ہو جس پر یقین یا کم از کم ظن غالب حاصل ہو سکتا ہو اگرچہ اس متقید کے ضمن میں مطلق خبر بھی پائی جاتی ہے جس میں اس کو استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ جیسے مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے؛

”النَّبَاءُ خَبَرٌ دُونَ نَذْرٍ عَظِيمَةٍ يَحْضُلُ بِهِ عِلْمٌ أَوْ غَلَبَةٌ ظَنٌّ وَلَا يُقَالُ لِلْخَبَرِ فِي الْأَصْلِ نَبَاءٌ حَتَّى يَتَضَمَّنَ هَذِهِ الْأَشْيَاءَ الثَّلَاثَةَ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”نَبَاء“ کسی بڑے فائدے والی خبر کو کہا جاتا ہے جس سے یقین حاصل ہو یا غالب گمان اور متن لغت میں کسی خبر کو اُس وقت تک ”نَبَاء“ نہیں کہا جاتا جب تک ان تینوں چیزوں پر مشتمل نہ ہو۔

شریعت مقدسہ کی زبان میں نبی کہلانے والی مقدس ہستی کو نبی کہنے اور اُس کا مسمیٰ باسم نَبی ہونے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُس کی بتائی ہوئی خبریں بھی عظیم فوائد پر مشتمل ہونے کے ساتھ علم الیقین کے بھی منید ہوتی ہیں۔ جیسے مفردات القرآن للراغب الاصفہانی میں ہے؛

”وَحَقُّ الْخَبَرِ الَّذِي يُقَالُ فِيهِ نَبَاءٌ أَنْ يَتَعَرَّى عَنِ الْكُذْبِ كَمَا التَّوَاتُرُ وَخَبَرَ اللَّهُ تَعَالَى وَخَبَرَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“

اس کے چند سطر بعد اس کی مزید مناسبت بتاتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَالنَّبِيُّ سَفَارَةٌ بَيْنَ اللَّهِ وَبَيْنَ دَوَى الْعُقُولِ مِنْ عِبَادِهِ لِلْإِزَاحَةِ عَلَيْهِمْ فِي أَمْرِ مَعَادِهِمْ وَمَعَاشِهِمْ وَالنَّبِيُّ لِكُونِهِ مُنْبِئًا بِمَا تَسْكُنُ إِلَيْهِ الْعُقُولُ الزَكِيَّةُ“

(۱) مفردات القرآن للراغب، ص 500۔

(۲) مفردات القرآن للراغب الاصفہانی، ص 499۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”نِسَاءً“ سے ماخوذ ”نِسْوَةٌ“ اللہ اور اُس کے عقل والے بندوں کے درمیان ربط ہے تاکہ دنیا و آخرت سے متعلق اُن کی روحانی بیماریوں کا ازالہ کیا جائے اور اس صورت میں سچ کو نبی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُن باتوں کی خبر دیتا ہے جن سے پاکیزہ نفوس کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

اشتقاق کے حوالہ سے لفظ نبی کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ناقص وادی ہونے کی صورت میں اس کے لغوی مفہوم رفیع الشان، عظیم القدر اور سب سے اعلیٰ کردار کی ہستی کے ہیں اور مہموز الہام ہونے کی صورت میں لوگوں کے عظیم مفاد کی یقینی خبریں بتانے والی ہستی کے ہیں اور یہ دونوں معنی نبی کے شرعی مفہوم میں موجود ہونے کے ساتھ شرعی نبی کی صفات میں بھی شمار ہیں کیوں کہ شریعت کی خاص زبان میں نبی ہر اُس مقدس انسان کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی اصلاح کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے جس پر وحی بھی نازل ہوتی ہے گویا صاحب وحی اور صاحب بعثت ہونا شرعی نبی کے لیے لازم ہونے کی طرح صاحب رفعت و عظمت ہونا اور انسانوں کے عظیم مفاد کی یقینی خبریں بتانا بھی اُس کو لازم ہیں یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وصف مبعوثیت اور صاحب وحی ہونے کی صفات کے ساتھ متصف ہوئے بغیر شرعی نبی کا وجود ناممکن ہونے کی طرح ہی عند اللہ صاحب رفعت و عظمت اور انسانوں کے عظیم مفاد میں یقینی خبریں بتانے کی صفات کے ساتھ متصف ہوئے بغیر بھی کسی کا برحق نبی ہونا ممکن نہیں ہے اور جملہ مسالک اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کا برحق نبی انسانوں کے عظیم مفاد میں جو یقینی خبریں بتاتا ہے وہ غیب کی خبریں ہوتی ہیں جو وحی کے ذریعہ انہیں بتائی جاتی ہیں۔ جیسے اللہ کے کسی بھی پیغمبر کی اپنی امت کو یہ تبلیغ کہ ”اطاعت اللہ و اطاعت الرسول“ کا انجام جنت ہے اور ”معصیت اللہ و معصیت الرسول“ کا انجام دوزخ ہے، ایمان کا لازمہ جنت ہے اور کفر کا لازمہ جہنم ہے، حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی کا اخروی ثمرہ روشنی و راحت ہے اور ان کی پامالی کی اخروی سزا تاریکی و تباہی ہے اس قسم تمام کی تمام پیغمبری تعلیمات و تبلیغات نبی اخبار ہیں کیوں کہ ایمان و جنت کے مابین لازم و

ملزوم ہونے کا جو ارتباط ہے اُس کا ادراک حواس کے ذریعہ سے ممکن ہے نہ عقل کے وسیلہ سے۔ اسی طرح اطاعت اللہ و اطاعت الرسول کا سبب جنت ہونا اور معصیت اللہ و معصیت الرسول کا سبب جہنم ہونا علیٰ ہذا القیاس مجازۃ اعمال کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر کی تبلیغ انسانوں کے عظیم مفاد میں اُن اخبار غیبیہ کے قبیل سے ہے جس پر یقین کرنا ایمان کے لیے ضروری ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن شریف کے اندر لفظ نبی کو دونوں مفہوموں میں ذکر کیا گیا ہے یعنی بعض جگہوں میں لغوی اور وصفی مفہوم میں جیسے ”الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ“ (الاعراف، 157) یہاں پر رسول کے بعد نبی جو ذکر ہوا ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ اس سے شرعی مفہوم مراد نہیں ہو سکتا کیوں کہ نبی اپنے شرعی مفہوم کے اعتبار سے رسول میں آچکا ہے اس لیے کہ نبی اور رسول کے مابین چاہے مساوات کی نسبت ہو یا عموم و خصوص مطلق کی بہر تقدیر رسالت میں نبوت کی موجودگی امر یقینی ہے جبکہ اس کے برعکس ہمیشہ نہیں ہوتا اور اس بات میں بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ یہاں پر رسول اپنے شرعی مفہوم میں ہی متعین ہے۔ جب لفظ نبی اپنے شرعی مفہوم کے اعتبار سے شرعی رسول میں آچکا تو پھر اس کے بعد مذکور ہونے سے مراد اُس کے لغوی اور وصفی مفہوم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی جس کے مطابق آیت کریمہ کے معنی یوں ہوتے ہیں ”وہ جو غلامی کریں گے اُس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس تورات و انجیل میں“ علم نحو کے ترکیبی انداز میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر لفظ ”الرَّسُولُ“ ذات اور موصوف ہے اور لفظ ”النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ“ بالترتیب اُس کی صفات متعددہ ہیں۔

یہی حال آیت کریمہ ”وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ مُؤَسَّسِينَ أَنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا“ (مریم، 51) میں اور آیت کریمہ ”وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ أَنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا“ (مریم، 54) جیسے متعدد مقامات کا بھی ہے کہ شرعی مفہوم میں رسول کے

ذکر ہو جانے کے بعد بطور صفت نبی کو ذکر کرنے سے مراد اُس کے لغوی اور وصفی مفہوم ہی متعین ہو جاتا ہے۔ جس وجہ سے نحوی ترکیب کے حوالہ سے بھی ان کو موصوف صفت سے تعبیر کی جاتی ہے جبکہ شرعی مفہوم میں نبی ہمیشہ اُس ذات انسانی سے عبارت ہوتا ہے جو بندوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث اور صاحب وحی ہو جبکہ لفظ نبی کا شرعی مفہوم میں استعمال ہونے کی مثالیں شمار سے بے شمار ہیں۔ قرآن شریف کے اندر درجنوں مقامات پر اس کی مثالیں موجود ہونے کے ساتھ انسانوں کے عرف میں بالخصوص نبی اکرم رحمت عالم ﷺ کے امتیوں کے مابین کلام میں جب بھی کوئی شخص لفظ رسول یا لفظ نبی کو ذکر کرتا ہے تو اُس سے مراد ہمیشہ شرعی مفہوم ہی ہوتا ہے۔ کوئی متکلم یا کوئی سامع و مخاطب اس سے لغوی اور وصفی مفہوم مراد نہیں لیتا اور کسی ایک کا ذہن بھی اُس کے وصفی مفہوم کی طرف نہیں جاتا۔ جیسے درس نظامی کی کتابوں پر عبور رکھنے والے حضرات سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

ان حقائق کے ہوتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف راجع ہونے والے ضمار کے ترجمہ و تعبیر میں ”اے پیغمبر، اے رسول، اے نبی“ کہنا، اے محمد کہنے سے مختلف نہیں ہے۔ ایسے میں امتیوں کی زبان سے اُردو زبان میں استعمال ہونے والے اس انداز کو قرآنی انداز استعمال ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ، يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ پر قیاس کرنے کا کوئی محل و مصرف ہی نہیں رہتا۔ جب اس قیاس کا مصرف نہیں ہے تو پھر مذکورہ اشتباہ بھی اشتباہ برائے اشتباہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

(فَلِلَّهِ الْحَمْدُ أَوَّلًا وَآخِرًا ظَاهِرًا وَبَاطِنًا)

☆☆☆☆☆

القتال المذهبي فساد لا جهاد

میرا سوال یہ ہے کہ جب شرعی جہاد کے جواز کے لیے اعلاء کلمۃ الحق کی نیت شرط ہے کہ جہاں پر مجاہد کی نیت اور اُس کا مقصد کلمۃ حق کا بول بالا کرنا ہو وہیں پر مسلح جہاد کرنے والا شخص اللہ کی راہ کا مجاہد کہلاتا ہے اور مخالف کے ہاتھ سے قتل ہونے کی صورت میں شہید سمجھا جاتا ہے تو پھر موجودہ دور میں شیعہ سنی اور دیوبندی بریلوی اختلافات کی بنا پر ان کے جو افراد یا مسلح تنظیمیں ایک دوسرے کو قتل کرتی ہیں اس کو اسلامی جہاد کیوں نہیں کہا جاتا حالانکہ وہ بھی اپنی نیت کے مطابق کفر کو یا باطل اور ظلم کو مٹانے اور کلمۃ حق کا بول بالا کرنے کی نیت سے ایسا کرتے ہیں مسلح جہاد کی شرط یہاں پر موجود ہونے کے باوجود اس تفریق کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ظاہری کافروں کے ساتھ اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر کیے جانے والے جہاد کو شرعی جہاد اور اُس کے اندر مرنے والوں کو شہید کہہ کر مذہبی مخالف کافروں یا خالموں کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر کیے جانے والے جہاد کو ناجائز قرار دینے کا کیا جواز ہے؟

نوٹ:- یہ سوال کسی نے مجھ سے پوچھا ہے اور جواب کا اُسے شدید انتظار ہے لہذا مہربانی کر کے قریبی اشاعت میں جواب دیا جائے۔ والسلام

السانل..... مولانا سمیع اللہ، لیکچرار ایگریکلچر انسٹیٹیوٹ، جمرود روڈ پشاور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہی اختلاف کی بنیاد پر کسی کو کافر سمجھ کر اُس کے خلاف اسلحہ اٹھانے والوں کے اس کردار کو جہاد فی سبیل اللہ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ جہاد فی سبیل اللہ ہونے کے لیے یہ بھی ناگزیر شرط ہے کہ جس کو قابل جہاد سمجھا جا رہا ہے یا جس کو کافر کہہ کر اُس کے خلاف اسلحہ اٹھایا جا رہا ہے وہ

حقیقت میں بھی ایسا ہی ہو ورنہ اسلحہ اٹھانے والوں کا یہ عمل شرعی جہاد ہرگز نہیں بلکہ جہالت یا مذہبی تعصب یا کسی اور گھناؤنے منصوبہ کا حصہ ہونے سے خالی نہیں ہوگا جو بھی ہو، بہر تقدیر مذہب کے نام پر آجکل جو قتل ہو رہے ہیں یا مذہبی اقتدار پر مسلط نااہلوں کے اکسانے پر ان کے زیر اثر نوجوان اپنے مذہبی مخالفین کو جو قتل کر رہے ہیں اس کو شرعی جہاد اور ایسا کرنے والوں کو غازی، مرنے والوں کو شہید اور اس عمل کو جہاد مشہور کر رہے ہیں اس کا شرعی جہاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ شرعی جہاد کا معیار کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں فقہی اختلاف ہو سکے، جو ایک فقہ میں جہاد کہلائے اور دوسرے فقہ میں فساد کہلائے یا کسی ایک اسلامی مذہب میں جائز اور دوسرے میں ناجائز سمجھا جائے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ شریعت مقدسہ کی زبان میں جس عمل کو جہاد کہا جاتا ہے اُس کے معیار و شرائط تمام اسلامی مذاہب میں متفقہ و یکساں ہیں کیوں کہ وہ قرآن و سنت کے واضح نصوص کے مدلول ہیں اور اسوۂ حسنہ سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے متواتر الثبوت منطوق ہیں، وہ تمام امت کے نزدیک اجماعی اور ناقابل اختلاف ہونے کی بناء پر محل اجتہاد ہی نہیں ہیں تو پھر اختلافی ہونے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فتنہ خوارج میں مبتلا اسلام کے نادان و ناتربیت دوستوں کے ماسوا دائرۃ اسلام میں جتنے بھی قابل اعتبار فقہی مسالک روز اول سے چلے آ رہے ہیں، چاہے اہل سنت کے نام سے ہو یا اہل اعتزال کے، اہلحدیث کے نام سے ہو یا اہل تشیع کے، چاہے اُن کے پیروکار دُنیا میں پھیلے ہوئے زندہ ہوں یا گمنام و مندرس اُن سب کے نزدیک جہاد کا شرعی مفہوم ایک ہے کہ ”اعلاء کلمۃ الحق کے لیے حقیقی ظالموں کے خلاف حتی المقدور جدوجہد کرنا“ اور اس مفہوم کے تحت آنے والے انواع و اقسام میں سے فرد اعلیٰ یعنی حقیقی ظالموں کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر حتی المقدور مسلح جدوجہد کرنے سے لے کر فرد ادنیٰ یعنی ظالم معاشرہ کی اصلاح کے سلسلہ میں اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر حتی المقدور زبانی و تبلیغی جدوجہد کرنے تک سب کا مراد الہی، برحق اور شرعی جہاد کے مظاہر و مصداق ہونے پر بھی سب متفق ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک فقہ میں شرعی جہاد کے اس مفہوم کو مسلح جہاد کے ساتھ مختص

قرار دے کر اُس کی دوسری قسموں کو ناجائز اور مراد الہی کے منافی سمجھا گیا ہو اور دوسرے فقہ میں اُس کو ظالم معاشرہ کی اصلاح کے ساتھ مختص قرار دے کر اُس کے ماسوا قسموں کو ناجائز اور مراد الہی کے منافی قرار دیا گیا ہو۔ جہاد کے شرعی مفہوم اور اُس کی تمام قسموں کا اپنے اپنے اوقات اور موسموں و حالات کے مطابق مراد الہی ہونے پر اجماع و اتفاق ہونے کی طرح ذرائع جہاد میں بھی مسالک کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح مقاصد اور مصارف جہاد میں بھی سب کا اتفاق و اجماع ہے کہ اعلاء کلمۃ الحق اور اُس کے تقاضے و مظاہر کے بغیر شرعی جہاد کا تصور اسلام میں نہیں ہے اور جس ظالم کے خلاف ایسا کیا جا رہا ہے وہ صرف جہاد کرنے والے کے گمان اور اُس کے زعم تک محدود نہ ہو بلکہ امر واقع بھی ہو۔

مصرف جہاد کا امر واقع ہونے کی پہچان و معیار:-

جس کی پہچان کے لیے معیار کسی فقیہ و مجتہد کی فکری کاوش نہیں بلکہ صرف اور صرف قرآن و سنت کے وہ نصوص ہیں جو اپنے ثبوت و دلالت دونوں کے حوالہ سے قطعی و یقینی ہیں۔ جیسے فرمان الہی:

”وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيُكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ“ (۱)

اور اُن سے لڑو جہاں تک کہ کوئی فساد باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

اس قسم درجنوں نصوص کے سننے اور پڑھنے والے کس شخص کو یقین نہیں ہوتا کہ لفظ ”قَاتِلُوهُمْ“ جہاد کے شرعی مفہوم پر قطعاً و یقیناً دلالت کرنے کی طرح اس کے منقول بہ یعنی لفظ ”هُمْ“ بھی حقیقی کفار و مشرکین پر قطعاً و یقیناً دلالت کر رہا ہے اسی طرح اس کے بعد والے کلام کے دونوں حصے یعنی معطوف و معطوف علیہ بھی بالترتیب فساد کے خاتمہ اور کلمۃ الحق کے بول بالا ہونے کا مقصد جہاد ہونے پر قطعاً و یقیناً دلالت کر رہے ہیں جس کے بعد مختلف مسالک والوں کو اس سے ہٹ کر کسی کو مصرف جہاد قرار دینے کی گنجائش نہیں رہتی ورنہ ہر مسلک کے اندر موجود اہل تعصب دوسرے مسالک والوں کو بزعم خویش مصرف جہاد قرار دے کر مسلم کشی کے جرم کا ارتکاب کریں گے جو بجائے خود فساد و فتنہ ہے جس کے اسناد کے لیے

قرآن و سنت کے اس قسم قطعی نصوص میں اللہ تعالیٰ نے خود شرعی جہاد کے مصرف کو متعین کر دیا کہ وہ کسی کے مروجہ کافر نہیں بلکہ حقیقی کافر ہیں، مروجہ ظالم و فسادی نہیں بلکہ حقیقی فسادی ہیں، اور مخالف مذہب والوں کی خواہش پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں شیطان و بدعت اور شرک ہیں۔ مصرف جہاد کا مروجہ نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ہونے پر اس قسم قطعی نصوص کی موجودگی میں سوالنامہ کے اندر مذکور مذہبی فرقوں کا ایک دوسرے کو کافر کہہ کر مصرف جہاد قرار دینا مسلم کشی کے جرم عظیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جو بالیقین مندرجہ ذیل سزاؤں کے زمرہ میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا“ (۱)

اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس پر لعنت کی اور اس کے لیے تیار رکھا بڑا عذاب۔

بزرگ خویش دوسرے مسالک کے مسلمانوں کو کافر کہہ کر ان کے قتل کرنے والے غلط کار اگر اس آیت کریمہ میں مسلم کشی کرنے والوں پر منجانب اللہ لگائے گئے ان سزاؤں پر غور کریں تو کبھی ایسا نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں قتل مسلم کے مجرموں کو ہمیشہ کے لیے جہنمی قرار دیا۔ جیسے ”فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا“ کے الفاظ بتا رہے ہیں صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد ”وَعَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ“ کے الفاظ میں ان مذہبی مجرموں کو اپنے قہر و غضب کے بھی مستحق قرار دیا کہ اس جرم کے بعد ان کی پوری زندگی اللہ کے قہر و غضب کی تپش میں گزرتی ہے کہ دل کی سختی اور غلبہ شقاوت کی وجہ سے ”وَيَمْلَأُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ“ کا نمونہ بن کر مقصد تخلیق کی طرف آنے سے محروم رہتے ہیں جس کا شعور بھی انہیں نہیں ہوتا۔ مذہب کے نام پر قتل کر نیوالے یہ مجرم اور جہاد کہہ کر مسلم کشی کرنے والے یہ فساد کار اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنے بڑے مجرم ہیں کہ گویا ایک مسلمان کا خون

بہانے کی شکل میں وہ تمام انسانوں کا خون کر رہے ہیں۔ جیسے فرمایا:

”مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا“ (۱)

ترجمہ: جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا۔

مذہب کے نام پر خونریزی کے اس جرم کے منحوس اثرات کے پیش نظر ان سیاہ کاروں کو صرف جہنمی اور مقہور و مغضوب قرار دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد ”لَعَنَهُ“ کہہ کر ہمیشہ کے لیے لعنتی بھی قرار دیا جو اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے شیطان کی طرح ہمیشہ محروم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان تینوں سزاؤں کی ہیبت اور ہولناکی کا ”وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا“ کے الفاظ میں اظہار فرمایا جو ان تینوں کے ناقابل تصور ہونے کے ساتھ سزا مطابق جرم ہونے کا اظہار ہے کیوں کہ ہر گناہ کی سزا اس کے حجم کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

”جَزَاءٌ وَفَاقًا“ یعنی جرم کے مطابق سزا۔ (۲)

یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مذہب کے نام پر مسلم کشی کرنے والے مجرم اپنے لیے مقررہ ان خدائی سزاؤں پر اگر غور کریں، قرآنی احکام سے روشنی لے یا کم از کم خود کو مسلمان کہلانے کے تقاضوں پر غور کریں تو دوسرے مسلک کے مسلمانوں کا خون کبھی نہیں کریں گے یا اصحاب محراب و منبر حضرات اگر یہ سزائیں پڑھ کر انہیں سنائیں تو کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو جہنمی بننا پسند کرے، اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کو گوارا کرے یا لعنتی قرار پانے کے موجب کوئی قدم اٹھائے۔ اس حوالہ سے علماء کرام پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کاش وہ اس کو فریضہ کو نبھائیں۔ دائرہ اسلام میں موجود کسی فرقہ کو کافر کہہ کر مصرف جہاد قرار دینا اور اس کا خون بہانا اس وجہ سے بھی موجب عذاب ہے کہ یہ بجائے خود جرم عظیم ہونے کے ساتھ دین اسلام میں تفرقہ بازی پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر کر کے

اسلام کو کمزور کرنے کا سبب ہے جس کی سزا حدیث نبوی ﷺ کے مطابق قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جیسے نسائی شریف کی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

”اَيُّمَارَ جُلِي خَرَجَ يَفْرَقُ بَيْنَ اُمَّتِي فَاصْرُبُوا عُنُقَهُ“ (۱)

جس شخص نے بھی میری امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی اُس کی گردن اُڑا دو۔

اس روایت سے یہی مفہوم ہو رہا ہے کہ فرقہ واریت پھیلانے والے کافروں کے برابر مجرم ہیں کیوں کہ اس کو قتل کا مستحق قرار دینے کا فلسفہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تفرقہ بازی کر کے اسلام کو کمزور کرنے کی بنا پر کافر کا ہم وصف وہم خیال ہو رہا ہے۔

مسلم کشی کرنے والوں کا خارج اسلام ہونا: مذہب کے نام پر مسلم کشی کرنے والے مجرموں کو اللہ کے رسول ﷺ نے اسلام سے خارج فرمایا ہے۔ جیسے:

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے:

”مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السَّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا“ (۲)

جس نے مسلم کشی کے لیے اسلحہ اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی روایت سے آیا ہے اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا:

”قِتَالُ الْمُسْلِمِ كُفْرٌ وَسَبَابُهُ فُسُوقٌ“ (۳)

مسلمان کو قتل کرنا کفر اور اُسے گالی دینا فسق ہے۔

حضرت جریر ابن عبداللہ الجعفیؓ کی روایت سے آیا ہے اللہ کے حبیب رحمت عالم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کے مابین اتحاد کی اہمیت اور ایک دوسرے کو مذہب کے نام پر قتل

(۱) نسائی شریف، ج ۲، ص ۱۶۵، باب المحاربة۔

(۲) نسائی شریف، ج ۲، ص ۱۷۳۔

(۳) نسائی شریف، ج ۲، ص ۱۷۴۔

کرنے کو کفر قرار دیتے ہوئے فرمایا:

”لَا الْفَيْنَ كُمْ بَعْدَ مَا رَأَى تَرْجِعُونَ بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ

بَعْضٍ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام پر تم کو متحد دیکھنے کے اس حال کے بعد تمہیں نہ دیکھوں کہ میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مار کر کافروں کی صفت پر لوٹ جاؤ۔

اہل انصاف جانتے ہیں کہ اس حدیث کا حقیقی مظہر اور یقینی مصداق مذہبی عصیت میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کے خلاف اسلحہ اٹھانے کو افضل جہاد قرار دینے والے کچھوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے کیوں کہ دنیوی معاملات کا اختلاف مختلف طبیعیات کے تقاضوں کے مطابق اُس وقت بھی تھا جو بعد میں بھی رہا اور موجودہ دور کے مسلمانوں میں بھی موجود ہے جس کو کبھی بھی موجب کفر قرار نہیں دیا گیا اسی طرح الہیات کے وہ حصے جن میں قرآن و سنت کے واضح اور یکطرفہ احکام نہیں پائے جاتے ہیں اُن میں بھی اختلاف رائے کا پایا جانا عین مقتضائے فطرت ہونے کی بناء پر روزا و ل سے چلا آ رہا ہے جس کو تاریخ کے ہر دور میں مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ ایسے میں اس حدیث کا حقیقی مظہر و یقینی مصداق مذہبی عصیت کے دہشت گردوں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔ ایسے مجرموں کو کفر سے پہچانے کے لیے ہزار جتن کئے جائیں پھر بھی سامعین کی تسلی کا سامان نہیں ہو سکتا۔

مذہب کے نام پر مسلم کشی کا سب سے بڑا گناہ ہونا:

حضرت عبداللہ ابن عمروؓ ابن العاصؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان کے قتل کو دینا بھر کے جرائم سے بڑھ کر جرم عظیم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَتْلُ مُؤْمِنٍ اَعْظَمُ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ زَوَالِ الدُّنْيَا“ (۱)

(۱) نسائی شریف، ج ۲، ص ۱۷۶۔

(۲) نسائی شریف، ج ۲، ص ۱۶۲۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس ذات کی مجھے قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی مومن مسلمان کو قتل کیا جانا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں پوری دنیا کے ویران ہونے سے زیادہ سبب خفگان ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے جس مسلم کشی کو سب سے بڑا گناہ اور دنیا بھر کی خرابی سے زیادہ مکروہ و سبب خفگان قرار دیا ہے اُس کی یقینی صورت مذہب کے نام پر کیے جانے والی مسلم کشی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی کیوں کہ قتل مومن کی دونوں وجوہی صورتیں ”رحم اور قصاص“ شرعی احکام ہونے کی بناء پر گناہ کے بجائے ثواب ہیں اور مرتد کا قتل درحقیقت قتل مومن ہی نہیں ہے ان تینوں کے علاوہ قتل مومن کی جتنی بھی صورتیں وجود میں آ رہی ہیں اُن سب میں دنیا کے رنگ میں رنگین انسی شیطانوں کا دخل ہوتا ہے جبکہ مذہبی قتل میں مذہبی عصیت کے رنگ میں رنگین مذہبی شیطانوں کا دخل ہوتا ہے اور فرمان نبوی ﷺ کے مطابق مذہبی شیطانوں کا جرم دنیا بھر کے شیطانوں کے اجتماعی جرم سے بھی متجاوز و بے انتہا ہوتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے:

”اَلَا اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ بِشَرِّ اَرْءِ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ“ (۱)

سنو بے شک سب سے بڑا شر علماء سؤ ہیں اور بے شک سب سے زیادہ خیر علماء حق ہیں۔

اپنی من پسند کے خلاف اسلامی فرقوں کا خون بہانے کو جہاد کہہ کر اللہ کے قہر و غضب کو دعوت دینے والے یہ حضرات چاہے خود کو سنی کہیں یا شیعہ، اہلحدیث کہلائے یا اہل تقلید اور دُنیا انہیں خفی کہہ کر پکارے یا شافعی کہہ کر بہر حال حقیقت میں وہ کسی بھی اسلامی مذہب کے ساتھ وفادار نہیں ہیں کیوں کہ اسلامی فرقوں میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں مسلم کشی کو جہاد کا نام دینے کی اجازت ہو یا فقہی اختلاف کی بنیاد پر کسی کو قتل کرنے کی گنجائش ہو۔ اسلام کے اندر موجود فقہی مسالک کا مطالعہ رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ مسلم کشی جیسے جرم عظیم کو جہاد کہنے والے ان فساد کاروں کو کوئی ایک فقہ بھی

(۱) مشکوٰۃ شریف، ص 37، کتاب العلم بحوالہ الدارمی۔

قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، تو اسلام انہیں کیوں قبول کرے۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو سنن نسائی میں حضرت عبداللہ ابن عمر و ابن عباس ص سے مروی حدیث کے واقعی مصداق بھی یہی علماء سؤ ہیں جس میں مومن مسلمان کے خون بہانے والوں کو پوری دنیا کو خراب کرنے والوں سے بھی زیادہ مجرم قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ قرآن و سنت کے وہ نصوص جن میں بیضۃ الاسلام کے استحکام اور اتحاد اُمت کے لیے کام کرنے والے علماء دین کو علماء حق اور اس کے منافی کردار کے حامل علماء علماء سؤ کہا گیا ہے اُن پر غور کرنے سے جہاد کے نام پر مسلم کشی کرنے والے علماء سؤ کا دُنیا بھر کے مجرموں سے بڑھ کر مجرم ہونا ثابت ہو رہا ہے تو پھر ان کا یہ جرم خدا کے نزدیک پوری دنیا کو ویرانے میں تبدیل کرنے سے زیادہ کیوں نہ ہو۔

مسلم کش دہشت گردوں کا مباح الدم ہونا:-

اللہ کے رسول ﷺ نے مذہب کے نام پر مسلم کشی کی دہشت گردی پھیلانے والوں کو مباح الدم قرار دیا ہے۔ جیسے حضرت عبداللہ ابن زبیر ص کی روایت سے مروی ہے:

”قَالَ مَنْ شَهَرَ سَيْفَهُ ثُمَّ وَضَعَهُ فْدَمُهُ هَذَرٌ“ جبکہ دوسری روایت میں ”مَنْ رَفَعَ السِّلَاحَ ثُمَّ وَضَعَهُ فْدَمُهُ هَذَرٌ“ کے الفاظ آئے ہیں۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے بھی اسلحہ اٹھا کر لوگوں کا خون کیا اور دہشت پھیلائی تو اُس کا اپنا خون ضائع ہے کہ جس کے ہاتھ سے بھی مارا جائے اُس کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ (۱)

اس کے یقینی مظاہر میں درج ذیل مجرم مراد ہو سکتے ہیں:

مذہبی دہشت گرد یعنی مذہب کے نام پر دوسرے مسالک کے مسلمانوں کو قتل کرنے والا۔

مسلم مملکت کے اندر ہزنی کرنے والا۔

نظام مصطفیٰ ﷺ کی اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت کرنے والا۔

(۱) سنن نسائی، ج 2، ص 173۔

اسلحہ کے زور سے اسلامی ریاست کے باسیوں کی جان و مال، عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے والا۔

اہل انصاف جانتے ہیں ان سب میں مباح الدم قرار دینے کے زیادہ سے زیادہ اور شدید سے شدید تر مستحق مذہبی دہشت گرد ہے کیوں کہ اُس کا ضرر ان سب سے زیادہ اور متعدی ہونے کے علاوہ وہ اپنے اس جرم عظیم کو جہاد کا نام دے کر سادہ لوح مسلمانوں کا ایمان بھی خراب کر رہا ہے، التباس الحق بالباطل بھی کر رہا ہے، بیضۃ الاسلام کو کمزور کر رہا ہے اور اسلامی جہاد کے مقدس نام کو بدنام کر کے اسلام دشمن طاقتوں کو دین محمدی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا سامان فراہم کر رہا ہے ان میں سے ہر ایک جرم انفرادی طور پر بھی دوسرے مجرموں کی طرح مباح الدم ہونے کا سبب ہے جبکہ مذہبی دہشت گرد میں بیک وقت سب پائے جانے کی بنیاد پر وہ دوسرے مجرموں سے کئی گنا زیادہ سزاوار قرار پا رہا ہے کہ جس کے ہاتھوں بھی قتل ہو جائے اُس کا خون ضائع سمجھا جائے۔ اس حدیث کا ایک مفاد یہ بھی ہے کہ اسلام نے جن دہشت گردوں کو مباح الدم قرار دیا ہے اُن کی فہرست میں مذہبی دہشت گرد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ قابل مذمت ہیں۔

مسلم کشی کے درپے رہنے والوں کا جہنمی ہونا:-

اپنے مذہبی حریفوں کو بزم خویش کا فزکہہ کر اُنکے خلاف اسلحہ اٹھانے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے جہنمی قرار دیا ہے۔ جیسے حضرت ابی بکر ص کی روایت سے مروی ہے:

”إِذَا أَشَارَ الْمُسْلِمُ عَلَى أَخِيهِ الْمُسْلِمِ بِالسَّلَاحِ فَهُمَا عَلَى جُرْفٍ جَهَنَّمَ فَإِذَا قَتَلَهُ خَرَجَا جَمِيعًا فِيهَا“ (۱)

جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی پر اسلحہ نکالنے کے درپے ہوتا ہے تو وہ دونوں جہنم کے کنارے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور جب ایک نے دوسرے کو قتل کیا تو دونوں اکٹھے جہنم میں

(۱) سنن نسائی، ج ۲، ص ۱۷۵۔

گئے۔

اس حدیث کی طویل مظاہر فہرست میں مذہبی قاتل و مقتول سرفہرست ہیں کیوں کہ اُن کا یہ جرم دوسروں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ سخت و قابل مذمت ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن و سنت کے ان احکام کو اگر عام کیا جائے، مذہبی اقتدار پر فائز طبقہ محراب و منبر کے ذریعہ ان کی روشنی کو اگر پھیلانے تو مسلم کشی کے اس خطرناک رجحان کا بآسانی انسداد ہو سکتا ہے، یہ اس لیے کہ جہنم سے ہر شخص پناہ مانگتا ہے جب قتل مسلم کی یقینی سزا جہنم ہونے کا سبق انہیں یاد کرایا جائے گا تو وہ کبھی ایسا اقدام نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اصحاب محراب و منبر کو یہ فریضہ نبھانے کی توفیق دے تو اس حوالہ سے سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے ورنہ مسلم کشی کے منحوس اثرات سے معاشرہ کا کوئی ایک فرد نہیں بچ سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس فتنہ و فساد سے بچنے کا سامان کرو جو پھیلے گا تو صرف ظالموں تک محدود نہیں رہے گا۔

مذکورہ حدیث سے مسلمانوں کے خون بہانے کے درپے رہنے والے قاتل و مقتول کا جہنمی ہونا معلوم ہونے کی طرح اس آیت کریمہ سے تعصب زدہ معاشرہ کے جملہ افراد کا اس کے مٹوم اثرات سے متاثر ہونا معلوم ہو رہا ہے۔ جہاں تک قاتل و مقتول کے جہنمی ہونے کا مسئلہ ہے اُس کا تعلق عالم غیب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ایمان بالغیب کے درجہ میں اُس پر صرف یقین کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے معصوم پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے اور اللہ کے معصوم پیغمبر کا ہر فرمودہ یقینی ہوتا ہے۔ لہذا اس پر بھی تمام اہل ایمان کو یقین ہے جبکہ مذہبی تعصب کے متاثرہ معاشرہ کا مسئلہ اس کے برعکس ہے کیوں کہ انسانی معاشرہ کا ہر فرد عملی طور پر اس کو محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ ایسے قابل رحم معاشرہ کا کوئی فرد، کوئی گھر

(۱) الانفال، ۲۵۔

اور کوئی محلہ افتراق بین المسلمین کے منحوس اثرات سے محفوظ نہیں ہوتا، بھائی اپنے بھائی سے، ہمسایہ اپنے ہمسایہ سے بدگمان و بے اعتماد ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک محلہ کی مسجد میں اور ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے ہیں، مذہبی تعصب کی اسی منحوس روش کے مشہوم نتیجہ میں متعدد ایسے واقعات کا تجربہ ہوا ہے کہ ایک مسجد کے بیچ میں دیوار کھینچ کر تقسیم کر دی گئی ہے اور کتنے امامان مساجد کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اور ایک دوسرے کی مسجدوں کو مسجد ضرار کے نام سے مشہور کیا گیا ہے اور کتنے دین دار شرفاء ہیں جو مذہبی دہشت گردوں کے خوف سے مسجدوں میں جانے سے ہی کتراتے ہیں، اور کتنے غیر ملکی مہمان، تاجار و سیاح ایسے ہیں جو ایسے معاشروں میں جانے سے ڈرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ملکی معیشت سے لے کر قومی و مذہبی وقار بھی مجرم ہو جاتا ہے اور معصوم مذہب اسلام کی بین الاقوامی برادری میں جگہ ہنسائی ہوتی ہے۔

مذہبی عصبیت کی موت کا جاہلیت کی موت ہونا:-

مذہبی عصبیت و فرقہ داریت کی بنیاد پر اپنے مذہبی حریفوں کو بزم خویش کا فرکہہ کر انہیں قتل کرنے کو اسلامی جہاد مشہور کر کے دین اسلام میں اشتباہ پیدا کرنے والوں کی اصلاح کے لیے قرآن و سنت میں کافی سے زیادہ سبق موجود ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَلَا يَجْرِمُكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی“ (۱)

کسی قوم کی مخالفت تمہیں عدل کے خلاف کرنے پر نہ ابھارے۔ عدل کرو وہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

اہل انصاف جانتے ہیں کہ فقہی اختلاف کو اصول کا درجہ دے کر حریف مذہبی فرقوں کو کافر کہنا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی گھلی خلاف ورزی ہے اس پر مستزاد یہ کہ اس مرض میں جو مبتلا ہیں وہ اس گناہ کو جہاد سمجھ کر ایسا کرتے ہیں جس کو جہل بالائے جہل اور ”ظَلَمْتُ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ“ (النور، 40) کہا جائے تو

بے محل نہ ہوگا۔ قرآن شریف میں اس آیت کریمہ کو پڑھنے اور سمجھنے کے باوجود عملی انحراف کا فلسفہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ مذہبی تعصب کے حصار میں محصور ہو چکے ہیں، اللہ کے وسیع دین اسلام کو اپنی فہم کے تابع سمجھ کر محدود کر چکے ہیں اور تعصب کے اندھیرے میں اندھے ہو چکے ہیں جس وجہ سے اصول اسلام اور مذہب کے فروغی مسائل میں تفریق کرنے کی توفیق سے محروم ہو چکے ہیں جس کے نتیجہ میں فقہی اختلاف کی بنیاد پر حریف فرقوں پر اسلحہ اٹھانے کے جرم انہیں کا رثواب و جہاد نظر آ رہا ہے جبکہ اس میں مرنے اور مارنے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے جہالت کی موت قرار دیا ہے۔ جیسے صحابی رسول حضرت جندب ابن عبد اللہ کی روایت سے آیا ہے:

”قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَاتِلَ تَحْتَ رَايَةٍ عَمِيَّةٍ يَذْعُو اِلَى عَصَبِيَّةٍ اَوْ يَغْضَبُ لِعَصَبِيَّةٍ فَقَتَلْتَهُ جَاهِلِيَّةٌ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے جہالت کے جھنڈے کے تحت لڑائی کی کہ اس کا لڑنا تعصب کے لیے ہے اور اس کا غصہ کرنا بھی عصبیت کے لیے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

یہ حدیث اپنے الفاظ کے عموم کی وجہ سے ہر جہالت پر مبنی عصبیت کے لیے لڑنے والوں کی موت کو جاہلیت کی موت قرار دے رہی ہے جس میں تخصیص کی گنجائش ہی نہیں ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ قومی عصبیت لسانی عصبیت اور وطنی عصبیت کی جہالت سے مذہبی عصبیت کی جہالت ہر اعتبار سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیوں کہ اس کے اثرات لامحدود ہونے کے ساتھ التباس الحق بالباطل کے بھی موجب ہوتے ہیں، اسلام کی بدنامی کا سامان ہوتے ہیں اور امت کی تفریق کا سبب ہوتے ہیں جب قلیل الشر عصبیت کی موت جاہلیت کی موت قرار پارہی ہے تو مذہبی جہالت پر مبنی عصبیت کی موت بدرجہ اولیٰ موت جاہلیت ہوگی جس سے امت کو بچانے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ قرآن و سنت کے ان احکام کو عام کیا جائے۔ منبر و محراب کو افتراق کے بجائے اتحاد امت کی تعلیم گاہ بنایا جائے اور دوسرے

فقہی مسالک کو بھی اسلام کا احترام دیا جائے جس کے لیے ضروری ہے کہ علماء حق کو آگے آنا ہوگا اور دین فروش علماء سو کو مسترد کرنا ہوگا تاکہ جہاد کے مقدس نام کو بدنام کرنے والے گمراہوں سے چھٹکارا حاصل ہو۔

﴿ہر کافر مسلح جہاد کا مصرف نہیں ہوتا﴾

جہاد کے نام سے فقہی اختلاف والے مسلمانوں کے خون بہانے کا اسلامی جہاد ہونا بہت دور کی بات ہے جبکہ اسلام میں ہر کافر بھی مسلح جہاد کا مصرف نہیں ہوتا کیوں کہ قرآن و سنت کی روشنی میں صرف وہی کافر و مشرک مسلح جہاد کے مصرف قرار پاتے ہیں جو مسلمانوں پر حملہ کریں، انہیں ستائیں، اُن کے املاک پر قبضہ کریں اور مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی اصلاحی کوششوں اور تبلیغی جہاد سے اثر نہ لیں (یا) حدود اللہ کے نفاذ اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بنے اور کسی بھی غیر مسلح جہادی کوششوں سے اثر لے کر باز نہ آجائے (یا) نظام مصطفیٰ ﷺ پر مشتمل اسلامی ریاست کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ سازش کر رہے ہوں۔ جیسے بالترتیب قرآن شریف کی مندرجہ ذیل آیات سے مفہوم ہو رہا ہے؛

”أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا“ (۱)

”وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ“ (۲)

”فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ لَا إِنَّهُمْ لَا إِيمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ“ (۳)

قرآن و سنت اور اسوہ حسنہ سید الانام ﷺ کی روشنی میں اسلام کے سخت سے سخت مخالف کافر و مشرک کے خلاف بھی اُس وقت تک اسلحہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے جب تک مسلم ریاست کی طرف سے اُس کو شرارت سے باز رکھنے کے لیے جملہ اصلاحی کوششیں ناکام نہیں ہوتیں، تبلیغی اور سیاسی راہیں مسدود نہیں ہوتیں کیوں کہ کسی بھی مخالف اسلام پر اسلحہ اٹھانے کا حکم آخری آپشن ہے جس پر اُس وقت

(۱) الحج، ۳۹۔

(۲) النساء، ۹۱۔

(۳) التوبہ، ۱۲۔

عمل کیا جانا ممکن ہے جب اس سے بچنے کی کوئی اور راہ نہ ہو۔ فردی اور فقہی اختلاف کی بناء پر کسی مسلمان کے خلاف اسلحہ اٹھانے کا تصور دور کی بات ہے بلکہ اسلام نے تو اسلامی ریاست کے اندر رہنے والے غیر مسلم اقلیت کے خلاف اسلحہ اٹھانے کو بھی ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے؛

”وَمَنْ عُبِدَ يَقْتُلْ نَفْسًا مَعَاهَذَةً الْأَحْرَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةُ“ (۱)

یعنی غیر مسلم اقلیت کو قتل کرنے والا جہنمی ہے۔

مقام عبرت ہے کہ جب اسلام نے اپنی رعایا کی جان و مال اور عزت و ناموس کے تحفظ کا اس حد تک اہتمام کیا ہے کہ کسی غیر مسلم اقلیت کے خلاف اسلحہ اٹھانے والے کو بھی معاف نہیں کرتا تو پھر اپنی ہی کسی شاخ کے خلاف اس کی اجازت کیوں دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فقہی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کو واجب القتل قرار دینے اور انہیں مصرف جہاد کہنے والے جہل مرکب یا اسلام کے خلاف کسی گھناؤنی سازش کے خطرہ سے خالی نہیں ہیں۔ ایسے میں اُن کے اس کردار کو اسلامی جہاد کہنے کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو لوگ اس کے اسلامی جہاد ہونے کا گمان کرتے ہیں وہ شدید غلطی اور جہالت میں مبتلا ہیں علماء حق پر لازم ہے کہ محراب و منبر کے ذریعہ انہیں تبلیغ کر کے سمجھائیں، جہالت کی اس وادی لائتمانی سے انہیں نکالیں اور جہاد کے نام پر اسلام کے ہی خلاف کی جانے والی اس پراسرار سازش سے پردہ اٹھائیں ورنہ خاموش تماشا شای بنے رہنے والے گونگے شیطان سے مختلف نہیں ہوں گے۔ والسلام

الْعَبْدُ الضَّعِيفُ

پیر محمد چشتی

☆☆☆☆☆

(۱) المستدرک للحاکم، ج ۲، ص ۱۲۶۔

تحويل قبلہ سے متعلق آیات کی تفسیر

میرا سوال یہ ہے کہ تحويل قبلہ سے متعلق سورة البقرہ، آیت نمبر 144 تا آیت نمبر 150 مسجد الحرام شریف کی طرف منہ کرنے کا تکرار کے ساتھ جو حکم آیا ہے بظاہر کثرت تکرار ہی جو فصاحت کے منافی ہوتی ہے جس سے بچنے کے لیے مفسرین کرام نے ہر حصہ کا جدا جدا مصرف بتائے ہیں لیکن تسلی نہیں ہوتی، ایک غلطیان پھر بھی محسوس ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے قبل آیت نمبر 115 کے حکم سے ہر حالت میں مسجد الحرام کو قبلہ بنانے کی اس تاکید کے برعکس معلوم ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَاِنَّهُ وَجْهُ اللّٰهِ“ (البقرہ، 115)

یعنی مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو اُدھر وجہ اللہ خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے۔

اس عمومی حکم کا تقاضا یہی ہے کہ مسجد الحرام شریف کے ساتھ تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جائز ہے خلاصہ اشکال یہ کہ نمبر 144 تا نمبر 150 کے اندر بار بار تاکید در تاکید کے ساتھ مسجد الحرام کو ہی قبلہ بنانے کا جو حکم دیا گیا ہے یہ کسی اور سمت کی طرف منہ کرنے کے عدم جواز کا مقتضی ہے جبکہ آیت نمبر 115 کا عموم ہر سمت کے جواز کا مقتضی ہے جو واضح تعارض و تقاض ہے اور یہ بھی ہے کہ یہاں پر ان دونوں کے نازل ہونے کے جدا جدا اوقات بھی معلوم نہیں ہے کہ ناسخ و منسوخ کا راستہ اختیار کیا جائے اور اجمال بھی نہیں کہ دوسرے کو پہلے کی تفصیل ہونے کی بناء پر تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ مہربانی کر کے آواز حق میں اس کا حل شائع کیا جائے۔

السانل، قاری محمد انور بیگ امجدی خطیب جامع مسجد سنہری پشاو صدر، 13 اگست 2009ء

اس کا جواب یہ ہے ان دونوں حکموں کی جہت اور حیثیت ایک نہیں ہے جبکہ تقاض و تعارض کے لیے جہت کا ایک ہونا شرط ہے جبکہ جہت دونوں کی ایک نہیں ہے تو پھر تقاض کا بھی تصور نہ ہونا چاہئے اور جہت دونوں کی اس لیے ایک نہیں ہے کہ جو حکم آیات نمبر 144 تا 150 سے معلوم ہو رہا ہے وہ عام حالات پر محمول ہے کہ حالت سفر میں ہو یا حالت حضر میں اور جس جگہ، جس سمت اور جس ماحول سے بھی نماز میں آنا ہو ہر حال میں منہ مسجد حرام کی طرف کرنا ہی لازم ہے کہ اُس کے سوا کسی دوسری سمت کی طرف منہ کرنا جائز نہیں ہے جبکہ آیت نمبر 115 کے عمومی حکم کا تعلق مخصوص حالات کے ساتھ ہے، اس اجمال کی تفصیل دو طرح سے ہے:

پہلا پہلو:- آیت نمبر 115 سے مقصد نزول عموم جہات کو قبلہ مقرر کرنا نہیں بلکہ اہل کتاب کی سرزنش کرنا ہے کیوں کہ زمانہ نزول قرآن میں حجاز مقدس کے رہنے والے اہل کتاب بالخصوص مدینہ منورہ اور اُس کی سمت میں آباد یہود و نصاریٰ قبلہ کے حوالہ سے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے کہ بیت المقدس مدینہ منورہ سے جانب مغرب کی طرف واقع ہونے کی بناء پر اسرائیل کا طبقہ یہود جانب مشرق کی طرف قبلہ جائز ہونے کو ممکن ہی نہیں جانتے تھے جبکہ طبقہ نصاریٰ ان کے مقابلہ میں جانب مشرق کے بیت اللحم کو بزعم خویش قبلہ بنا کر جانب مغرب کے خلاف منفی پروپیگنڈا کرنے میں زمین و آسمان کی قلابیں ملایا کرتے تھے اور تورات و انجیل کے پیروکار کہلانے اور آسمانی مذہب کے دعویدار ہونے کی وجہ سے دوسرے قبائل و اقوام کو حقیقی قبلہ کا ان دونوں سے متجاوز نہ ہونے کا مغالطہ ہو رہا تھا جس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں طبقوں کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ ”کہ مشرق و مغرب یعنی پوری روئے زمین صرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق، اُس کی ملک اور اُس کی زیر تصرف ہیں اگر کسی سمت کا وجود ہے تو اُسی وحدہ لا شریک کی مخلوق و ملک ہونے کی حیثیت سے ہے جس کے بغیر سب بیچ ہیں قبلہ کی حیثیت سے معظم ہونا اُن میں سے کسی کی بھی اپنی ذات کا مقتضا نہیں ہے بلکہ وہ جس کو قبلہ قرار دے وہی قابل تعظیم اور شرف و معظم اور

اُس کی مقرر کردہ جس سمت کی طرف بھی منہ کرو گے ادھر اُس کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہوگی، گویا ”وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ“ (البقرہ، 115) میں ایک طرف یہودیوں کی سرزنش کی جارہی ہے کہ بیت المقدس کو قبلہ ماننا تمہارا اللہ کا حکم جان کر نہیں بلکہ مذہبی عصبیت کی وجہ سے ہے جبکہ قبلہ کی طرف منہ کرنا رحمت الہی کا موجب تب بن سکتا ہے کہ جب صرف اور صرف اللہ کا حکم جان کر ایسا کیا جائے جو یہودیوں کے مزاج سے بعید تھا اس لیے کہ اپنے دنیوی مفادات اور خواہش نفس کے منافی جان کر انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قتل کرنے والے یہودیوں سے اس کی توقع ہی ممکن نہیں تھی۔ دوسری طرف نصاریٰ کی بھی توجیہ کی جارہی ہے کہ بیت اللحم اور جانب مشرق کو قبلہ بنانا تمہارا خدائی حکم پر مبنی نہیں ہے بلکہ مذہبی حریفوں کے مقابلہ میں تعصب کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے رحمت خداوندی کا موجب نہیں بن سکتا۔

الغرض اس آیت کریمہ کی عبارتہ النص میں قبلہ کے حوالہ سے شرعی حکم پایا ہی نہیں جاتا کیوں کہ اس کے نزول سے مقصد یہود و نصاریٰ کی سرزنش و توجیہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جیسے سیاق و سباق اور اس سے متصل قبل اہل کتاب کی باہمی تعصب کاری اور مذہبی جھگڑ بندیوں کا ذکر اس پر قوی قرینہ و شاہد ہے ہاں البتہ دلالتہ النص کے طور پر عموم جہات کے جواز کا جو حکم پایا جاتا ہے اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن وہ اس پوزیشن میں ہرگز نہیں ہے کہ عبارتہ النص پر ترجیح پائے کیوں کہ لغت کا مسئلہ اصول ہے کہ ”عِبَارَةُ النَّصِّ فَوْقَ دَلَالَةِ النَّصِّ“ یعنی عبارتہ النص کو دلالتہ النص پر فوقیت ہوتی ہے جس کو پیش نظر رکھ کر علماء اصول نے بیک آواز دلالتہ النص کو عبارتہ النص کے مقابلہ میں ناقابل عمل قرار دیا ہے۔ اس التوضیح میں ہے؛

”وَالثَّابِتُ بِدَلَالَةِ النَّصِّ كَمَا لَثَابَتْ بِالْعِبَارَةِ وَالْإِشَارَةِ الْأَعْيُنُ الدَّلَالَةُ“

اس کی شرح التلویح میں کہا ہے؛

”فَلِإِنَّ الثَّابِتَ بِالْعِبَارَةِ أَوْ الْإِشَارَةِ يَقْدُمُ عَلَى الثَّابِتِ بِالدَّلَالَةِ لِأَنَّ فِيهِمَا النِّظْمَ“

وَالْمَعْنَى اللَّغَوِيُّ وَفِي الدَّلَالَةِ الْمَعْنَى فَقَطُّ فَبَقِيَ النِّظْمُ سَالِمًا عَنِ الْمَعَارِضِ“ اہل علم جانتے ہیں کہ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 144 تا 150 سے ثابت ہونے والا حکم عبارتہ النص کے سوا اور کچھ نہیں ہے ایسے میں مذکورہ اشکال کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ یہ ہوا تفصیلی جواب کا پہلا پہلو۔

دوسرا پہلو:- آیت نمبر 115 سے دلالتہ النص کے طور پر ہر سمت کا بطور قبلہ جائز ہونے کا حکم حالت خوف کے ساتھ خاص ہے جس کی ممکنہ مثالیں فقہاء کرام کی روشنی میں یوں ہو سکتی ہیں کہ؛ پہلی مثال:- مریض کو ڈاکٹر نے قبلہ کے بغیر دوسری سمت پر کھڑا کر کے یا لیٹا کر یا بیٹھا کر تاکید کی ہوئی ہے کہ فلاں وقت تک اسی حالت میں رہو ورنہ اگر دوسری سمت کی طرف حرکت کی تو مر جائے گا یا مرض تیرا اور بھی بگڑ جائے گا اس دوران نماز کا وقت ہو تو ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اُسی سمت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنی اُس پر لازم ہے چاہے مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب، فوق ہو یا تحت، گویا ایسے شخص کے لیے آیت کریمہ کی تفسیر یوں ہوگی؛

”أَيْنَمَا تُوَلُّوْا أَحْسَبُ الْأَسْطِطَاعَتِ فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ“

یعنی جدھر منہ کرنے کی استطاعت ہو ادھر کرو اللہ کی رحمت ادھر تمہاری طرف متوجہ ہے۔ دوسری مثال:- کوئی جابر و ظالم کسی مسلمان کو خلاف قبلہ رخ کھڑا کر کے یا لیٹا کر یا بیٹھا کر کہتا ہے کہ جو بھی حرکت کرنی ہے اسی رخ کرو ورنہ قبلہ رخ ہونے پر جان سے مار دوں گا یا غصو کاٹ دوں گا یا عزت و آبرو کو نقصان پہنچاؤں گا۔ اس دوران نماز کا وقت ہو تو نماز کی فوتگی سے بہتر بلکہ ضروری فریضہ ہے کہ حسب استطاعت ظالم کے کہنے کے مطابق خلاف قبلہ سمت منہ کر کے نماز پڑھے اس کے لیے بھی آیت کریمہ کی وہی تفسیر ہے جو پہلی مثال میں بیان ہوئی ہے۔

تیسری مثال:- کسی ظالم و جابر سے یا کسی بھی دشمن سے فرار ہو کر ایسی جگہ میں جا کر چھپ کر بیٹھا ہے یا لیٹا ہے کہ رخ اگر قبلہ کی طرف کرتا ہے تو دشمن دیکھ لیتا ہے تو اس کے خوف کی وجہ

سے خلاف قبلہ رخ نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کے حق میں بھی آیت کریمہ کی وہی تفسیر ہوگی جو گزر چکی ہے۔

چوتھی مثال:- کسی مہلک درندہ کے خوف سے اگر کسی جگہ میں چھپ کر بیٹھا یا لیٹا ہوا ہے نماز کا وقت جا رہا ہے اُس جگہ کی نوعیت یا حالات کے تقاضے ایسے ہیں کہ اگر قبلہ رخ ہوتا ہے تو اُس کے دیکھنے کا غالب گمان آ جاتا ہے تو خلاف رخ قبلہ پڑھ سکتا ہے۔ اس صورت کے لیے بھی آیت کریمہ کی مذکورہ تفسیر میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

پانچویں مثال:- سمندری جہاز میں دھماکہ ہونے سے اُس کے حصے بخرے ہو گئے جس کی ایک لکڑی یا تختی پر بیٹھ کر نجات کی تلاش میں تلاطم امواج کے رحم و کرم پر جا رہا ہے نماز کا وقت ہو گیا اُسے غالب گمان ہے کہ اگر قبلہ رخ ہو جاتا ہوں تو غرق ہو جاتا ہوں تو جدھر بھی منہ کر کے نماز پڑھے گا وہی اُس کا قبلہ ہے اور ادھر سے اللہ کی رحمت اس پر متوجہ ہے۔ اس صورت کے لیے بھی آیت کریمہ کی وہی تفسیر ہوگی جو گزر چکی ہے۔

ان کے علاوہ حالت جنگ کی مخصوص حالات میں اور بالخصوص مسلم سرحدات کی اور دشمن لشکر کی خفیہ خبر گیری کرنے کی بعض ناگزیر اور جان گسل حالات میں بھی مسلمانوں کو ایسے حالات کے ساتھ دوچار ہونا پڑتا ہے جن میں اس آیت کریمہ کی دلالت النص سے ثابت ہونے والے حکم پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے فقہاء اسلام کو کہ انہوں نے آیت کریمہ سے دلالت النص کے طور پر ثابت ہونے والے اس حکم کو زندگی میں پیش آنے والے اس قسم کٹھن حالات پر جاری کر کے مشکل سے مشکل حالات میں بھی انسانوں کی رہنمائی کی ہے، قرآن شریف کی روشنی پھیلانی ہے اور قرآن و سنت کے ایک ایک لفظ کا مفاد بتایا ہے۔ (فَجَزَاهُمْ اللَّهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ)

اس سلسلہ کی ایک درخشندہ مثال امام الفقہاء برہان الدین المرغینانی المتوفی 395ھ کا یہ مختصر جملہ ہے جو

ہدایہ کے اندر فرمایا ہے:

”وَمَنْ كَانَ خَائِفًا يَصَلِّيْ إِلَىٰ آيَةٍ جِهَةً قَدَرًا لِّتَحَقِّقَ الْعُدْرَ“ (۱)

اہل علم جانتے ہیں کہ مشتے نمونہ ازخروارے مذکورہ چند مثالوں کی طرح درجنوں ممکنہ صورتوں کو شامل ہو نیوالے اس ایک جملہ میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ درحقیقت ہدایہ کا یہ جملہ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 115 کی عملی تفسیر ہے، جس کی اہمیت کو سمجھنے والے مذکورہ اشکال کے خلیان میں کبھی مبتلا نہیں ہو سکتے۔

خلاصۃ الجواب بعد التحقیق:-

تحويل قبلہ سے متعلق آیات نمبر 144 تا 150 کا تعلق مسجد الحرام شریف کی قبلہ کے طور پر عام حالات میں پابندی کرنے کے ساتھ ہے کہ حالتِ حضر میں ہو یا حالتِ سفر میں اور جس جگہ ہو جس سمت سے بھی نماز میں آنا ہو ہر صورت میں منہ مسجد الحرام کی طرف کرنا لازم ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوگی یہاں تک کہ اگر مسجد اقصیٰ میں اعتکاف کی حالت میں ہو یا کسی اور مقصد کے لیے وہیں گیا ہو اور مسجد اقصیٰ شریف کے اندر سے ہی نماز میں آنا ہو پھر بھی منہ مسجد الحرام کی طرف کرنا ہی لازم ہے۔ نیز یہودیوں یا نصرانیوں کی کسی عبادت گاہ میں کسی کام سے جانا ہو جائے اس دوران نماز کا وقت ہو جائے تو پھر بھی نماز میں آنے پر منہ مسجد الحرام شریف کی طرف کرنا ہی فرض لازم ہے ورنہ نماز نہ ہوگی جبکہ آیت نمبر 115 کا تعلق تحويل قبلہ کے ساتھ نہیں بلکہ اُس سے مقصد الہی یہود و نصاریٰ کی سرزنش کرنے کے ساتھ مخصوص حالتِ خوف کا قبلہ بتانا ہے جس سے قرآن شریف کی ہمہ گیریت یعنی باریک سے باریک گوشہ ہائے حیات میں بھی اپنے ماننے والوں کے لیے رہنما ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ نیز بعض حالات میں بندوں کے حقوق کا اللہ تعالیٰ کے حقوق سے زیادہ اہم اور مقدم ہونے کے شرعی احکام بھی معلوم ہو رہے ہیں جیسے مذکورہ مثالوں سے واضح ہو رہا ہے کیوں کہ حالتِ خوف میں جابر و ظالم سے، دشمن و مرض سے اور درندہ و موت سے جان بچانا خالص بندے کا حق ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی شان بالا

(۱) الہدایہ مع فتح القدیر، ج 1، ص 236۔

واعلیٰ اور مقدس و سبحان ہے جبکہ مسجد حرام شریف کی طرف نماز میں منہ کرنا خالصتاً اللہ تعالیٰ کا حق ہے خوف کے مذکورہ حالات کے ساتھ دوچار انسان جب اللہ کے حق پر عمل کرتا ہے تو اُس کی جان جاتی، دشمن حملہ کرتا ہے یا عضو کاٹا جاتا ہے اور اگر اپنے حق پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا حق ضائع ہو جاتا ہے تقابل کے ایسے مشکل وقتوں میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کی جان و مال، عزت و آبرو کو بچانے کے لیے انسانی حقوق کی بجا آوری کرنے کا اس آیت کریمہ میں حکم دیا ہے اور اپنے حق کا متبادل بتایا ہے یہ سب کچھ آیت کریمہ ”يُنْمَا تَوَلُّوْا فَنَمُ وَجْهَ اللّٰهِ“ کی دلالت النص کا مفاد ہے جس سے سبق لے کر فقہاء کرام نے بھی مذکورہ عبارت ”وَمَنْ كَانَ خَائِفًا يُّصَلِِّْ اِلَىٰ اَيِّ جِهَةٍ قَدَرَ“ کی شکل میں دنیا کی رہنمائی کی ہے اور اس کی شروح میں اُن تمام احادیث کو بھی ذکر کیا ہے جو درحقیقت آیت نمبر 115 سے دلالت النص کے طور پر معلوم ہونے والے اس حکم کی تفسیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسے میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 144 تا آیت کریمہ 150 کے ساتھ آیت نمبر 115 کے تعارض کا تصور سرسری نظر کی پیداوار ہونے کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہماری اس تحقیق سے اُس قول کی حیثیت بھی معلوم ہوگئی جس میں آیت کریمہ ”وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تَوَلُّوْا فَنَمُ وَجْهَ اللّٰهِ“ کو تحويل قبلہ سے متعلق سمجھا گیا ہے جو مندرجہ ذیل وجوہ سے ناقابل عمل ہے۔

پہلی وجہ:- سیاق و سباق کے منافی ہے کیوں کہ اس آیت کریمہ سے قبل اہل کتاب کے مذہبی تعصب اور دنیوی مفادات کو مذہبی جھگڑا کا رنگ دے کر ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی اُن ہی کی سرکشیوں کا ذکر ہے جس میں تحويل قبلہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

دوسری وجہ:- تحويل قبلہ پر اعتراض کرنے والے جملہ منکرین کو آیت نمبر 142 میں ”قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ“ (البقرہ، 142) کہہ کر جواب دیا جا چکا ہے جو اُس مقام کے مناسب حال بھی ہے اُس کے بعد اس کو بھی اُس پر منطبق

سمجھنا تکرار کو مستلزم ہے جو کسی صورت بھی مناسب نہیں ہے۔

تیسری وجہ:- یہ سوچ عبارت النص اور دلالت النص کے حوالہ سے دونوں مقامات پر غور کرنے سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ (فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا ظَاهِرًا وَاٰبَاطًا)

☆☆☆☆☆

صرف و نحو، بلاغت کا عربی کے ساتھ مختص نہ ہونے کا فلسفہ

سوال یہ ہے کہ مدارج العرفان فی منہاج کثر الایمان میں قرآن شریف کے اُردو زبان میں کیے گئے بعض تراجم کو اس وجہ سے غیر معیاری قرار دیا گیا ہے کہ وہ آیت کریمہ کی صرفی، نحوی یا بلاغی حیثیت کے منافی ہیں۔ آیت کریمہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اُس کی صرفی اور نحوی حیثیات کو بیان کرنا تو درست ہے لیکن اُس کے غیر معیاری قرار دیئے جانے والے یہ تراجم اُردو زبان میں ہیں اور اُردو عربی زبان ہے تو پھر عربی زبان کو صرف و نحو اور بلاغت کے منافی کہنے کا کیا جواز ہے؟

السنائل..... مولانا سیف الرحمن امام گول مسجد اتار بار روڈ لاہور پنجاب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف و نحو اور علم بلاغت کو عربی زبان کے ساتھ مختص سمجھ کر دوسری زبانوں کے لیے شجرہ منوع قرار دینے کا جو تصور داغ میں جمایا گیا ہے یہ غلط ہے نہ صرف یہ تین علوم بلکہ کلام و زبان کے ذریعہ اظہار مافی الضمیر سے متعلقہ جملہ علوم و فنون کے بنیادی مسائل کو پیش نظر رکھنا، عربی و عربی کی تفریق کے بغیر ہر زبان کے لیے ضروری ہے، ہر کلام کی درستی کے لیے شرط اور ہر جملہ کی فصاحت و بلاغت کے لیے ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر ماضی کی جگہ مضارع کا لفظ استعمال کرنے یا مضارع کی جگہ ماضی کا لفظ استعمال کرنے سے متکلم کے مافی الضمیر کی ادائیگی ہو سکتی نہ مخاطب کو اس بات کا علم ہو سکتا ہے جو متکلم کہنا چاہتا ہے۔ جیسے عربی زبان میں ”اَکَلَ زَیْدٌ“ کی جگہ ”یَاکُلُ زَیْدٌ“ یا اس کے برعکس جملہ کو غلط اور خلاف مقصد کہا جاتا ہے، ویسے ہی اُردو زبان میں زید نے کھایا کہنے کے موقع پر زید کھائے گا کہنے کو بھی خلاف مقصد اور غلط کہا جاتا ہے۔ یہی حال ہر زبان کا ہے یہ اس لیے ہے کہ دراصل کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کلام نفسی، دوسری کلام لفظی۔

کلام نفسی سے مراد متکلم کی وہ مراد ہے جو اس کے ضمیر میں موجود ہے جو درجہ غیب میں ہے جب تک وہ الفاظ کے لباس میں اُسے ظاہر نہیں کرتا اُس وقت تک مخاطب کو اُس کا علم نہیں ہو سکتا۔

کلام لفظی سے مراد الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جس کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اُس نے استعمال کیا ہے۔

گویا کلام کی ان دونوں قسموں کے مابین دال و مدلول کا ربط ہے کہ کلام لفظی دال ہے جبکہ کلام نفسی اس کے مدلول ہے اسی چیز کی تعبیر ظاہر و مظہر سے بھی کی جاسکتی ہے کہ کلام لفظی مظہر ہے یعنی اصل کلام کے ظاہر ہونے کی جگہ اور اُس کے لیے ظرف و لباس ہے جبکہ کلام نفسی اس کے لباس میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عربی و عجمی کی تفریق کے بغیر کسی بھی فاعل مختار کا اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ کلام کرنا کلام نفسی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور کلام کرنے کے حوالہ سے اس اصول فطرت میں عربی و عجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا کلام لفظی اُس کے کلام نفسی کا تابع، اُس کا لباس، اُس کے قائم مقام اور اُس پر دلیل ہوتا ہے۔ عربی و عجمی کے مابین یکسانیت کا یہی حال لسان و کلام سے متعلقہ جملہ علوم و فنون کا بھی ہے کہ اُس کے بنیادی مسائل ہر زبان میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر فعل ماضی کی چھ قسمیں یعنی ماضی مطلق سے لے کر ماضی احتمالی تک کے معنوں و حقائق کی تمیز کو پیش نظر رکھنا جیسے عربی زبان میں ضروری ہے بلا تفریق اسی طرح کسی بھی عجمی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ یہ تصور 100% غلط ہے کہ علم تصریف میں استعمال ہونے والے صیغے، اقسام فعل اور فعل ماضی کی یہ تمام شکلیں عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں (حاشا و تکلّا) ایسا ہرگز نہیں ہے کلام کی درستی کے لیے ان حقائق کو پیش نظر رکھنا اور ہر ایک کے موقع پر اُس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ہر زبان میں ناگزیر ہے ورنہ کلام سے مقصد پورا نہیں ہوگا۔

مثال کے طور پر کوئی شخص ماضی قریب، بعید وغیرہ سے قطع نظر مطلق گزشتہ زمانہ میں کھانے سے متعلق

اپنے عمل کا اظہار عربی زبان میں کرنا چاہتا ہے تو اُس کی درستی اور فصیح و بلیغ ہونے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ لفظ ”اَكَلْتُ“ کہے گا تا کہ کلام لفظی اصل کلام کے یعنی کلام نفسی کے مطابق ہو سکے ورنہ اگر ماضی قریب میں ”قَدْ اَكَلْتُ“ کہنے کو اسی طرح ماضی بعید میں ”كُنْتُ اَكَلْتُ“ کہنے کو یا ماضی استمراری میں ”كُنْتُ اَكُلُ“ کہنے کو یا ماضی تثنائی میں ”لَيَتِمَّ اَكَلْتُ“ کہنے کو یا ماضی احتمالی میں ”لَعَلَّمَا اَكَلْتُ“ کہنے کو غلط ہی کہا جائے گا کیوں کہ ان تمام صورتوں میں کلام لفظی اصل کلام یعنی کلام نفسی کے خلاف ہے بلکہ وکاست یہی حال اُردو زبان کا بھی ہے کہ ”میں نے کھایا“ کہنے کے بجائے اگر ماضی قریب میں ”میں نے ابھی کھایا“ کہنے کو یا ماضی بعید میں ”میں نے کھایا تھا“ کہنے کو یا ماضی استمراری میں ”میں کھاتا رہا“ کہنے کو یا ماضی تثنائی میں ”کاش میں نے کھایا ہوتا یا ماضی احتمالی میں ”شاید میں نے کھایا ہو“ کہنے کو بھی اُسی طرح غلط کہا جاتا ہے، جیسے عربی زبان میں غلط ہے۔ یہی حال فعل مجہول کا بھی ہے کہ فعل معلوم ماضی ہو یا مستقبل اُس کی جگہ اگر فعل مجہول استعمال کیا جائے تو عربی و عجمی کی تفریق کے بغیر ہر زبان میں اُسے غلط کہا جاتا ہے۔ علم صرف کی طرح علم نحو اور علم بلاغت کا بھی یہی حال ہے کہ ان کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا عربی و عجمی کی تفریق کے بغیر ہر زبان کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص زید کی ضاربیت اور بکر کی مضروبیت کی خبر دینا چاہتا ہے تو اُسے ”ضَرَبَ زَيْدٌ بَكْرًا“ کہنا ضروری ہے ورنہ اس کے برعکس کر کے ”ضَرَبَ بَكْرٌ زَيْدًا“ کہنا یا ”ضَرَبَ زَيْدٌ بَكْرًا“ کہنا یا اصل کلام نفسی پر کچھ اضافہ کر کے ”ضَرَبَ زَيْدٌ بَكْرًا“ فی السوق جیسے کلام کرنا یا کلام نفسی میں موجود ایک کو کم کر کے ”ضَرَبَ زَيْدٌ“ یا ”ضَرَبَ زَيْدٌ“ یا ”ضَرَبَ بَكْرٌ“ کہنا جیسے عربی زبان میں غلط ہے ویسے ہی اُردو زبان میں بھی غلط ہے کہ زید نے بکر کو مارا کہنے کے بجائے ”بکر نے زید کو مارا“ یا ”زید مارا گیا“ کیا جائے یا ”بکر مارا گیا“ کہا جائے۔ اُردو زبان میں ان سب کے غلط ہونے کی وجہ بھی وہی ہے جو عربی زبان میں غلط ہونے کی تھی کیوں کہ کلام لفظی ان سب میں اصل کلام یعنی کلام نفسی کے خلاف ہے جب اُس کے خلاف ہے تو پھر علم نحو اور علم بلاغت کا خلاف ہونا آپ ہی

لازم آتا ہے یہ اس لیے کہ علم نحو اور علم بلاغت کے بنیادی اصول جتنے بھی ہیں وہ سب کے سب کلام لفظی کو کلام نفسی کے مطابق کرنے سے متعلق ہیں۔

اصل مغالطہ کی وجہ:- صرف و نحو اور بلاغت جیسے علوم و فنون کو عربی زبان کے ساتھ مختص سمجھنے کا جو عام تاثر پایا جاتا ہے بالخصوص نیم خواندہ علماء تو اس تصور سے نکلنے کی سوچ بھی نہیں سکتے اس کی اصل وجہ ان فنون کی عربی زبان میں تدوین ہے اور ان کی کتابوں میں عربی زبان کی صحت و سقم سے بحث کرنا ہے اور ان کو عربی زبان میں صحت تکلم کے لیے ذرائع و آلات بتانا ہے۔

مغالطہ کا ازالہ:- اس طرح ہے کہ ان فنون کو عربی زبان میں تدوین کرنے اور ان کے اصولوں کو عربی زبان میں صحت تکلم کے لیے استعمال کرنے سے بنیادی مقصد قرآن و سنت کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنا ہے خاص کر اہل عجم کے لیے کہ ان فنون کو قرآن فہمی کے لیے بطور آلہ سمجھنے کے بعد قرآن و سنت کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنا انہیں آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ کے درجہ میں ضروری ان تمام فنون کو اسلامی تاریخ کے اُن ادوار میں مرتب کر کے ترقی دی گئی ہے کہ جب اسلامی سرحدات کی جغرافیائی حدود میں نمایاں تیزی آرہی تھی، مختلف رنگ و نسل اور مختلف عجمی زبان والی قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی تھی جن کو مسلمان ہونے کے ناطے سے قرآن شریف کے مضامین و احکام کو اپنی زبانوں میں سمجھنے کی ضرورت تھی جس میں قرآنی آیات کا ترجمہ اپنی زبانوں میں سمجھنا اُن کے لیے سب سے اہم تھا جس کو محسوس کرتے ہوئے خلفاء اسلام نے لسان قرآنی کے مطابق ان فنون کو مستقل علوم کی حیثیت سے تدوین کر کے نہ صرف عجمی مسلمانوں پر بلکہ اُن تمام قوموں پر احسان کیا جو اسلام کی طرف مائل ہیں، جو قرآنی آیات کے مضامین و مقاصد کو اپنی زبان میں سمجھنا چاہتے ہیں یا دوسرے مذاہب کے ساتھ قرآن شریف کا تقابلی جائزہ لینے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ اہل عجم ان فنون کو بطور آلہ پڑھنے کے بعد لسان قرآنی میں غلطی کرنے سے بچنے کے ساتھ صحت تکلم پر بھی قادر ہو سکتے ہیں گویا ان فنون کو عربی زبان میں تدوین کرنے



سے اصل مقصد عجمیوں کو قرآن شریف کا ترجمہ سمجھانا تھا، آیات قرآنی کی تشریح و تفسیر سے متعارف کرانا تھا اور قرآن شریف کے مقاصد نزول کی تفہیم سے انہیں مستفیض کرنا تھا اور ظاہر ہے کہ آیات قرآنی کا دوسری زبانوں میں معیاری ترجمہ و تفسیر پیش کرنا اہل عجم کے لیے اُس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک آیات قرآنی کی فہم انہیں لسان قرآنی کے مطابق حاصل نہ ہو جو ان علوم و فنون کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ قرآن فہمی کے حوالہ سے اہل عجم کے لیے ان فنون کی حیثیت آلہ کی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی آلہ کی مدد سے انجام پانے والے کام کی تکمیل اُس کے بغیر نہیں ہو سکتی تو پھر اہل عجم کے لیے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ و تفسیر وجود میں لانا ان ناگزیر علوم آلہ کے بغیر کیسے ممکن ہو۔ یہ ہے صرف، نحو اور بلاغت جیسے علوم و فنون کو عربی زبان میں مرتب کرنے اور ان کے اصولوں کو عربی زبان پر منطبق کرنے کا اصل فلسفہ جس سے بے اعتنائی برتنے کی بناء پر نیم خواندہ حضرات نے ان کو محض عربی زبان کے ساتھ مختص ہونے کا تاثر قائم کیا ہے جو کسی طرح بھی قابل انتقاد نہیں ہے۔ اس کے ازالہ کے لیے اس حد تک کافی ہے جو ہم نے بیان کیا تاہم متلاشیان حقیقت کے افادہ کے لیے اس موضوع کی مزید تحقیق یہ ہے کہ صرف، نحو اور بلاغت و بیان جیسے قرآن فہمی کے لیے جتنے بھی ناگزیر علوم و فنون ہیں ان سب کی دو حیثیتیں ہیں۔

پہلی حیثیت:- ان کے بعض مباحث مافیہ الدین کے خواص ہیں یعنی عربی زبان کے ساتھ خاص ہیں عجمی میں نہیں پائے جاتی۔ جیسے ثلاثی مجرد، ثلاثی مزید فیہ، رباعی مجرد اور رباعی مزید فیہ جیسے کچھ صرفی مسائل، کل فاعل مرفوع، کل مفعول منصوب، کل مضاف الیہ مجرد، اور معرب و ثنی جیسے کچھ نحوی مسائل، تقدیم ماحقہ التاخیر کا مفید حصر ہونے جیسے کچھ بلاغی مسائل کہ ان کے الفاظ بھی اور حقیقتیں بھی عربی کے ساتھ خاص ہیں۔

دوسری حیثیت:- ان خصوصیات کے ماسوا جو فطری اصول و ضوابط ہیں اُن کے الفاظ چاہے دوسری زبانوں میں مستعمل ہو یا نہ ہو، ہر تقدیر اُن کی حقیقتیں عربی و عجمی کی تفریق کے بغیر سب میں

پائی جاتی ہیں اور اُن کو پیش نظر رکھنا صحت تکلم کے لیے ضروری شرط ہے، ورنہ کلام کا افادہ ممکن نہیں رہے گا۔

مثال کے طور پر فعل معلوم، مجہول، اسم مذکر، اسم مؤنث، اسم مفرد، جمع، اسم معرفہ، اسم نکرہ، اسم موصول، اسم موصوف، وصل، فصل، اطلاق، تقید، ایجاز، اطناب، مساوات، استعارہ، تشبیہ، وغیرہ جتنے بھی ہیں یہ سب کے سب وہ حقائق ہیں کہ جن کی تمیز کے لیے بغیر کوئی بھی کلام درست نہیں ہو سکتا چاہے عربی ہو یا عجمی اسی بنیاد پر علم بلاغت کو بھی عربی زبان کے ساتھ مخصوص کیے بغیر ہر زبان کو شامل رکھا گیا ہے۔ تلخیص المفتاح میں ہے؛

”وَأَنَّ مَرْجِعَهَا إِلَى الْأَخْتِرَازِ عَنِ الْخَطَا فِي تَأْدِيَةِ الْمَعْنَى الْمُرَادِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ علم بلاغت کا انجام معنی مرادی کو ادا کرنے میں غلطی سے بچنے کی طرف ہے۔

اور بلاغت فی الکلام کی بنیادی اس بات پر ہے کہ وہ مقتضی الحال کے مطابق ہو جائے چاہے عربی ہو یا عجمی۔ تلخیص المفتاح میں ہے؛

”وَالْبَلَاغَةُ فِي الْكَلَامِ مُطَابَقَتُهُ لِمُقْتَضَى الْحَالِ مَعَ فَصَاحَتِهِ“

اس کی تشریح کرتے ہوئے کتاب المطول میں لکھا ہے؛

”الْمُرَادُ بِالْحَالِ الْأَمْرُ الدَّاعِي إِلَى التَّكَلُّمِ عَلَى وَجْهِ مَخْصُوصٍ“ (۲)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس مقتضی الحال کی مطابقت بلاغت فی الکلام کے لیے ضروری ہے اُس

سے مراد ہر وہ چیز ہے جو تکلم کو مخصوص انداز سے کلام کرنے کے لیے باعث ہو۔

مفتاح العلوم میں بھی علم معانی کی تعریف کو عام سمجھتے ہوئے اُسے عربی و عجمی دونوں کو شامل رکھا ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں؛

(۱) تلخیص المفتاح، ص 6۔

(۲) کتاب المطول، ص 25 مع حاشیہ المیر السید السند۔

”اعْلَمْ أَنَّ عِلْمَ الْمَعْنَى هُوَ تَتَبُّعُ خَوَاصِّ تَرَائِبِ الْكَلَامِ فِي الْإِفَادَةِ وَمَا يَتَّبَعُ
بِهَاسِنِ الْإِسْتِحْسَانِ وَغَيْرِهِ لِيَحْتَرَزَ بِالْوُقُوفِ عَلَيْهَا عَنِ الْخَطَا فِي تَطْبِيقِ
الْكَلَامِ لِمَا يَقْتَضِي الْحَالُ ذِكْرُهُ“

اسی طرح علم بیان کی تعریف کو بھی عربی و عجمی دونوں کو شامل کر کے لکھا ہے؛

”وَأَمَّا عِلْمُ الْبَيَانِ فَهُوَ مَعْرِفَةُ إِيزَادِ الْمَعْنَى الْوَاحِدِ فِي طُرُقٍ مُخْتَلِفَةٍ بِالذِّيَادَةِ وَ
وَضُوحِ الدَّلَالَةِ عَلَيْهِ وَبِالنَّقْصَانِ لِيَحْتَرَزَ بِالْوُقُوفِ عَلَى ذَلِكَ عَنِ الْخَطَا فِي
مُطَابَقَةِ الْكَلَامِ لِتَمَامِ الْمُرَادِ مِنْهُ“ (۱)

الغرض ان علوم و فنون کے اکثر آئمہ نے ان کو نہ صرف عربی بلکہ ہر زبان میں جاری ہونے کا
واضح اشارات دیے ہیں اور جنہوں نے ان کی تعریف میں کلام کو یا لفظ کو عربی کے ساتھ مقید کیا ہے ان
کی تشریح کرنے والے حضرات نے ان کی مراد واضح کی ہیں کہ یہ تقييد اس لیے نہیں ہے کہ یہ فن عربی
زبان کے ساتھ خاص ہے ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان فنون کو تدوین کرنے سے اصل
مقصد قرآن اور اس کی فصاحت و بلاغت و اعجاز کو سمجھنے کے بعد عجمی زبانوں میں اس کا معیاری ترجمہ و
تفسیر پیش کرنے کی راہ ہموار کرنا تھا۔ گویا قرآن شریف کا عربی زبان میں ہونا اس تقييد کی اصل وجہ
تھا۔ کتاب المطول میں لکھا ہے؛

”وَتَخْصِيصُ اللَّفْظِ بِالْعَرَبِيِّ مُجَرَّدُ إِصْطِلَاحٍ لِأَنَّ هَذِهِ الصَّنَاعَةَ إِنَّمَا وَضَعَتْ
لِمَعْرِفَةِ أَحْوَالِ اللَّفْظِ الْعَرَبِيِّ لَا غَيْرَ“ (۲)

اس کی تشریح کرتے ہوئے حاشیہ عبدالحکیم الیاء کوٹلی میں لکھا ہے؛

”قوله مجرد اصطلاح ای ليس للاختراز عَنِ الْعَجَمِي إِذْ يَعْرِفُ بِهَا أَحْوَالَهُ“

(۱) مفتاح العلوم، ص 70، مطبوعہ بیروت۔

(۲) کتاب المطول علی التلخیص، ص 35، مع حاشیہ السید میر السند۔

إيضاً مثل أن يقال في جواب المنكر لقيام زيد هر آينه استاده است“ بل
لمجرد اصطلاحهم على تدوين العلم لذلك لِمَا أَنَّ الْمَقْصُودَ الْأَصْلِيَّ مَعْرِفَةَ
إِعْجَازِ الْقُرْآنِ“ (۱)

خلاصہ التحقيق بعد التفصيل:- جب کوئی کلام فصاحت و بلاغت کے اصولوں کو پیش نظر رکھے بغیر
درست نہیں ہو سکتا نہ عربی نہ عجمی تو پھر اس کے بغیر قرآن شریف کے ترجمہ جیسے اہم ترین عمل کے
معیاری ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں رہتا ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسے لوگوں نے ترجمہ القرآن کے نام سے
اندھیرے میں تیر چلائے ہیں۔ جن کی مشتبہ نمونہ از خروارے چند مثالیں؛

پہلی مثال:- ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام
سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں“ قرآن فہمی کے لیے ان علوم آلیہ سے شناسائی رکھنے والے
حضرات جانتے ہیں کہ بسم اللہ شریف میں اسم جلالت موصوف اور ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ اس کی یکے
بعد دیگرے صفات ہیں اور اسم موصوف اپنی صفت یا صفات کے ساتھ ملکر علم خواہ علم بلاغت کی زبان
میں ہمیشہ مفرد ہی کہلاتا ہے جملہ ہرگز نہیں ہے بالفاظ دیگر صفت و موصوف کا مجموعہ مرکب تو صفی کہلاتا
ہے جو جملہ کے مقابلہ میں مفرد ہوتا ہے جملہ ہرگز نہیں لیکن قرآن فہمی کے لیے ان ناگزیر علوم و فنون کو
پس پشت ڈال کر ترجمہ کے نام سے بے ہدف تیر چلانے والوں نے اس کے ترجمہ میں ”جو بڑے
مہربان نہایت رحم والے ہیں“ کہہ کر اس کو جملہ بنا دیا جس کو ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ شریف
کا معیاری ترجمہ کہنے کے لیے نحوی تیار ہے نہ بلاغی، سیبویہ اسے گوارا کرتا ہے نہ شیخ عبدالقادر جرجانی
عبدالرحمن جامی اسے سننا پسند کرتا ہے نہ تقی زانی نہ صرف اس ایک اندھیر مگر پر اکتفا بلکہ متفقہ مقام
جو اللہ تعالیٰ کی عظمت یکتائی و توحید کا ہے اس کو بھی نظر انداز کر کے تعظیم شان الہی کو انسانوں کی تعظیم پر
قیاس کر کے اس کے لیے جمع کا لفظ ”ہیں“ استعمال کیا گیا ہے جو نہ صرف لغت، علم خواہ علم بلاغت کے

(۱) حاشیہ السیالکوٹی علی المطول، ص 72، مطبوعہ منشورات الرضی قم ایران۔

منافی ہے بلکہ اپنی تعظیم کے لیے اللہ تعالیٰ کی بندوں کو دی ہوئی تعلیم کے بھی منافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یکتائی کے مطابق ہمیشہ مفرد الفاظ میں اپنی ذات اقدس کو یاد کرنے کی تعلیم دی ہے۔

دوسری مثال:- ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کے ترجمہ میں علم خود بلاغت کی جو دھجیاں اڑائی گئی تھی اُس کے بعد آیت نمبر 2 ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ کے ترجمہ میں بھی ”سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے“ کہہ کر وہی ٹیڑھی کھیل کھلی گئی ہے۔ یہ اس لیے ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کی طرح اس آیت کریمہ کے بھی حقیقت میں دو حصے ہیں جن میں سے:

اول حصہ:- ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“ بجائے خود جملہ ہے جس کا ترجمہ بھی جملہ میں کر کے اچھا کیا گیا ہے۔
دوم حصہ:- لفظ ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“ ہے جو جملہ نہیں بلکہ مفرد ہے۔

کیوں کہ لفظ ”رب“ چاہے مصدر ہو یا صفت مشبہ یا اسم فاعل بہر تقدیر مضاف ہوا ہے لفظ ”الْعَالَمِينَ“ کی طرف اور علم خود سے شناسائی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی اپنے فاعل اور مفعول بہ سے ملنے کے بعد جملہ نہیں ہوتا بلکہ مفرد ہی رہتا ہے، اسم فاعل اپنے فاعل وغیرہ سے ملنے کے بعد جملہ نہیں بلکہ شبہ جملہ اسمیہ ہوتا ہے جبکہ مصدر اپنے فاعل وغیرہ سے ملنے کے بعد شبہ جملہ بھی نہیں ہوتا لیکن صد افسوس کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے علم خود بلاغت جیسے ناگزیر علوم کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے اس مفرد کا ترجمہ ”جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے“ جیسے جملہ میں کرنے کی ٹھوس غلطی کی گئی ہے جو ناقابل معافی ہے۔ قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے شرط کے درجہ میں ان موقوف علیہ علوم و فنون سے بے اعتنائی برتنے والے حضرات نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ آیت کریمہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ میں اسم جلالت موصوف اور ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“ اُس کی صفت ہے اور صفت و موصوف کا مجموعہ مرکب توصیفی، اور مرد ہوتا ہے جو جملہ نہیں بلکہ جملہ کے مقابل ہوتا ہے۔

تیسری مثال:- آیت کریمہ ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ جو نحوی ترکیب کے اعتبار سے اسم جلالت کے لیے بالترتیب دوسرے اور تیسرے اوصاف ہیں جس کا مجموعہ مرکب جملہ ہرگز نہیں بلکہ مرکب توصیفی اور

مفرد ہے لیکن مترجم نے ”جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں“ کہہ کر الٹی منطق چلائی۔ غیر جملہ کا ترجمہ جملہ میں کیا اور مرکب غیر تام کو مرکب تام و جملہ ظاہر کر کے علم خود سے لے کر علم بلاغت تک سب کی خلاف ورزی کی ہے۔ ایسے میں اس قسم تراجم کی حیثیت ناچنے طلباء کا مشق کرنے یا انکل پچوں چلانے کے مانند اخلو سے خالی نہیں ہے چہ جائیکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کہلا سکے۔

چوتھی مثال:- آیت کریمہ ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ جو نحوی ترکیب کے اعتبار سے ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ میں مذکور اسم جلالت کی چوتھی صفت ہے جس کے مطابق صفت و موصوف کا یہ مجموعہ بھی مرکب توصیفی اور مفرد ہے جس کا ترجمہ ”جو مالک ہیں روز جزا کے“ کہہ کر جملہ میں کیا گیا ہے جو اندھیرے میں تیر چلانے سے مختلف نہیں ہے۔ غیر معیاری تراجم کی ان مثالوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھے کہ صرف اسی ایک طبقہ کے یہ تراجم غلط ہیں ان کے سوا بہت سے اور بھی ہیں وہ شاید درست ہوں یہ تصور اس لیے غلط ہے کہ معیاری ترجمہ کے لیے ضروری شرائط اور فنون مذکورہ کی رعایت کیے بغیر نہ صرف یہ بلکہ جتنے بھی ہیں ان سب کا یہی حال ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس طبقہ کے جتنے بھی ہیں یہ مذکورہ دو وجوہ سے غلط ہیں جبکہ جملہ کے مقابلہ میں مفرد متن کا ترجمہ بصیغہ ”ہیں“ کے بجائے ”ہے“ میں کئے گئے سب کے سب اس غلطی میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہوئے دوسرے اعتراض سے محفوظ ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی شان عظمت کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے جمع کا لفظ ”ہیں“ استعمال کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ چاروں آیات مقدسہ کے ان تمام تراجم کا کنز الایمان کے ترجمہ ”اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا O سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہاں والوں کا O بہت مہربان رحمت والا O روز جزا کا مالک“ کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن کے سوا کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو مرکب غیر تام کا ترجمہ جملہ میں کرنے کے مذکورہ اعتراض سے پاک و محفوظ ہو۔ اس پر مستزاد قابل افسوس یہ کہ مولانا محمود الحسن نے مقدمہ موضح القرآن میں جس بات کا التزام ظاہر کیا تھا اُس کو بھی عملی طور پر نہ بھاسکے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مولانا محمود الحسن صاحب کو اُن کے دوستوں نے اُردو زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ لکھنے کے لیے کہا تو انہوں نے موضع القرآن کو معیاری ترجمہ کہتے ہوئے کہا کہ اس کی موجودگی میں اُردو زبان میں دوسرا ترجمہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس طرح کا معیاری ترجمہ لکھنا ہمارے جیسوں کے لیے ممکن بھی نہیں ہے پھر جب دوستوں نے بار بار اصرار کیا، تب مولانا تین باتوں کے التزام کے ساتھ ترجمہ لکھنے بیٹھ گئے۔

پہلی بات:- موضع القرآن کے جو الفاظ آج کل مستعمل اور قابل فہم بھی ہیں اُن کو اُسی طرح بیان کر دیں گا۔

دوم:- موضع القرآن میں استعمال کئے گئے جو الفاظ آج کل متروک ہو چکے ہیں اُن کی جگہ جدید الفاظ استعمال کروں گا۔

سوم:- موضع القرآن کے ناقابل فہم مختصر الفاظ کی جگہ قدرے تفصیل کے ساتھ قابل فہم الفاظ استعمال کروں گا۔

ان تین باتوں کا التزام کرنے کے ساتھ مولانا نے اپنے کیے ہوئے ترجمہ موضع الفرقان کو کبیل کے ساتھ اور حضرت شاہ عبدالقادر کے موضع القرآن کو دوشالہ کے ساتھ تشبیہ دے کر اپنے اس سارے عمل کو دوشالہ کی جگہ کبیل سے رفو کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے اس مقدمہ میں حضرت شاہ عبدالقادر کے موضع القرآن کی جس پہلو سے بھی تحسین کی ہے وہ بالیقین درست اور بلا مبالغہ حقیقت کا اظہار ہے کیوں کہ اُس وقت یعنی آج سے دو سو سال قبل اُردو زبان میں موضع القرآن سے زیادہ مفید اور زیادہ معیاری ترجمہ کوئی اور نہیں تھا لیکن التزام کی ہوئی مذکورہ تین باتوں میں سے آخر الذکر کو مفید مقصد بنانے کے بجائے باز کے ساتھ بوڑھیا کے ہاتھوں ہونے والے عمل کا کردار ادا کیا ہے۔ جس کی زندہ مثال قرآن شریف کے آغاز یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے موضع القرآن کے درست ترجمہ کو بگاڑنا ہے جس میں مفرد کا ترجمہ جملہ

میں کر کے بے محل رفو کاری کر دی جن کا موازنہ اس طرح ہے کہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ مولانا کی رفو کاری کرنے سے قبل ”شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا“ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ مولانا کی رفو کاری کرنے کے بعد ”شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے“۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ شریف کے شاہ عبدالقادر والے درست ترجمہ کو لفظ ”ہے“ لگا کر بگاڑنے کے بعد مولانا کو ہوش آیا ہوگا کہ میں نے بے محل رفو کاری کی ہے کہ مفرد کا ترجمہ جملہ میں کیا اور متن کے غیر جملہ کو ترجمہ میں جملہ ظاہر کر دیا ہوش آنے کا ہی نتیجہ ہے کہ اس کے بعد والے تینوں مفردات کے شاہ عبدالقادر والے درست تراجم کو اس حوالہ سے نہیں چھیڑا جو اچھا عمل ہے حالاں کہ یہ چاروں ایک جیسے ہی مفرد ہیں کہ اول میں اسم جلال اپنی دونوں صفات ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے ساتھ مل کر ترکیب توصیفی اور مفرد ہے۔

دوسرے میں آیت کریمہ ”الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ“ میں اسم جلال اپنی صفت ”رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ“ کے ساتھ مل کر صفت و موصوف کا مجموعہ مرکب ترکیب توصیفی اور مفرد ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ میں بھی اسم جلال اپنی دونوں صفات کے ساتھ ملکر مجموعہ مرکب ترکیب توصیفی اور مفرد ہے اسی طرح آیت کریمہ ”مَلِیْکِ یَوْمَ الدِّیْنِ“ میں بھی اسم جلال اپنی صفت ”مَلِیْکِ یَوْمَ الدِّیْنِ“ سے مل کر ترکیب توصیفی اور مفرد ہے جب ان چاروں کی ترکیبی نوعیت ایک ہے، سب کے سب مفرد ہیں، جملہ نہیں ہیں تو پھر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے آخری حصہ والے مفرد کے شاہ عبدالقادر والے درست ترجمہ میں لفظ ”ہے“ کی بے محل رفو کاری کرنے کے بعد باقی تینوں کو بحال رکھنے، لفظ ”ہے“ کی رفو کاری کرنے سے ہاتھ کو روکنے اور پہلے سے تفریق کرنے کا اس کے سوا اور کیا فلسفہ ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم شریف کے صحیح ترجمہ کو بگاڑنے کے بعد پیدا ہونے والے احساس نے مزید بگاڑ سے روک دیا ہوگا۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْحَالِ) جب مولانا محمود الحسن صاحب جیسے شہرہ آفاق شخص سے موقوف علیہ علوم کی رعایت کے بغیر اتنی بڑی غلطی

ہو سکتی ہے تو پھر کوئی اور کیا بچ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن کے بعد اُردو میں لکھے گئے تراجم کی طویل فہرست میں کنز الایمان کے سوا باقی کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کو معیاری ترجمہ کہا جاسکے، جو کسی موقوف علیہ فن کے خلاف نہ ہو یا اسلام کے کسی مسلمہ عقیدہ کے ساتھ متصادم نہ ہو جس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مترجمین نے صرف، نحو اور بلاغت جیسے موقوف علیہ علوم و فنون کو عربی زبان کے ساتھ مختص سمجھ کر اپنے تراجم کو اُس کی پابندی سے آزاد کر دیا، اُس حوالہ سے متن کے ساتھ مطابقت کی ضروری شرط کو پس پشت ڈال دیا اور ترجمہ القرآن جیسے کثیر الجہات اور مقنعی احتیاط عمل کو آسان سمجھ کر ایسی ٹھوکریں کھائیں ہیں کہ الامان والحق۔

کاش یہ حضرات اس ضروری شرط کی پابندی کے حوالہ سے موضح القرآن کی تقلید کرتے یا کم از کم اُس کی مخالفت نہ کرتے پھر بھی اتنی بڑی غلطیاں نہ کرتے۔ اس حوالہ سے افسوس بالائے افسوس یہ کہ ان مترجمین میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو موضح القرآن کی تفصیلاتِ اولیت، اہمیت اور صحت کو تسلیم نہ کرتا ہو اس کے باوجود اُس کی کھلی مخالفت کرنے یا اُس کی اصلاح کی غرض سے دو مثالہ میں کمالِ ثناء کی رفاکاری کرنے کی اس سے بڑی نامعقول وجہ اور کوئی نہیں ہے کہ انہوں نے معیاری ترجمہ کے لیے اس ضروری شرط کی پابندی سے خود کو آزاد سمجھا، آیات قرآنی کے مطابق ترجمہ کے بجائے قرآنی آیات کو اپنی مَن پسند کے تابع کرنے کی کوشش کی جو قابلِ معافی نہیں ہے۔ ایسے میں ان تراجم کے معیاری ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں رہتا لیکن ناواقفِ حال دنیا یا نیم خواندہ حضرات کی روش ہی جدا ہے۔ جن کے سامنے ترجمہ القرآن کے نام سے شجر کو جھڑپا جائے تب بھی چلتا ہے کیوں کہ وزن و دونوں کا ایک ہے اور ترکیبی ہیئت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے جبکہ واقفِ حال اور قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کی شرائط اور اُس کے فطری تقاضوں سے آگاہ حضرات ان اُدٹ پناگ ترجموں پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ (فَاللّٰهُ الْمُشْتَكٰی)

☆☆☆☆☆

ترجمہ القرآن کی شرائط کا قرآن و سنت سے ثبوت

سوال یہ ہے کہ ”مدارج العرفان فی مناجح کنز الایمان“ کے نام سے قرآن شریف کے تراجم کا جو تقابلی جائزہ لیا گیا ہے اس میں قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے جو گیارہ شرائط بتائی گئی ہیں۔ کیا ان کی اصل کتاب و سنت سے ثابت ہے یا مفسرین کرام کے کلام میں ان کی کوئی مثال موجود ہے؟ بجائے خود ان میں سے ہر ایک کا معیاری ترجمہ کے لیے شرط ہونے پر ہر شخص کو تسلی ہو جاتی ہے۔ اس قدر کثیر تعداد میں شرائط کی مثال قرآن شریف سے متعلق کسی کتاب اور کسی تفسیر میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دل کو بہانے والی یہ شرائط بجائے خود حقیقت ہیں کہ ان کے بغیر قرآن شریف کا معیاری ترجمہ ممکن نہیں ہے تاہم قرآن و سنت اور سلف صالحین میں اس کا حوالہ مل جائے تو سونے پہ سہاگہ ہوگا۔..... والسلام

السانل..... قاضی محمد مظفر اقبال رضوی، خطیب اونچی مسجد اندرون بھائی گیٹ لاہور

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کسی بھی عجمی زبان میں کرنے کے لیے یہ تمام کی تمام شرائط قرآن و سنت میں بھی اور مفسرین کرام کے ذخیرہ تفسیر میں بھی موجود ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے احکام و معارف تک پہنچنے کے لیے اُس میں غور و فکر کرنے کا فرمایا؛

”كَيْتَبُ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبْرَكٌ لِّيَذَكِّرَ بِهِ وَيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ“ (۱)

یعنی یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اتاری برکت والی تاکہ اس کی آیتوں کو سوچیں اور غور و نصیحت مانیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی دو صفات بیان فرمائی جو بالترتیب ”أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ“ اور ”مُبْرَكٌ“ ہیں اس کے بعد دو چیزوں کو مقصد نزول کے طور پر بیان فرمایا جن میں سے اول آیات قرآنی میں تدبر کرنا ہے جبکہ دوسری چیز غفلتوں کا اس سے نصیحت حاصل کرنا ہے۔ ان پر عمل کرنا تب ممکن ہو سکتا ہے جب آیات قرآنی میں تدبر کرنے والوں کو ان کی حسن ترتیب سے لے کر علوم آلہ تک کی سمجھ ہو، سیاق و سباق سے لے کر الفاظ کی لغوی صفات تک کی تمیز ہو، تفسیر قرآنی سے لے کر علم بلاغت کی لطافتوں تک کا ادراک ہو ورنہ جس شخص کو آیات قرآنی کی حسن ترتیب کا شعور نہ ہو یا علم صرف، علم اشتقاق، علم نحو اور علم بلاغت جیسے علوم آلہ کا ادراک ہی نہ ہو یا متن کے سیاق و سباق، مافیہ الکلام اور الفاظ کی صفتی نوعیت کا علم نہ ہو تو ایسے شخص سے تدبر فی الآیات ممکن ہی نہیں ہے۔ گویا ہمارے بیان و ترتیب کے مطابق معیاری ترجمہ کے لیے پہلی چھ شرائط اس آیت کریمہ سے اقتضاء النص کے طور پر ثابت ہو رہی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ’لِيَذْكُرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ‘ کے حاصل مفہوم کا تصور ان چھ چیزوں کے تصور پر موقوف ہے اور اس پر عمل کا ممکن ہونا ان سب کی سمجھ پر موقوف ہے۔ انجام کار یہ کہ ان چھ شرائط کے بغیر آیات قرآنی میں تدبر ممکن ہے نہ تذکر، ترجمہ ہو سکتا ہے نہ تفسیر اور تاویل ممکن ہے نہ تفہیم۔

جہاں تک ساتویں اور آٹھویں شرائط کا مسئلہ ہے تو یہ دونوں اس لیے ضروری ہے کہ کسی بھی فصیح و بلیغ کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے دنیائے لسانیات میں ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ترجمہ متن کے الفاظ کے مطابق ہو جس میں کمی بیشی نہ ہو، اسی طرح ضروری سمجھا جاتا ہے کہ فصیح و بلیغ کلام میں ہو ورنہ فصاحت و بلاغت کے منافی کلام اس کا معیاری ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتا جب کسی بھی فصیح و بلیغ کلام کے معیاری ترجمہ کے لیے یہ دونوں باتیں شرط ہیں تو پھر قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے بدبجہ اوٹی شرط ہوں گی۔

جہاں تک نویں اور دسویں شرائط کا قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے ضروری ہونے کا مسئلہ ہے

یہ بھی قرآن و سنت سے ثابت ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ (۱)

یعنی خالص نیت کے ساتھ ہر قسم یعنی ترجیح سے پاک انسانوں کو ہی اس کے معارف حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور گیارہویں شرط کا قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے ضروری ہونا۔ بخاری شریف کی اس حدیث سے ثابت ہے جس میں اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا:

”الْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللَّهُ“ (۲)

یعنی بے اعتدالیوں سے بچنا اسی کے لیے ممکن ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شامل حال ہو۔

ان حوالہ جات کے علاوہ ہمارے بیان کے مطابق شرائط نمبر 7، 8، 9، 10 کے علاوہ باقی سات اس حدیث شریف سے بھی ثابت ہو رہی ہیں جس میں اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَوَقَّعْهُ مِنَ النَّارِ“ (۳)

اہل علم جانتے ہیں کہ جس علم کے بغیر آیات قرآنی میں لب کشائی کرنے کو اس حدیث میں نار جہنم کا سبب قرار دیا گیا ہے وہ سلف صالحین کی تصریحات کے مطابق ان شرائط کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کو محسوس کرتے ہوئے مختلف مفسرین کرام نے بھی ان ہی شرائط کو قول فی القرآن کے جواز کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں کہا ہے:

”وَلَا يُمْكِنُ تَحْصِيلُ هَذَيْنِ إِلَّا بِعِلْمٍ لَفْظِيٍّ وَعَقْلِيٍّ وَمَوْهَبِيٍّ“

(۱) الواقعة، 79۔

(۲) بخاری شریف، ج 2، ص 987۔

(۳) مسند امام احمد حنبل، ج 1، ص 369، حدیث نمبر 323۔

فَالْأَوَّلُ مَعْرِفَةُ الْأَلْفَاظِ وَهُوَ عِلْمُ اللَّغَةِ.

وَالثَّانِي مُنَاسِبَةُ بَعْضِ الْأَلْفَاظِ إِلَى بَعْضٍ وَهُوَ الْإِشْتِقَاقُ.

الْثَّالِثُ مَعْرِفَةُ أَحْكَامِ مَا يَغْرِضُ لِلْأَلْفَاظِ مِنَ الْإِنْبِيَةِ وَالتَّصَارُيفِ وَالْإِعْرَابِ وَهُوَ النُّحُو.

وَالرَّابِعُ مَا يَتَعَلَّقُ بِذَاتِ التَّنْزِيلِ وَهُوَ مَعْرِفَةُ الْقُرْآنِ.

وَالْخَامِسُ مَا يَتَعَلَّقُ بِالْأَسْبَابِ الَّتِي نَزَلَتْ عَنْدَهَا الْآيَاتُ وَشَرَحَ الْأَقَاصِيصُ الَّتِي تَنْطَوِي عَلَيْهَا السُّورَةُ مِنْ ذِكْرِ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَالْقُرُونِ الْمَاضِيَةِ وَهُوَ عِلْمُ الْأَنْثَارِ وَالْأَخْبَارِ.

وَالسَّادِسُ ذِكْرُ السُّنَنِ الْمَنْقُولَةِ عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَنْ شَهِدِ الْوَحْيِ مِمَّا اتَّفَقُوا عَلَيْهِ وَمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِمَّا هُوَ بَيَانٌ لِمُجْمَلٍ أَوْ تَفْسِيرٌ لِمُبْتَهَمٍ الْمُنْبَاعِنَةُ بِقَوْلِهِ تَعَالَى "وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ" وَبِقَوْلِهِ تَعَالَى "أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمْ أَقْتَدِهِ" وَذَلِكَ عِلْمُ السُّنَنِ.

وَالسَّابِعُ مَعْرِفَةُ النَّاسِخِ وَالْمَنْسُوخِ وَالْعُمُومِ وَالْخُصُوصِ وَالْإِجْمَاعِ وَالْإِخْتِلَافَاتِ وَالْمُجْمَلِ وَالْمُفَسَّرِ وَالْقِيَاسَاتِ الشَّرْعِيَّةِ وَالْمَوَاضِعِ الَّتِي يَصِحُّ فِيهَا الْقِيَاسُ وَالَّتِي لَا يَصِحُّ وَهُوَ عِلْمُ أَصُولِ الْفِقْهِ.

الثَّامِنُ أَحْكَامُ الدِّينِ وَآدَابُهُ وَآدَابُ السِّيَاسَاتِ الثَّلَاثِ الَّتِي هِيَ سِيَاسَةُ النَّفْسِ وَالْأَقَارِبِ وَالرَّعِيَّةِ مَعَ التَّمَسُّكِ بِالْعَدَالَةِ فِيهَا وَهُوَ عِلْمُ الْفِقْهِ وَالزُّهْدِ.

وَالْتَّاسِعُ مَعْرِفَةُ الْأَدَلَةِ الْعَقْلِيَّةِ وَالْبَرَاهِينِ الْحَقِيقِيَّةِ وَالتَّقْسِيمِ وَالتَّحْدِيدِ وَالْفَرْقِ بَيْنَ الْمَعْقُولَاتِ وَالْمُظُنُّنَاتِ وَغَيْرِ ذَلِكَ وَهُوَ عِلْمُ الْكَلَامِ.

وَالْعَاشِرُ عِلْمُ الْمُوهَبَةِ وَذَلِكَ عِلْمُ يَوْمِئِذِهِ اللَّهُ مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ (عَلِيٌّ) ص قَالَتِ الْحِكْمَةُ مَنْ أَرَادَنِي فَلْيَعْمَلْ بِأَحْسَنِ مَا عَلِمَ ثُمَّ تَلَا "الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ" (١)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن شریف جس اسلامی عقیدہ و عمل پر مشتمل ہے اُس کا حصول علوم لفظیہ، عقلیہ، وحیبہ کے بغیر ممکن نہیں ہے جن میں سے اول مندرجہ ذیل آٹھ چیزوں پر مشتمل ہے:

آیات قرآنی کے الفاظ کی حقیقت کو جاننا جس کا تعلق علم لغت سے ہے۔

آیات قرآنی کے الفاظ کی ایک دوسرے سے مناسبت کو جاننا جس کا تعلق علم اشتقاق سے ہے۔

آیات قرآنی کے الفاظ کو لاحق ہونے والے اعراب کی حیثیت کو جاننا جس کا تعلق علم النحو سے ہے۔

آیات قرآنی کے الفاظ کی مین حیث النزل ادا نیگی کے انداز کو جاننا جس کا تعلق علم قرائت سے ہے۔

آیات قرآنی کے نزول کے اسباب کو جاننا جس کا تعلق حدیث و آثار سے ہے۔

آیات قرآنی کی تفسیر نبوی ﷺ و تشریحات صحابہ کو جاننا جس کا تعلق علم سنن سے ہے۔

آیات قرآنی میں سے ناخ و منسوخ، مفسر و مجمل، عموم و خصوص اور محل قیاس و غیر محل قیاس کو جاننا جس کا تعلق اصول فقہ سے ہے۔

آیات قرآنی کی اُن قسموں کو جاننا جو دینی احکام و آداب اور سیاست مدنی، تدبیر منزل اور تہذیب الاخلاق کی تعلیم پر مشتمل ہیں جس کا تعلق علم فقہ اور علم زہد سے ہے۔



قرآن فہمی کے لیے علوم لفظیہ کی ان آٹھ (8) قسموں کے علاوہ آیات قرآنی کی وہ قسمیں جو دلائل عقلیہ پر مشتمل ہیں ان کو جاننے کیلئے عقلی دلائل و براہین، حقائق الاشیاء کی ترتیبی تقسیم، انکی تصریفات و تحدیدات اور معقولات و منظونات کی تمیز کو جاننا بھی ناگزیر ہے۔ ان کے علاوہ جن علوم و وصیہ کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں ہے وہ وہی علوم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ان ہی سعادت مندوں کو عطا فرماتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔

حضرت علی ص نے حکمت کی زبان میں فرمایا:

”کہ علم و حکمت نے کہا ہے کہ جو مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے چاہئے کہ پہلے سے حاصل علم پر عمل کرے اس کے بعد حضرت علی ص نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی ”الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ“ (۱)

امام راغب کی طرح دوسرے مفسرین کرام نے بھی اپنے اپنے انداز میں ان ہی چیزوں کو قرآن فہمی کے لیے ناگزیر شرط قرار دیا ہے جن کو ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض نے طوالت سے کام لیتے ہوئے پندرہ تک ذکر کیا ہے اور بعض نے دس، بعض نے سات، جیسے بالترتیب الاتفاق فی علوم القرآن، البحر المحیط اور روح المعانی کے مقدمات کو دیکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

لوازمات ایمان کا نقل سے ثبوت

میرا سوال یہ ہے کہ اصول تکفیر میں محبت، تعظیم، رضا، جذبہ عمل، مومن بہ کی ضد سے کراہت کو لوازمات ایمان قرار دے کر ان کے بغیر ایمان کو کالعدم قرار دیا گیا ہے جبکہ یہ مسئلہ عقیدہ کا ہے اور اعتقادات کا ثبوت نقل یعنی قرآن و سنت سے ہونا ضروری ہے جبکہ یہاں پر قرآن و سنت کے بجائے محض عقل سے ثبوت دیا گیا ہے۔ مہربانی کر کے اس کی وضاحت کریں۔ والسلام

السائل..... مولانا محمد حکیم خطیب جامع مسجد نجم النساء، رشید ٹاؤن گلہار، پشاور شہر

اس کا جواب یہ ہے کہ ان تمام مثالوں میں ایمان سے مراد شرعی ایمان ہے جو ملت اسلام اور اُس کے تمام ضروریات دین والے حصوں کے ساتھ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب سے عبارت ہے اور اُس پر حمل ہونے والے ان تمام لوازمات میں محبت سے لے کر مومن بہ کی تمام اضداد سے کراہت تک سب میں جو حصر ہے یعنی حصر الایمان فی محبة المومن بہ۔ جیسے پہلی مثال میں؛ یا حصر الایمان فی جذبة العمل بالمومن بہ۔

دوسری مثال میں یا حصر الایمان فی تعظیم المومن بہ۔

تیسری مثال میں یا حصر الایمان فی التسليم والرضا بالمومن بہ۔

چوتھی مثال میں حصر الایمان فی الکراهة عن جميع اضداد المومن بہ۔

پانچویں مثال میں یہ حصر اضافی ہے حقیقی نہیں۔

یعنی ان سب تعبیرات میں ان لوازمات کی اضداد سے احتراز ہے، مثال کے طور پر؛

پہلی مثال میں ایمان کو مومن بہ کی محبت میں منحصر بتانے سے مقصد یہ ہے کہ جسکے دل میں مومن بہ سے



کراہت ہوگی وہ مؤمن نہیں ہے، اُس کا اقرار باللسان تصدیق بالقلب کا دعویٰ غلط ہوگا اور ایمان کے ان دونوں ارکان کو زبان سے ظاہر کرنے کے باوجود یہ سب کچھ کالعدم ہو کر اُس پر التزام کفر کے احکام جاری ہوں گے۔

دوسری مثال میں ایمان کو جذبۃ العمل بالمؤمن بہ میں منحصر بتانے سے مقصد یہ ہے کہ جس دل میں مؤمن بہ پر عمل نہ کرنے کا جذبہ ہو یا اُس کی ضد پر عمل کرنے کا جذبہ ہو وہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتا۔

تیسری مثال میں ایمان کو تعظیم المؤمن بہ میں منحصر قرار دینے سے واحد مقصد یہی ہے کہ جس دل میں مؤمن بہ کی تعظیم موجود نہیں ہے اُس کا اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کا دعویٰ کرنا فضول ہے۔ ایسے شخص پر التزام کفر کے شرعی احکام لاگو کرنا ضروری ہے۔

چوتھی مثال میں ایمان کو مؤمن بہ کی تسلیم و رضا میں منحصر کہنے سے مراد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جس کے دل میں مؤمن بہ کے ساتھ تسلیم و رضا نہ ہو یا اُس کی ضد یا نفیض موجود ہو وہ عند اللہ مؤمن ہو سکتا ہے نہ عند الشرع مؤمن نہیں ہو سکتا۔

پانچویں مثال میں ایمان کو مؤمن بہ کی تمام اضداد سے کراہت و نفرت میں منحصر کہنے سے مراد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو شخص اقرار باللسان و تصدیق بالقلب ظاہر کرنے کے ساتھ دل میں مؤمن بہ کی ضد کے ساتھ محبت رکھتا ہے وہ مؤمن نہیں ہو سکتا، اُس کا دعویٰ ایمان کالعدم اور وہ ملتزم کفر قرار پاتا ہے یہ سب کچھ اس لیے کہ شریعت مقدسہ کی زبان میں ایمان کو ان پانچوں لوازمات میں منحصر قرار دینے کا فلسفہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ ایمان کے مذکورہ دونوں ارکان کے لازم المابہیت ہیں اور ان کے مابین مساوات کی نسبت ہے کہ جہاں پر فی الحقیقت کسی بھی مؤمن بہ کے ساتھ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب موجود ہو وہیں پر ان سب کا پایا جانا ضروری ہے۔

اسی طرح کسی بھی مؤمن بہ کے ساتھ یہ چیزیں موجود ہوں وہیں پر ایمان کے مذکورہ ارکان یعنی تصدیق بالقلب و اقرار باللسان کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ یہی حال جانب سلب کا بھی ہے کہ

جہاں پر اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کہ جس مؤمن بہ کے ساتھ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب منافی ہو وہیں پر یہ سب منافی ہوتے ہیں اور جہاں پر یہ منافی ہونہ یہ کہ یہ سب بلکہ ان میں سے ایک بھی جہاں پر منافی ہو وہیں پر ایمان کے مذکورہ ارکان بظاہر موجود ہونے کے باوجود عند اللہ وعند الرسول اور شریعت کی نگاہ میں کالعدم قرار پاتے ہیں۔ ایسے میں ایمان شرعی کے ساتھ ان کی نسبت نہ صرف مساوات فی الوجود کی قرار پاتی ہے بلکہ لازم المابہیت بھی ہے جو بین ہے جس کے بعد مؤمن وجہ بین بالمعنی الاخص "اور" بین وجہ بالمعنی الاعصم "جن کو پہچانا اہل بصیرت کے لیے یہاں پر بدیہیات کے قبیل سے ہے کیوں کہ یہ فلسفہ کے پیچیدہ مسائل میں سے تو ہے نہیں کہ صعب الفہم ہو بلکہ قرآن و سنت سے مستفاد ہونے کی بناء پر ہر سلیم الفطرت انسان کے لیے ہل الفہم ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَالَّذِينَ هُمْ كَلِمَةُ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاری کے کلمہ کو ان کا لازمہ فرمادیا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔

مرفوع حدیث کے مطابق آیت کریمہ میں مذکور ”كَلِمَةُ التَّقْوَىٰ“ سے مراد اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ پڑھنے کے ضمن میں ملت اسلام اور اُس کی جملہ ضروریات دین والے حصوں کے ساتھ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کا شرف پانا اور اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے جانے والے عہد و پیمان کی پابندی کرنا ہے جس میں سرفہرست کلمہ طیبہ پڑھنے یعنی اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کے ان لوازمات کے نفیض و اضداد سے پرہیز کرنا ہے جس وجہ سے کلمہ مقدسہ کو ”كَلِمَةُ التَّقْوَىٰ“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے کیوں کہ تقویٰ کے معنی ہیں بچنے کے، اس کو بھی اخلاص کے ساتھ ارکان ایمان پر مشتمل ہونے کی بنا پر لوازمات خمسہ ایمان لازم ہوتے ہیں جن کے واسطے سے اُن کے نفیض و اضداد سے بچنا بھی مخلصین فی الکلمہ کو لازم ہو جاتا ہے اور ایمان کے ان

لوازمات کے واسطے سے ان کے نقیض واضداد سے بچنے کی توفیق کا اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنے کو لازم ہونے کے اس مفہوم کی تائید اس کے بعد مذکور ہونے والے دونوں جملوں سے بھی ہو رہی ہے کیوں کہ لوازمات ایمان کے منافی واضداد سے بچنے کو اہل ایمان کا لازمہ قرار دینے کے بعد جملہ ”وَسَكَنُوا اَحَقَّ بِهَا“ کے ارشاد میں مومنین کو اس کے حق دار کہنے کا واضح مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ لوازمات کے منافی واضداد سے بچنے کی یہ سعادت انہیں محض اس بنا پر لازم ہو رہی ہے کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھنے میں مخلص ہیں، اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کے اظہار کرنے میں سچے ہیں اور ان کا اہل ایمان ہونا بھی برحقیقت ہے۔ اس کے بعد جملہ ”وَاَهْلُهَا“ کے ارشاد میں اہل ایمان کو لوازمات ایمان کے منافی واضداد سے بچنے کا اہل کہہ کر ان کے اس استحقاق کے رتبے کا اظہار فرمایا کہ اخلاص پر مبنی ایمان کے یہ لوازمات اُس کے ساتھ مساوی فی الوجود اور لازم الماہیت ہو نیکی باوجود رتبہ اُس سے موخر ہیں کیوں کہ یہ اُسی کے تابع ہیں اور ہر تابع اپنے اصل اور متبوع سے رتبہ موخر ہوا کرتا ہے۔

الغرض آیت کریمہ میں لوازماتِ ایمان کو اُن کے منافی و اضداد سے بچنے سمیت اہل ایمان کا لازمہ قرار دینے کا یہی فلسفہ بتایا گیا ہے کہ یہ سب کے سب حقیقی ایمان کے لیے لازم الماہیت ہیں جن کا اُس سے انفکاک و تخلف ممکن نہیں ہے، رعبۂ اُس سے موخر اور اُس کے تابع ہوتے ہوئے بھی اُس کا وجود ان کے بغیر ناممکن ہے اور اُس کا وجود آپ ہی ان کے وجود کی دلیل ہے جس کے بعد ان کا وجود کسی اور دلیل کی طرف محتاج نہیں رہتا کیوں کہ لازم الماہیت میں ہر ایک کا عدم دوسرے کے عدم پر دلیل ہونے کی طرح ہر ایک کا وجود بھی دوسرے کے وجود پر دلیل ہوا کرتا ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کا اظہارِ ایمان مبنی برِ اخلاص نہیں ہوتا اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی صورت میں ملتِ اسلام اور اُس کے ضروری حصوں کے ساتھ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کا دعویٰ واقعی امر نہیں ہوتا۔ اُسے ایمان کے ان لوازمات میں سے کوئی ایک بھی لازم نہیں ہوتا چہ جائیکہ سب کے سب لازم ہو۔ ایسے لوگوں سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَا لَهُمْ بِمُؤْمِنِينَ“ یعنی حقیقی ایمان انہیں نصیب نہیں ہے۔ (۱)

دوسرے مقام پر فرمایا،

”وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ“ (۲)

یعنی حقیقتاً ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔

بجہ حقیقی ایمان اور اخلاص کیساتھ مکملہ طیبہ پڑھنے کیلئے مذکورہ لوازمات ناگزیر ہونے سے متعلق فرمایا:

”لَا يَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيَدْخُلُهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ“ (۲)

یعنی تم نہ پاؤ گے اُن لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ محبت کریں اُن سے جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے مخالفت کی اگر چہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں یہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرمادیا اور اپنی طرف کی روح سے اُن کی مدد کی اور انہیں باغوں میں لے جایا جن کے نیچے نہریں ہیں اُن میں ہمیشہ رہیں اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ اللہ کی جماعت ہے خبردار اللہ ہی کی جماعت کا میاب ہے۔

الٰہیات سے شناسائی رکھنے والا وہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے کو اُس کی ذات، اُس کی صفات، اُس کے افعال، اُس کے اسماء اور اُس کے احکام کو حق تسلیم کرنے سے عبارت نہ جانے اسی طرح کہ بعث بعد الموت، حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ کو حق تسلیم کیا جائے۔ یہی حال اللہ کے رسول سید عالم ﷺ پر ایمان لانے کا بھی ہے کہ ذات نبوی ﷺ کو مع جملہ صفات و احکام



تسلیم کیا جائے اس مسئلہ کی فہم رکھنے والے قرآن شناس حضرات سے مخفی نہ ہونا چاہئے کہ سورۃ المجادلہ شریف کی اس آیت کریمہ کے پہلے حصہ یعنی ”لَا تَجِدُ قَوْمًا“ سے لے کر ”عَشِيرَتُهُمْ“ تک رب کریمؐ نے مندرجہ ذیل پندرہ 15 احکام کا ارشاد فرمایا:

ایسے انسان، قوم یا جماعت کے وجود کو ناپید و ناممکن قرار دیا جو اللہ تعالیٰ پر حقیقتاً ایمان رکھنے کی حالت میں اُس کے کسی مخالف و دشمن کے ساتھ بھی محبت کرے۔

ایسے انسان، قوم یا جماعت کے وجود کو ناپید و ناممکن فرمایا جو قیامت پر حقیقتاً ایمان رکھنے کی حالت میں اُس کے کسی منکر و مخالف کے ساتھ بھی محبت کرے۔

ایسے انسان، قوم یا جماعت کے وجود کو ناپید و ناممکن فرمایا جو رسول اللہ ﷺ پر حقیقتاً ایمان رکھتے ہوئے اُن کے کسی مخالف و دشمن کے ساتھ محبت کرے۔

ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں مؤمن بہ پر ایمان کو بھی اور اُس کے مخالف کے ساتھ محبت کو بھی صراحۃً ذکر فرمایا، اور دوسری قسم میں مؤمن بہ پر ایمان کو صراحۃً اور اُس کے مخالف کے ساتھ محبت کو ضمناً ذکر کیا جبکہ تیسری قسم میں مؤمن بہ کو ضمناً اور اُس کے مخالف کے ساتھ محبت کو صراحۃً ذکر فرمایا کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى“ (البقرہ، 135) کی طرح ملفوف النشر ہے جس کو علم بدیع کی زبان میں الکف والنشر الاجمالی بھی کہا جاتا ہے جو کلام کے حسن معنوی کی خاص قسم ہے جس کی حلاوت کو اہل زبان ہی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں عجیبوں کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کسی دقت کے بغیر آسانی کے ساتھ اس کے نفس مفہوم کو سمجھتے ہیں جیسا کہ اہل فہم سے مخفی نہیں ہے۔

ایسے انسان یا قوم یا جماعت کے وجود کو ناپید و ناممکن قرار دیا جو اللہ تعالیٰ پر فی الواقعہ ایمان لانے کے ساتھ اُس کے مخالف و دشمن کی بھی تعظیم کرے یہ اس لیے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کی تعظیم کو مستلزم ہے۔

ایسے انسان یا قوم یا جماعت کے وجود کو ناپید و ناممکن قرار دیا جو قیامت پر واقعی ایمان

لانے کے ساتھ اُس کے منکر و مخالف کی بھی تعظیم کرے، کیوں کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کی تعظیم کرنے کو مستلزم ہے۔

اللہ کے رسول سید عالم ﷺ پر حقیقتاً ایمان لانے کے ساتھ اُن کے مخالف یعنی دشمن رسول کی بھی تعظیم کرے۔ یہ اس لیے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کی تعظیم کرنے کو مستلزم ہے کیوں کہ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تعظیم کا ہونا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ پر فی الواقعہ ایمان لانے کے ساتھ یعنی اُس کے احکام کی حقانیت پر اقرار بالسلطان و تصدیق بالقلب کرنے کے ساتھ اُس کے مخالف و دشمن کے احکام کو بھی تسلیم کرے اور اُس پر راضی ہو یہ اس لیے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کے کردار اور اُس کے احکام کو تسلیم کرنے اور پسند کرنے کو مستلزم ہے۔

آخرت پر واقعی ایمان لانے کے ساتھ اُس کے منکر و مخالف کے احکام کو بھی تسلیم کرے اور اُس پر راضی ہو جائے۔ یہ اس لیے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کے کردار، اُس کے احکام اور اُس کی باتوں کو تسلیم کرنے اور اُن پر راضی ہونے کو مستلزم ہے کیوں کہ تقاضائے فطرت ہے کہ ”حُبُّ الشَّيْءِ يُعْبِي وَيُصْمِّ“ یعنی کسی چیز کے ساتھ محبت انسان کو اندھا و بہرا بنا دیتی ہے کہ اُس کے غلط کردار کو دیکھنے سے نابینا اور اُس کی غلط باتوں کو سننے سے بہرا ہونے کے ساتھ اُس کا ہر ناجائز کردار بھی اسے جائز نظر آنے لگتا ہے اور ہر ناجائز بات کو بھی سن سکتا ہے جسکے منحوس اثرات سے اہل ایمان کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی بھی غیر مسلم کے ساتھ موالات و مودت اور محبت کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور فرمایا:

”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ“ (۱)

یعنی مومنین کافروں کے ساتھ محبت نہ کریں۔

قربان جاؤں رب کریم کی شانِ عنایت اور اندازِ تفہیم پر کہ صرف اس امتناعی حکم پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ کسی بھی غیر مسلم کے ساتھ موالات و مودت اور محبت کرنے سے متعلق اس امتناعی حکم کے فلسفہ سے بھی آگاہ فرمایا، ارشادِ خداوندی ہے:

”وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ“ (۱)

یعنی تم میں سے جو اُن کے ساتھ محبت کریگا وہ اُن ہی میں سے ہو کر رہے گا۔

اللہ کے رسول سید عالم ﷺ پر ایمان لانے یعنی آپ ﷺ کے من عند اللہ لائے ہوئے جملہ احکام ضروریہ پر واقعی ایمان لانے کے ساتھ اُن کے کسی منکر و مخالف کی باتوں کو اور اُس کے احکام کو بھی تسلیم کرے اور اُس پر راضی ہو جائے یہ اس لیے کہ اُس کے ساتھ مودت و محبت کرنا اُس کی باتوں کو تسلیم کرنے اور اُس پر راضی ہونے کو مستلزم ہے کیوں کہ ”حُبُّ الشَّيْءِ يُعْبِي وَيُصِمُّ“ کی فطرت یہاں پر بھی متوجہ ہے ایسے میں حقیقت ایمان بالرسول کی موجودگی کا کوئی تصوری نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے یعنی اُس کے احکام کی حقانیت کا فی الواقع اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کرنے کے ساتھ اُس کے مخالف اور کسی عدو اللہ کے احکام پر بھی جذبہ عمل پایا جائے، یہ بھی اس لیے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کی باتوں پر اور اُس کی طرف سے ملنے والے احکام پر جذبہ عمل کو مستلزم ہے کیوں کہ ”حُبُّ الشَّيْءِ يُعْبِي وَيُصِمُّ“ کی فطرت یہاں پر بھی کار فرما ہے۔

یومِ آخرت کے ساتھ واقعی ایمان رکھتے ہوئے اُس کے کسی منکر و مخالف کی باتوں پر عمل کرنے کا جذبہ بھی پایا جائے اس کی بھی وہی وجہ ہے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا اُس کی باتوں کے ساتھ یا اُس کی طرف سے ملنے والے احکام پر عمل کرنے کے جذبہ کو مستلزم ہے کیوں کہ

(۱) المائدہ، 51۔

یہ اُس کے ساتھ محبت کرنے کا فطری تقاضا ہے۔

اللہ کے رسول سید عالم ﷺ پر یعنی آپ ﷺ کے من عند اللہ لائے ہوئے احکام کی حقانیت کے ساتھ فی الواقع اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کرنے کے ساتھ آپ ﷺ کے کسی دشمن کی باتوں پر عمل کرنے کا جذبہ بھی پایا جائے۔ اس کی بھی وہی وجہ ہے کہ ”حُبُّ الشَّيْءِ يُعْبِي وَيُصِمُّ“ یعنی ایسا ہونا عادتاً ممکن ہی نہیں ہے کہ دشمن رسول کے ساتھ مودت و محبت ہو اور اُس کی باتوں پر یا اُس کی طرف سے ملنے والے احکام پر عمل کرنے کا جذبہ اس محبت کے دل میں پیدا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ پر فی الحقیقت ایمان لانے کے ساتھ کسی عدو اللہ سے کراہت و نفرت نہ کرے یہ اس لیے کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا آپ ہی عدم کراہت کی دلیل ہے جس کے بعد عدم کراہت و نفرت پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کیوں کہ محبت کا تقاضا اُس کی طرف میلان، تعظیم و رضا اور پسند کرنے سے عبارت ہے جو کراہت و نفرت کی ضد ہے اور ضدین میں سے ایک کا وجود آپ ہی دوسری کے عدم پر دلیل ہے جس کے بعد کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

آخرت پر حقیقی ایمان کے ہوتے ہوئے اُس کے کسی منکر و مخالف سے کراہت و نفرت نہ کرے کیوں کہ اُس کے ساتھ محبت کرنا آپ ہی عدم کراہت کی دلیل ہے جس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی، لان و وجود احد الضدین دلیل عدم الآخر کا قضیہ بدیہیات میں سے ہے۔

اللہ کے رسول سید عالم ﷺ پر حقیقی ایمان رکھتے ہوئے اُن کے کسی منکر و مخالف سے نفرت و کراہت نہ کرے کیوں کہ دشمن رسول کے ساتھ مودت و محبت کرنا آپ ہی عدم نفرت و کراہت پر دلیل ہے جس کے بعد کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ

”وَجُودَ أَحَدِ الضَّالِّينَ عَدَمَ الْآخَرِ“ بجائے خود اجلاء بدیہیات کے قبیل سے ہے جس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

الغرض سورۃ الحجۃ شریف کی آخری آیت کے اس حصہ میں جن چیزوں کو حقیقی ایمان کے منافی قرار دے کر اُن کے ساتھ ایمان کے اجتماع کو ناپید و ناممکن ہونے کا ناقابل نسخ ارشاد جو فرمایا گیا ہے یہ محض ان پندرہ مثالوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہ حقیقی ایمان اور عند اللہ وعند الشرع معتبر و قابل قبول ایمان کی چند مثالیں ہیں۔ جن کو بیان کرنے میں آیت کریمہ سے اصل مقصد حقیقی ایمان کی پہچان کرنا ہے، التزام ایمان کا معیار بتانا ہے اور اہل ایمان کو اُس کی حقیقت کا شعور دلانا ہے کہ حقیقی ایمان کے لیے اُس کے ان پانچوں لوازمات کا ہونا ضروری ہے کہ ان کے بغیر دعویٰ ایمان فضول ہے، ناقابل قبول ہے اور محض جھوٹ ہے معیاری ایمان کا اپنے ان لوازمات کے بغیر پایا جانا غیر ممکن ہونے کی طرح ان کی ضد کے ساتھ جمع ہونا بھی ناممکن ہے۔ آیت کریمہ میں جن تین مؤمن بہ کے لوازمات کے بغیر اور اُن کی اضداد کے ساتھ معیاری ایمان کے اجتماع کو ناپید و ناممکن قرار دیا گیا ہے اس سے ایمان کے ان لوازمات کا لازم بننا ہونا معلوم ہونے کی طرح ہر مؤمن بہ کے ساتھ حقیقی ایمان کے لیے ان کا لازم بننا ہونا بھی معلوم ہو رہا ہے۔ آیت کریمہ کی عبارت النص کے ان حصوں کو سمجھنے کے بعد ایمان کے لوازمات خمسہ کا اس آیت کریمہ کے مدلول ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ یہاں پر ان کا اجتماعی طور پر آیت کریمہ سے ثابت ہونے کے علاوہ انفرادی طور پر اور متعدد نصوص سے بھی ثابت ہیں جن کے حوالہ جات گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

مؤمن بہ کے ساتھ محبت کا لازم ایمان ہونے سے متعلق فرمایا:

”قُلْ إِنْ كُنْ أَسَاءُكُمْ وَآبَاءُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الْفَاسِقِينَ“ (۱)

مؤمن بہ کی تعظیم کا لازم ایمان ہونے سے متعلق فرمایا:

”وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ“ (۲)

قرآن شناس حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ دل کا تقویٰ ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کی پہچان کے لیے اس آیت کریمہ میں شعائر اللہ کی تعظیم کو یقینی علامت قرار دیا گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ ضروریات دین کی فہرست میں موجود ہر مؤمن بہ شعائر اللہ کے قبیل سے ہے۔

مؤمن بہ کو تسلیم کرنا اور اُس پر راضی ہونا لازم ایمان ہونے سے متعلق فرمایا:

”فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجْعَلُوا فِي

أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا“ (۳)

مؤمن بہ کے ساتھ جذبہ عمل کا لازم ایمان ہونے پر سب سے آسان اور سب سے زیادہ واضح دلیل آیت کریمہ ”اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ ہے جس کا حاصل مفہوم اور ماہوا المقصود اہل ایمان کا ہر دم اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق کا سوال کرنا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ صراط مستقیم کا مفہوم ملت اسلام کو بالا جمال شامل ہونے کی طرح جملہ ضروریات دین کو بھی بالشفصیل شامل ہے۔ جیسے ایمان مجمل اور ایمان مفصل میں ہوتا ہے جس کے مطابق ہر ضرورت دینی، ہر مؤمن بہ اور شریعت مقدسہ کا ہر حکم صراط مستقیم کہلاتا ہے جس پر چلنے سے مقصد اُس پر عمل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں آیت کریمہ دو باتوں پر واضح دلالت کر رہی ہے جن میں سے ایک اہل ایمان کا اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر عمل کرنے کی توفیق کا سوال ہے جو اس کی عبارت النص ہے اور دوسری بات اس سوال کے لیے اُن کے دلوں میں موجود جذبہ عمل کی موجودگی ہے جو توفیق عمل کا سوال کرنے کے لیے علتِ باعث و محرک ہے اور یہ آیت کریمہ کا

مدلول اقتضائی ہے یعنی اقتضاء انص کے طور پر مفہوم ہو رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ جب تک کسی عمل کے لیے جذبہ دل میں موجود نہ ہو اُس وقت تک اُس کی توفیق کا سوال نہیں کیا جاسکتا۔

مؤمن بہ کی ضد نفیض اور اُس کے ہر منافی کردار سے نفرت و کراہت کا لازمہ ایمان ہونے کے ساتھ محبت کا بھی لازمہ ایمان ہونے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبِّبٌ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ“ (۱)

لوازمات خمسہ ایمان کا قرآن شریف کی ان متعدد آیات سے ثابت ہونے کی طرح متعدد احادیث طیبہ سے بھی ثابت ہیں لیکن قرآن شریف کی ان قطعی الثبوت والدلائل کے بعد افادہ ظن پر مشتمل ہونے والے اخبار آحاد کی طویل فہرست کھولنے کی کوئی تک ہی نہیں رہتی۔

ایک ضروری وضاحت اور تنبیہ:-

لوازمات خمسہ ایمان کے ثبوت پر مشتمل جن نصوص میں مخصوص مؤمن بہ کا ذکر آیا ہے انہیں دیکھ کر بعض حضرات کو تخصیص کا مغالطہ لگتا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث شریف ”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ“ میں اپنے والدین اور بچوں اور تمام انسانوں سے زیادہ محبت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہونے کو لازمہ ایمان قرار دیا گیا ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دعویٰ ایمان سچا نہیں ہے۔ یہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ ہر ضرورت دینی کے ساتھ ایمان کا یہی حال ہے کہ اُس کے مؤمن بہ کو یہ سب کے سب لازم ہوتے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ ایمان کے ان لوازمات کے ثبوت پر مشتمل نصوص میں بطور مثال ان پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اکتفاء باصل افراد الہی کے قبیل سے ہے۔ مثلاً سورۃ التوبہ، آیت نمبر 24

(۱) الحجرات، 7۔

میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت کو سب سے مقدم، سب سے اہم اور سب سے زیادہ ہونے کو جو لازم قرار دیا گیا ہے اُس کا فلسفہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ ایمان کے اصل الاصول ہیں، بنیاد ایمان ہیں اور ضرورت دین کے حوالہ سے ہر مؤمن بہ کی اصل اور سب کے لیے موقوف علیہ ہیں۔ یہ اس لیے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی ذات نہ ہو اُس کے رسول ہوگا نہ اُس کا تصور، اسی طرح جب تک رسول اللہ ﷺ اور اُن کی رسالت پر ایمان نہ ہوگا اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی درست پہچان ممکن ہوگی نہ اُس کی ذات، صفات، افعال و اسماء اور احکام پر ایمان کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات و صفات کا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے وجود پر موقوف ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے لے کر احکام تک کی درست پہچان رسول اللہ ﷺ کی ذات و صفات اور وصف رسالت کی حقانیت پر ایمان لانے پر موقوف ہے، ایسے میں ذات اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ، اسماء اللہ اور احکام اللہ کو ضروریات دین کے زمرہ میں اصل الاصول نہ کہنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔

یہی حال ذات نبوی ﷺ من حیث الرسول کو بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ اصل الایمانیات اور تمام ضروریات دین و مؤمن بہ کے زمرہ میں سب سے اہم، سب سے مقدم اور سب کی بنیاد سمجھنا عین متفقنا فطرت ہے۔ اس فلسفہ کی روشنی میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر بالفرض ضروریات دین کی طویل فہرست میں سے مؤمن بہ کے طور پر کسی اور کا ذکر نہیں کیا گیا ہوتا پھر بھی ان دو کے واسطے سے اُن سب کو سمجھا جاتا، ان کی پہچان اُن کے لیے کافی ہوتی کیوں کہ وہ سب کے سب ان ہی کے فروع و ثمرات ہیں لیکن رب کریم کے بے شمار کرم ہیں۔ کہ اکثر مقامات پر ان دو کو بطور اصل الاصول ذکر کرنے کے ساتھ بعض مقامات پر دوسرے ضروریات دین کو بھی مؤمن بہ کے طور پر ذکر فرمایا اور بعض مقامات پر ایک ہی لفظ میں سب کو اکٹھا کر کے اُن سب کی اہمیت کا اشارہ دیا۔ جیسے ”اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ (الفاتحہ، 5) کے اندر لفظ ”الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ تمام ضروریات دین کو شامل ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں مذکور ”شَعَائِرَ اللَّهِ“ (الحج، 32) کا لفظ سلسلہ ایمانیات کے ایک ایک مؤمن بہ

لوشال ہے۔

لوازمات خمسہ پر عقلی دلائل :- شعبہ ایمانیات کا کوئی زاویہ ایسا نہیں ہے جو نصوص شرعیہ سے ثابت ہونے کے ساتھ عقلی دلیل سے بھی ممکن الفہم نہ ہو جس کو سمجھنے کے لیے حتی المقدور تہذیب و تمدن کی ضرورت ہے یہ اس لیے کہ ادراک عقل کی نوعیت ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی بلکہ بعض مومن بہ سے متعلقہ ایمانیات کا ادراک از قبیل بدیہیات اور بعض کا از قبیل نظریات ہوتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے لوازمات خمسہ کا ادراک بھی نظروں کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لازمہ محبت کے بغیر وجود ایمان کے ناممکن ہونے پر اس طرح کا عقلی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ:

لَوْ اَمَكَنَّ وُجُودُ الْاِيْمَانِ بِذُوْنِ مُحَبَّةٍ الْمُؤْمِنُ بِهِ.

لَا مَكْنَ اِجْتِمَاعُ النَّقِيضِيْنَ اَعْنٰى تَسْلِيْمُ الشَّيْءِ وَعَدَمُ تَسْلِيْمِهِ لَكِنْ اِجْتِمَاعُ النَّقِيضِيْنَ لَا يُمَكِّنُ.

فَوُجُودُ الْاِيْمَانِ بِذُوْنِ مُحَبَّةٍ الْمُؤْمِنُ بِهِ لَا يُمَكِّنُ.

یعنی ایمان کا وجود مومن بہ کے ساتھ محبت کے بغیر اگر ممکن ہو تو بالیقین اجتماع نقیضین بھی ممکن ہوگا جو یہاں پر مومن بہ کو تسلیم کرنے اور نہ کرنے سے عبارت ہے لیکن اجتماع نقیضین ممکن نہیں ہے تو پھر ایمان کا وجود بھی مومن بہ کی محبت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ ایمان کے دونوں ارکان یعنی مومن بہ کے ساتھ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کا مجموعہ اُسے تسلیم کرنے سے عبارت ہے اس کے ساتھ اگر محبت نہ ہو تو پھر کراہت و نفرت کا ہونا ممکن ہے اور کراہت و نفرت عدم تسلیم سے عبارت ہے ایسے میں مومن بہ کی محبت کے بغیر وہ ممکن تسلیم ہونے کی طرح کراہت و نفرت کے ساتھ عدم تسلیم بھی ہے جس کا حاصل ایک ہی چیز کا ایک ہی وقت میں، ایک ہی جہت سے ممکن و ناممکن ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو خلاف عقل و محال ہے۔ لازمہ تعظیم کے بغیر کسی مومن بہ پر ایمان کی موجودگی ناممکن ہونے کا عقلی ثبوت بھی اسی

طرح دیا جاسکتا ہے کہ:

لَوْ اَمَكَنَّ وُجُودُ الْاِيْمَانِ بِذُوْنِ تَعْظِيْمٍ الْمُؤْمِنُ بِهِ.

لَا مَكْنَ اِجْتِمَاعُ النَّقِيضِيْنَ اَعْنٰى تَسْلِيْمُ الْمُؤْمِنُ بِهِ.

وَعَدَمُ تَسْلِيْمِهِ لَكِنْ اِجْتِمَاعُ النَّقِيضِيْنَ لَا يُمَكِّنُ.

فَاِمَكَنَّ وُجُودُ الْاِيْمَانِ بِذُوْنِ تَعْظِيْمٍ الْمُؤْمِنُ بِهِ لَا يُمَكِّنُ.

اس کی تشریح بھی سابقہ کی طرح ہے جس کی فہم میں کوئی مشکل نہیں ہے اور خالصتاً مقتضاء عقل ہونے کی وجہ سے ہر عقلمند معمولی غور و فکر سے اس پر یقین حاصل کر سکتا ہے ہاں البتہ اپنی قوت فکری اور حرکت عقل کی صلاحیتوں کو عمل میں لانے سے فراری حضرات کی دنیا ہی جدا ہے جن سے ان حقائق کو سمجھنے کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔

یہی حال لازمہ جذبہ عمل کے بغیر کسی مومن بہ پر ایمان کی موجودگی ناممکن ہونے کا بھی ہے کہ:

لَوْ اَمَكَنَّ وُجُودُ الْاِيْمَانِ بِذُوْنِ جَذْبَةِ الْعَمَلِ بِالْمُؤْمِنُ بِهِ.

لَا مَكْنَ طَلَبُ الْاِيْمَانِ بِهِ بِذُوْنِ الْعَمَلِ بِهِ.

لَكِنْ لَا يُمَكِّنُ طَلَبُ الْاِيْمَانِ بِهِ بِذُوْنِ الْعَمَلِ بِهِ.

فَلَا يُمَكِّنُ وُجُودُ الْاِيْمَانِ بِذُوْنِ جَذْبَةِ الْعَمَلِ بِالْمُؤْمِنُ بِهِ.

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قال اللہ وقال الرسول سے قطع نظر محض دنیائے عقل کی روشنی میں دیکھنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ جہاں پر بھی کوئی بالا دست اپنے زیر دست سے کسی بات کو تسلیم کرانے کا مطالبہ کرتا ہے وہیں پر اُس کا مقصد اُس پر عمل کرانا ہوتا ہے ورنہ بغیر عمل محض زبانی تصدیق و اقرار کی اُس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ شریعت مقدسہ کے اوامر و احکام بھی مقتضائے فطرت کے اس فلسفہ کے عین مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پر جذبہ عمل کے بغیر محض زبانی طور پر اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کا اظہار ہوتا ہے اُسے کالعدم قرار دیا گیا ہے، غیر ممکن الوجود کہا گیا ہے اور اُس کے وجود لسانی کو

وجود واقعی کے منافی بتایا گیا ہے، جیسے آیت کریمہ ”وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ“ (البقرہ، 8)، ”وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُتَفِيقِينَ لَكَاذِبُونَ“ (المرافقون، 1) جیسے نصوص سے ہو رہا ہے۔

یہی حال ایمان کے تسلیم و رضا والا لازمہ کا بھی ہے کہ اس کے بغیر بھی ایمان کا وجود عند اللہ ہو سکتا ہے نہ عند الشرع اس پر عقلی دلیل اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ:

لَوْ أَمَكُنَّ وَجُودُ الْإِيمَانِ بِدُونِ الرِّضَا بِالْمُؤْمِنِ بِهِ.

لَأَمَكُنَّ وَجُودُ الشَّيْءِ بِدُونِ سَبَبِهِ الْخَاصِ.

لَكِنَّ وَجُودَ الشَّيْءِ بِدُونِ سَبَبِهِ الْخَاصِ لَا يُمَكِّنُ فَوْجُودُ الْإِيمَانِ بِدُونِ الرِّضَا بِالْمُؤْمِنِ بِهِ لَا يُمَكِّنُ.

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ شریعت مقدسہ سے قطع نظر بھی محض دنیاۓ عقل کے معروضی حالات ایسے ہیں کہ جب تک کسی چیز کو اپنانے میں انسان کی رضامندی نہ ہو اس وقت تک اسے قبول نہیں کرتا کیوں کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ کسی بھی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے اس پر راضی ہونا خاص سبب ہے اور اپنے خاص سبب کے بغیر کسی شے کا وجود میں آنے یعنی اسے تسلیم کیا جانا اور قبول کیا جانا عادتاً محال ہے کہ کسی جبر و اکراہ کے بغیر حالت اختیار میں ایسی چیز کو تسلیم کرے جس میں اس کی رضامندی نہ ہو۔ اصول فطرت کے اس کلیہ میں مؤمن بہ کے ساتھ رضامندی کے بغیر ایمان کا وجود ناممکن ہونا بھی شامل ہے۔ مؤمن بہ کے منافی اور اس کی جملہ اضداد سے کراہت و نفرت کا لازمہ ایمان ہونے پر عقلی استدلال اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ:

لَوْ أَمَكُنَّ وَجُودُ الْإِيمَانِ بِدُونِ الْكَرَاهَةِ عَنْ جَمِيعِ أَضْدَادِ الْمُؤْمِنِ بِهِ لَأَمَكُنَّ الْجَمْعُ بَيْنَ الضِّدَّيْنِ.

لَكِنَّ الْجَمْعَ بَيْنَ الضِّدَّيْنِ لَا يُمَكِّنُ.

فَوْجُودُ الْإِيمَانِ بِدُونِ الْكَرَاهَةِ عَنْ جَمِيعِ أَضْدَادِ الْمُؤْمِنِ بِهِ لَا يُمَكِّنُ.

اس کی توضیح اس طرح ہے کہ ایمان کی بھی مؤمن بہ کو دل و جان سے تعلیم کرنے سے عبارت ہے جسکے لیے محرک اور خاص سبب اس کے ساتھ رضامندی ہے یعنی رضامندی کی صورت میں اسے تسلیم کرنا عادتاً ضروری ہے کیوں کہ اپنے خاص سبب کے موجود ہونے پر شے کے موجود کی عمومی عادت پر پوری دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ نیز ضدین کا اجتماع محال ہے، نیز محبت و کراہت باہمی ضدین ہیں۔ جن میں سے ایک کا وجود آپ ہی دوسرے کے عدم پر دلیل ہے۔

ایسے میں کسی مؤمن بہ یعنی کسی ضرورت دینی کو تسلیم کرنا یعنی اس پر ایمان لانا آپ ہی دو چیزوں کے وجود پر دلالت کرتا ہے جن میں سے ایک اس کے ساتھ محبت کرنا ہے اور دوسری چیز اس کی تمام اضداد سے کراہت و نفرت کرنا ہے لیکن قضیہ مفروضہ کی شکل میں بداهت عقل کے اس مقتضاء سے برعکس مؤمن بہ کی تمام اضداد سے کراہت کے بغیر ایمان کے وجود کو ممکن کہا جائے تو اس کا نتیجہ اجتماع ضدین کے ممکن ہونے کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ بیک وقت مؤمن بہ کو تسلیم کرنا بھی ممکن ہو اور اس کی ضد کو تسلیم کرنا بھی ممکن ہو اور اس کے ساتھ محبت کرنا بھی ممکن ہو اور کراہت کرنا بھی ممکن ہو۔ قرآن و سنت سے قطع نظر ہر عقل مند سمجھتا ہے کہ اجتماع الضدین ممکن نہیں ہے تو پھر مؤمن بہ کی تمام اضداد کے ساتھ کراہت کے بغیر ایمان و تسلیم کے ممکن الوجود ہونے کا عند العقل کوئی جواز نہیں رہتا۔ شاید مقتضائے عقل کی اس بداهت کی طرف آیت کریمہ ”مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْهِ جَوْهَرٌ“ (الاحزاب، 4) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یعنی کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو دل پیدا کیے ہوں جو بیک وقت ایک میں محبت دوسرے میں کراہت اور ایک میں ایک چیز کو ماننا دوسرے میں اس کی ضد کو ماننا ممکن ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ التزام ایمان کا ان چیزوں کو مقتضی ہونا جو حتمی اور ناقابل انکار ہے لازم و ملزوم ہونے کا ہی نتیجہ ہے اور عین مقتضائے عقل ہے جس پر بتنا غور و فکر کیا جائے گا اسی شرح تناسب سے

شرح صدر کی توفیق بھی میسر ہو سکتی ہے۔ لوازمات خمسہ ایمان کے ثبوت عقلی کے سلسلہ میں قیاس استثنائی اتصالی کی ان صورتوں کے علاوہ قیاس اقترانی کی شکل اول سے بھی ان سب کو ثابت کیا جاسکتا ہے جو بین الانتاج ہونے کی بناء پر ہر صاحب فکر و نظر شخص کے لیے سہل الفہم ہے۔ مثال کے طور پر لازمہ محبت کے ثبوت کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ:

مدعی:- الْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ مُحَبَّةِ الْمُؤْمِنِ بِهِ.

صغریٰ:- لِأَنَّهُ مُفْتَضِي الْمَحَبَّةِ.

کبریٰ:- وَلَا شَيْءَ مِنَ الْمُفْتَضَى يُوجَدُ بِدُونِ مُفْتَضِيهِ

نتیجہ:- فَالْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ مُحَبَّةِ الْمُؤْمِنِ بِهِ.

اس کی توضیح یہ ہے کہ ایمان یعنی مؤمن بہ کو تسلیم کرنے اور اُس کے لازمہ محبت، لازمہ تعظیم اور لازمہ رضا ان تینوں کی لزوم والی حیثیت کے علاوہ ایمان کے ساتھ مناسبت کے حوالہ سے بھی کچھ حیثیات قابل فہم ہیں:

پہلی حیثیت:- یہ تینوں ایمان بمعنی تسلیم کی طرف مُفَضِّی اور اُس کے مُفْتَضِی ہیں۔

دوسری حیثیت:- یہ تینوں ایمان لانے کے اسباب ہیں کہ مؤمن بہ کے ساتھ محبت اُس کی تعظیم و رضا کے موجب اور اُس کے لیے محرک و سبب قرار پانے کے بعد ہی ایمان لانے کی توفیق میسر ہوتی ہے جس کے مطابق محبت کو سبب اول اور سبب بعید بھی کہا جاسکتا ہے جبکہ تعظیم و رضا مرتبہ اُس سے مؤخر ہونے کی بنا پر سبب قریب کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔

تیسری حیثیت:- یہ تینوں ذی علامت ہیں جبکہ ایمان بمعنی مجموعہ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب یعنی تسلیم کرنا ان تینوں کی یکساں علامت ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ان تینوں کی لزوم والی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ تینوں حیثیات میں سے ہر ایک کو جدا وسط قرار دے کر قیاس اقترانی کی شکل اول بنائی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر لازمہ

تعظیم کے ثبوت کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ:

مدعی:- الْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ تَعْظِيمِ الْمُؤْمِنِ بِهِ.

صغریٰ:- لِأَنَّهُ عِلَامَةُ التَّعْظِيمِ.

کبریٰ:- وَلَا شَيْءَ مِنَ عِلَامَةِ التَّعْظِيمِ يُوجَدُ بِدُونِ ذِي الْعِلَامَةِ.

نتیجہ:- فَالْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ الرِّضَا بِالْمُؤْمِنِ بِهِ.

لازمہ جذبہ عمل بالمؤمن بہ کو ثابت کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ:

مدعی:- الْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ جَذْبَةِ الْعَمَلِ بِالْمُؤْمِنِ بِهِ.

صغریٰ:- لِأَنَّهُ مَطْلُوبٌ مَعَ جَذْبَةِ الْعَمَلِ.

کبریٰ:- وَلَا شَيْءَ مِنَ الْمَطْلُوبِ مَعَ جَذْبَةِ الْعَمَلِ يُوجَدُ بِدُونِ جَذْبَةِ الْعَمَلِ.

نتیجہ:- فَالْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ جَذْبَةِ الْعَمَلِ بِالْمُؤْمِنِ بِهِ.

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ قرآن و سنت سے قطع نظر محض عقل کی دنیا میں آمر، مامور اور مامور بہ کے حوالہ سے دیکھا جائے تو جس کسی کو بھی کسی کام سے متعلق امر کیا جاتا ہے یعنی مامور بہ کو وجود میں لانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہیں پر ہمیشہ اُس کے مطابق عمل کرنا ہی مقصود ہوتا ہے چاہے یہ عمل ظاہر کا ہو یا باطن کا یعنی جوارح کا عمل ہو یا دل کا اور ظاہر ہے کہ ہر عمل سے قبل اُس کے متعلق جذبہ، شوق اور میلان قلب کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے ورنہ مطلوبہ عمل ہرگز وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔ ایسے میں ایمان مطلوب مع جذبہ العمل نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ مؤمن بہ کی ضد سے کراہت کو محض تقاضائے عقل سے لازمہ ایمان ثابت کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ:

مدعی:- الْإِيمَانُ لَا يُوجَدُ بِدُونِ كَرَاهَتِ ضِدِّ الْمُؤْمِنِ بِهِ.

صغریٰ:- لِأَنَّهُ يَدُلُّ عَلَيْهَا الْإِيزَامُ.

کبریٰ:- وَلَا شَيْءَ مِنَ الدَّالِّ الْإِيزَامِيِّ يُوجَدُ بِدُونِ الْمَذْلُولِ الْإِيزَامِيِّ.

نتیجہ۔ فالایمان لا یوجد بدون کراهت ضد المؤمن بہ۔

الغرض ایمان کا کوئی شعبہ اور التزام ایمان کی کوئی قسم یا لوازمات خمسہ ایمان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو خلاف عقل ہو البتہ بجاہت عقل سے ماوراء ہونے کی بناء پر اس تک انسانوں کی رسائی فہم توجہ طلب ضرور ہے۔ جس کے لیے درس نظامی کے فنون سمجھ کر پڑھنے کے بعد فکر عملی میں انہیں پیش نظر رکھنے کے سوا کسی اور چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم توفیق الہی کے بغیر یہ کہ نہیں ہو سکتا۔ (اللہم وفق لنا لما تحب وترضی)

☆☆☆☆☆

سورة بقرہ، آیت 184، 185 کی تفسیر

میرا سوال یہ ہے کہ مدارج العرفان فی مناجح کنز الایمان میں سورة البقرہ، آیت نمبر 184 تا 185 کے تراجم کے مابین تقابلی جائزہ جو پیش کیا گیا ہے اس میں آیت نمبر 185 کے حصہ ”وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ کو اس سے ما قبل مذکور ہونے والی سات چیزوں کا فلسفہ اور ان کا مفاد قرار دیتے ہوئے ایک حکم کو دو بتایا گیا ہے کیوں کہ آیت نمبر 184 میں ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کو تیسرے نمبر پر ذکر کرنے کے بعد آیت نمبر 185 میں ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کو ساتویں نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ یہاں پر ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ پہلے والی سے مختلف نہیں ہے جس وجہ سے مفسرین کرام نے بھی دوسری کو پہلی کے لیے تاکید کہا ہے۔ ایسے میں آیت کریمہ ”وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ جن چیزوں کا مفاد قرار پارہی ہے ان کی تعداد چھ سے زیادہ نہیں ہے، مہربانی کر کے اس کی وضاحت کریں۔

اس سوال کی ضرورت اس لیے محسوس کی جا رہی ہے کہ قرآن شریف کے تراجم کا جو تقابلی جائزہ مدارج العرفان کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے اس کی افادیت کے پیش نظر ہر شخص اس کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے اور ہر سال بعد اس قسطوں کا مجموعہ کتابی شکل اختیار کر لیتا ہے اس سے مستفیض ہونے والے علماء کرام کی ایک ایک چیز پر نظر ہوتی ہے اور جانبداری و تعصب سے پاک ہونے کی وجہ سے ہر مسلک کے علماء اس کو شوق سے پڑھتے ہیں اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ جو کمزوری نظر آ جائے اس سے ادارے کو آگاہ کریں تاکہ بروقت ان کمزوریوں کا ازالہ کیا جائے ورنہ کتابی شکل میں مارکیٹ میں آنے کے بعد اس

کا افادہ متاثر ہو سکتا ہے جس کو ہمارے جیسے مخلص قارئین گوارا نہیں کرتے۔

السائل..... قاری محمد انور بیگ، خطیب جامع مسجد سنہری روڈ پشاور

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشتباہ مذکورہ دونوں مقامات کو ایک سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے کیوں کہ آیت نمبر 184 میں جو ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ ہے اس میں لفظ ”مَنْ“ سے مراد وہ مریض و مسافر ہیں جو پہلے سے مسلمان اور مسلم معاشرہ کے افراد میں سے ہیں جیسے لفظ ”مِنْكُمْ“ سے مفہوم ہو رہا ہے جبکہ آیت نمبر 185 میں ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ ہے اس میں لفظ ”مَنْ“ سے مراد عام ہے جو پہلے سے مسلمان اور مسلم معاشرہ کے مریض و مسافر افراد کو شامل ہونے کے ساتھ ان نو مسلموں کو بھی شامل ہے جو پہلے سے غیر مسلم تھے لیکن حالت مرض میں یا حال سفر میں ابھی انہیں توفیق ایمان نصیب ہو رہی ہے گویا مصداق کے اعتبار سے عموم و خصوص کی یہ تفریق ان دونوں مقامات کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے کافی ہے اور تفریق کے اس مفہوم پر سب سے بڑی دلیل ان مقامات کے انداز بیان کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے کہ اول میں کلمہ ”مَنْ“ لا کر قضا کی سہولت پانے والوں کو مسلم معاشرہ کے افراد میں سے ہونے کی تخصیص فرمادی کہ وہ پہلے سے مسلمان ہیں اس لیے کہ لفظ ”مَنْ“ کا مدخل یعنی ”کَمْ“ جو مجرور متصل ہے اس کے ساتھ مخاطب مسلم معاشرہ کے افراد اور پہلے مسلمان کہلانے والے سعادت مندوں کے سوا کوئی اور نہیں ہے جبکہ دوسرے مقام پر اس قید کے بغیر ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کے انداز میں ہے یہاں پر جس مریض و مسافر کو قضا کی سہولت دی گئی ہے وہ اپنے عموم و اطلاق کی بناء پر ان دونوں قسموں کو شامل ہونے کے سوا کوئی اور مفہوم نہیں رکھتا گویا لفظ ”مِنْكُمْ“ کی قید و تخصیص سے مطلق مقام یعنی آیت نمبر 185 میں مذکور ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ دو حیثیتوں کا حامل ہے؛

پہلی حیثیت:- اس کے مصداق کا عموم و اطلاق ہے کہ پہلے سے مسلم اور مسلمانوں کے معاشرہ کے

افراد سے لے کر ان نو مسلموں کو بھی شامل ہے جو حال سفر یا حال مرض میں ایمان لا کر مسلمانوں میں شامل ہو رہے ہیں اس حیثیت سے یہ من وجہ ماقبل کے لیے تاکید ہے اور من وجہ تائیس ہے کہ آیت نمبر 183 کے مصداق سے اضافی افراد کو بھی شامل ہو رہی ہے۔

دوسری حیثیت:- اس میں ان نو مسلموں کے حوالہ سے روزے کے احکام بتائے گئے ہیں جو ماہ رمضان کے اندر حالت سفر یا حالت مرض میں ایمان لا کر اسلام کے مندرجات پر عمل کرنے کا التزام کرتے ہیں کہ ”فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کے احکام ان پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ پہلے سے مسلمانوں پر صیام رمضان کے وجوب ادا اور ماہ صیام کے اندر حالت مرض یا حالت سفر میں مسلمانوں ہونے والوں پر وجوب ادا کے اسباب میں فرق ہے کہ پہلے سے مسلمانوں پر واجب الادا ہونے کے لیے سبب ماہ رمضان کی آمد ہے یعنی ماہ صیام کا چاند دیکھنے کے بعد پورے مہینہ روزہ رکھنے کا التزام کیا جاتا ہے جس کے بعد عارضہ سفر یا لاحقہ مرض کے حرج سے بچنے کے لیے ”فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے جبکہ نو مسلموں پر واجب الادا ہونے کے لیے سبب ان کا اسلام لانا ہے کہ جوں ہی ایمان لایا اسی وقت جملہ احکام اسلام کی طرح صیام رمضان کی ادائیگی کے بھی پابند ہو گیا۔ مثال کے طور پر ماہ رمضان کی 14 تاریخ کو ایمان لایا تو شروع سے اب تک کے 14 دنوں کا جو ادانہ ہونے کی وجہ سے وجوب قضا بھی نہیں ہے اور باقی دنوں کا روزہ اس پر واجب الادا ہو گیا جس کے بعد عارضہ سفر و مرض کے حرج سے بچنے کے لیے ”فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کا وجوب لوگوں کو ہو جاتا ہے۔

صیام رمضان کے حوالہ سے مسلم اور نو مسلم کا تفصیلی فرق:-

پہلے سے مسلمان پر ماہ رمضان کے آغاز سے ہی واجب الادا ہو جاتا ہے جبکہ ماہ رمضان المبارک کے اندر مسلمان ہونے والے پر بعد والے تمام دنوں کا روزہ واجب الادا ہو جاتا ہے اور اس سے قبل کا کوئی تصور نہیں ہے۔

پہلے سے مسلمان پر واجب الادا ہونے کے لیے سبب ماہ رمضان شریف کی آمد ہے جبکہ نو

مسلم پر واجب الادا ہونے کے لیے سبب اُس کا اسلام ہے۔

نومسلم سے ماہ رمضان کے جتنے دن بھی اسلام لانے سے قتل کے گزرے ہیں اُن کی قضا واجب نہیں ہے کیوں کہ اسلام لانے سے قبل اُس پر وجوب ادا نہیں تھا تو وجوب قضا کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ وجوب قضا فرع ہے وجوب ادا کی جب اصل نہیں ہے تو پھر فرع کیوں ہو جبکہ پہلے سے مسلمان پر رمضان کے اول سے آخر تک تمام دنوں کے روزے واجب الادا ہیں جس وجہ سے لاحقہ مرض و سفر کی وجہ سے جتنے دنوں کا روزہ کھائے گا اُن سب کی قضا رکھنا بھی واجب ہے۔ اس کے علاوہ لاحقہ مرض یا عارضہ سفر کے حرج سے بچنے کے لیے قضا کی سہولت سے فائدہ اٹھانے میں پہلے سے مسلمان اور نومسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں مسلم اور نومسلم کی اس تفصیل کا فطری تقاضا یہی تھا کہ صیام رمضان کے حوالہ سے مسلم مریض مسافر کو دی گئی سہولت کو آیت نمبر 184 میں ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کی صورت میں بیان کرنے کے بعد نومسلم کو دی گئی اس سہولت کو بھی مستقل الفاظ میں بیان کیا جاتا۔ قرآن شریف کا کتاب فطرت ہونے کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ ایسے میں آیت نمبر 185 کے آخری حصہ ”وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ کو اس سے قبل آیت نمبر 183 تا 185 تک بیان ہونے والی سات چیزوں کا مفاد اور اُن سب کا فلسفہ کہنا عین حقیقت ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

غلط فہمی کا منشاء اور وضاحت دروضاحت :-

مذکورہ اشتباہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ آیت نمبر 184 میں مذکورہ الفاظ ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ اور اس کے بعد آیت نمبر 185 میں مذکورہ الفاظ ”وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کے مفہوم کو ایک سمجھا گیا ہے، دوسرے کو اول کے لیے تاکید تصور کیا گیا ہے اور دونوں میں مذکور لفظ ”مَنْ“ کے مصداق کو دونوں جگہوں میں پہلے سے

مسلم کے ساتھ مختص سمجھنے کی غلطی کی گئی ہے ورنہ اس اشتباہ کی گنجائش نہیں تھی گویا اشتباہ کی اس غلط فہمی کا اصل منشاء دونوں آیتوں کے مصداق واحد کام کو ایک سمجھنے کی غلطی ہے جس وجہ سے اس اشتباہ کو بناء الغلط علی الغلط کہا جائے تو بے مصرف نہیں ہوگا اس لیے کہ غلط بنیاد کا نتیجہ ہمیشہ غلط ہی ہوتا ہے۔

خشیت اول چوں نہد معمار کج نائریا میرود دیوار کج
باقی رہا یہ سوال کہ آیات کریمہ کے مذکورہ دونوں مقامات اور دونوں الفاظ کے مصداق و مفہوم کو ایک سمجھنے کی غلطی پر کیا دلیل ہے؟

تو اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ صیام رمضان کے حوالہ سے قرآن شریف کے ان دونوں مقامات کے مفہوم کو ایک سمجھنا دو وجہ سے نامناسب ہے؛

پہلی وجہ :- یہ انداز فہم ان دونوں مقامات کے الفاظ کے منافی ہے کیوں کہ پہلے مقام کے الفاظ میں ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ“ ہے اور پہلے سے خطاب بھی سابق الایمان مسلمانوں کے ساتھ ہے جیسے سیاق و سباق سے مفہوم ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہاں پر لفظ ”مِنْكُمْ“ کا مصداق بھی سابق الایمان مسلمانوں کے سوا کوئی اور نہیں ہے اس کے بعد دوسرے مقام یعنی آیت نمبر 185 میں لفظ ”مِنْكُمْ“ کے بغیر ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ“ کا انداز عموم و اطلاق کا ہے جو سابق الایمان مسلموں کے ساتھ نومسلموں کو بھی شامل ہے۔ کلام کے ان دونوں مقام کے الفاظ و انداز بیان سے بالترتیب خصوص و عموم کا فرق واضح ہونے کے باوجود دونوں کے مفہوم کو ایک کہہ کر دوسرے کو پہلے کے لیے محض تاکید قرار دینے کا کیا جواز ہے؟

دوسری وجہ :- اس تصور کی بنا پر دوسرا مقام پہلے کے لیے تاکید کے سوا کسی اور اضافی فائدہ پر مشتمل نہیں ہوتا جبکہ دوسرے مقام کو اُس کے الفاظ کے مطابق علم رکھنے اور مسلم و نومسلم دونوں کو شامل رکھنے میں نہ صرف تاکید بلکہ تائیس بھی حاصل ہوتی ہے اور علم بلاغت کا مسلمہ اصول ہے کہ تاکید کے مقابلہ میں ہمیشہ تائیس کو ترجیح ہوتی ہے۔ مطول علی التلخیص میں ہے؛

”التأسيس خیر من التاكيد لان حمل الكلام على الافادة خیر من حملة على الاعادة“ (۱)

جس کا مقبوض یہ ہے کہ علمِ بلاغت میں تائیس ہمیشہ تاکید سے بہتر ہوتی ہے کیوں کہ اس کلام کو اضافی فائدہ پر حمل کیا جاتا ہے اور اضافی فائدہ پر حمل کرنا پہلے والے کو اعادہ کرنے سے بہتر ہے۔

بلاغت کے اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو آیت کریمہ کے دوسرے مقام کو پہلے کے لیے محض تاکید قرار دینے کو سؤ فہم کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا لہذا اس پر پناہ ہونے والے اشتباہ کی حیثیت بھی بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تیسری وجہ: صیام رمضان کے حوالہ سے مسلم اور نو مسلم کے مابین جو تین وجوہ سے فرق ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ آیت کریمہ ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ کے ارشاد میں پہلے سے مسلمان اور مسلم معاشرہ کے افراد سے متعلقہ احکام کو بیان کرنے کے بعد نو مسلموں سے متعلقہ احکام کو بھی مستقل طور پر بیان کیا جائے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ دوسرے مقام کو پہلے سے عام قرار دے کر نو مسلموں کو بھی شامل کیا جائے جو قرآن شریف کا کتابِ فطرت ہونے کے بھی زیادہ قریب ہے۔

الغرض مذکورہ اشتباہ بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو آیات کریمہ میں حقِ تدبر کا فریضہ انجام دینے سے پہلو تہی اختیار کرنے کا نتیجہ ہے۔ ایسے میں آیت نمبر 185 کے آخری حصہ ”وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ کو سابق الذکر جن سات چیزوں کے لیے ہم نے فلسفہ قرار دیا ہے وہ حقیقت کے عین

(۱) کتاب المطول علی التلخیص، ص 121، مع حاشیہ میر السید السند، مطبوعہ مکتبہ

الداوری قم ایران۔

مطابق ہے، بلاغت قرآنی کے زیادہ مناسب ہے اور تقاضائے فطرت کے آئینہ دار ہونے کی بنا پر جملہ شکوک و شبہات سے پاک و محفوظ ہے۔ (فَلِلَّهِ الْحَمْدُ أَوَّلًا وَآخِرًا ظَاهِرًا وَبَاطِنًا)

ایک اور اشتباہ کا ازالہ:-

پیش نظر آیت کریمہ کے حوالہ سے ہماری اس تشریح کو پڑھنے کے بعد جہاں اہل علم حضرات سے ہمیں دعائیں ملنے کی اُمید ہے وہاں اس بات کا بھی ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ تقلیدِ جامد کے اسیر نیم خواندہ حضرات کو شاید یہ اشتباہ ہو جائے کہ اسلاف کی تفسیروں میں یہ تشریح نہیں پائی جاتی ہے کیوں کہ جس مسلک کے ذخیرہ تفسیر کو بھی دیکھا جاتا ہے اس میں پیش نظر آیات مقدسہ کی یہی ایک تشریح پائی جاتی ہے کہ یہاں پر دوسرا مقام پہلے مقام کی تاکید ہے یعنی آیت کریمہ نمبر 185 میں مذکور ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ تاکید ہے آیت نمبر 184 ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ کے لیے ایسے جملہ مفسرین کرام کے خلاف اس تحقیق کو کیوں تسلیم کیا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو مفسرین کے خلاف سمجھنا بجائے خود جہالت ہے، تقلیدِ جامد کا غلط نتیجہ ہے اور مفسرین کرام کی روحوں کو دکھ دینے کے مترادف ہے نہ صرف اتنا بلکہ آیاتِ قرآنیہ کے لامحدود رموز و معارف کو صرف مفسرین کے بیان تک محدود کرنے کی غلطی سے مختلف نہیں ہے حالانکہ کسی بھی مفسر نے یہ نہیں کہا ہے کہ میری بتائی ہوئی باتوں پر اکتفا کر کے مزید غور و فکر کرنے سے اجتناب کرو، جبکہ یہاں پر پیش نظر آیات مقدسہ کی تشریح کے حوالہ سے ہم نے جو تحقیق پیش کی اس میں مفسرین کرام کی تاکید والی تشریح جوں کی توں محفوظ ہے، اس کی مخالفت ہے نہ انحراف بلکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق معرفت سے آیت کریمہ کے دوسرے مقام کو پہلے مقام کے لیے من وجہ تاکید اور من وجہ تائیس ہونا ثابت کیا ہے جس سے مفسرین کرام کی روحوں کو بھی خوشی ہوئی ہوگی اور عالم ارواح میں انہوں نے بھی ہمیں دُعاؤں سے نوازا ہوگا۔

سورة بقرہ، آیت نمبر 192 کی تفسیر

میرا سوال یہ ہے کہ مدارج العرفان فی مناہج کنز الایمان میں سورة البقرہ، آیت نمبر 192 ”فَإِنْ أَنْتَهُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ کے کئے گئے اُن تراجم کو غیر معیاری قرار دیا گیا ہے جن میں اس کا ترجمہ ”کفر سے باز آ کر اسلام قبول کرنے میں کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کو بخشنے اور اُن پر رحم کرنے والا“ کہا گیا ہے۔ ان کو غیر معیاری قرار دینے کا فلسفہ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض مفسرین کرام نے بھی ایسا ہی کہا ہے تفسیر جلالین میں ہے:

”إِنْتَهُوا عَنِ الْكُفْرِ وَأَسْلِمُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ لَهُمْ رَحِيمٌ بِهِمْ“

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حوالہ سے جلالین کی مذکورہ عبارت جیسی تشریح جن اقل قلیل حضرات سے منقول ہے وہ من حیث التشریح درست ہے اور آیت کریمہ کے متعدد مظاہر میں سے ایک خاص صورت کا اظہار ہے لیکن آیت کریمہ کے ترجمہ کو اُس پر بنا کرنا غلط ہے، بے احتیاطی ہے اور آیت کریمہ کی جامعیت کے منافی ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآنی آیات کا ترجمہ و تشریح دو جدا حقیقتیں ہیں، ہر ایک کے الگ الگ تقاضے ہیں جس کے مطابق مفسر کو جائز ہے کہ کسی آیت کریمہ کے اندر موجود متعدد احتمالات میں سے ایک کو ذکر کرے یا اُن میں سے کسی ایک کو اپنی فہم کے مطابق ترجیح دے جبکہ مترجم کو اصل کے مطابق پنے ٹٹے الفاظ استعمال کرنے کے سوا کسی لفظ کا اضافہ کرنا جائز ہے نہ کم کرنا چاہیے کسی کے خاص قول پر بنا کرنا جائز ہو ورنہ ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوگا۔ ہم نے آیت کریمہ ”فَإِنْ أَنْتَهُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ کے تراجم کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے جن پر رد کیا ہے اُن کی اسی غلطی کی بنیاد پر کیا ہے کہ انہوں نے آیت کریمہ کی جامعیت کو دیکھنا نہ واقعیت کو، بلاغی حیثیت کو پیش نظر رکھنا نہ

لغوی مفہوم کی وسعت کو اور اسوۂ حسنہ سید الانام ﷺ سے روشنی لینے کی کوشش کی نہ مفسرین کرام کے مختلف اقوال سے بلکہ سب سے بے التفاتی کرتے ہوئے ترجمہ کو صرف جلالین کی مذکورہ عبارت پر بنا کرنے کی غلطی کی ہے جس کا نتیجہ نہ صرف اتنا کہ ترجمہ معیاری نہ ہو سکا، مفہوم کی وسعت پر منطبق نہ ہو سکا بلکہ اُس کے نزول سے مقصد کے منافی ہونے کے ساتھ اکثر مفسرین سے بھی انحراف ہوا اور آیت کریمہ کی بلاغی حیثیت کے منافی ہونے کے ساتھ اُس کی عبارت النص سے بھی انحراف ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل کو سمجھنے کے لیے تمہید کے طور پر مندرجہ ذیل حقائق کو سمجھنا ضروری ہے:

پہلی حقیقت:- آیت کریمہ ”فَإِنْ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ جملہ خبریہ ہے اور علم بلاغت کے مطابق ہر جملہ خبریہ فائدہ خبر یا لازم فائدہ خبر سے خالی نہیں ہوتا۔ تلخیص المفتاح میں ہے:

”لَا شَكَّ أَنَّ قَصْدَ الْمُخْبِرِ بِخَبَرِهِ إِفَادَةُ الْمُخَاطَبِ أَنَّ اللَّهَ الْحَكِيمَ أَوْ كَوْنَهُ عَلِيمًا بِهِ وَبِسْمِ الْأَوَّلِ فَإِنَّدَةُ الْخَبَرِ وَالثَّانِي لِأَزْمُهَا“ (۱)

دوسری حقیقت:- جہاد مع الکفار کے حوالہ سے اسلام کا مزاج وہی ہے جو نبی اکرم رحمت عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے عیاں ہے کہ کفار کی طرف سے جب تک اسلام کے خلاف جارحیت نہ ہو، بالواسطہ یا بلاواسطہ تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو اور غیر مسلح جہاد کی کسی صورت سے بھی اُن کی اصلاح ممکن نہ ہو اُس وقت تک اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے کسی کے خلاف مسلح جہاد کا اقدام کبھی نہیں فرمایا اور نہ کبھی اس کی اجازت دی ہے کیوں کہ مسلح اقدامی جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے جو مجبوری اور صرف مجبوری کی صورت میں ہوتی ہے جو غیر مسلح جہاد کی تمام ممکنہ صورتیں ناکام و بے نتیجہ ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ اُس وقت بھی کچھ احتیاطی تدابیر اور چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے جبکہ مسلح اقدامی جہاد کے ماسوا غیر مسلح جہاد کی تمام شکلیں اپنے اپنے موسم و اوقات کے مطابق مسلمانوں پر لازم لایتنق ہیں کہ کسی وقت بھی اس کی فرضیت کفائی ساقط نہیں ہوتی۔

(۱) تلخیص المفتاح، بحث احوال الاسناد الخبری، ص 7۔

تیسری حقیقت:۔ اسلام اور کفر میں تقابل تضاد ہے کہ ایک کا وجود آپ ہی دوسری کی نفی ہے اور ایک کی نفی آپ ہی دوسرے کا وجود ہے جس کے بعد دوسرے کی نفی یا وجود پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

چوتھی حقیقت:۔ پیش نظر آیت کریمہ ”فَإِنْ أَنْتَهُوَ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ کی تفسیر میں صحابہ کرام سے لے کر تابعین اور تبع تابعین کے مفسرین تک تین اقوال منقول ہیں۔ جیسے محدث بغدادی عبدالرحمن ابن الجوزی المتوفی 597ھ نے تفسیر زاد المسیر میں لکھا ہے:

”فَإِنْ أَنْتَهُوَ فَإِنَّهُ ثَلَاثَةُ أَقْوَالٍ أَحَدُهَا أَنَّ مَعْنَاهُ فَإِنْ أَنْتَهُوَ أَعْنِ شَرِّكُمْ وَقَالَ كُمْ وَالثَّانِي عَنْ كُفْرِهِمْ وَالثَّلَاثُ عَنْ قَوْلِكُمْ ذُنُوبُ كُفْرِهِمْ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے فرمان ”فَإِنْ أَنْتَهُوَ“ میں مفسرین کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول:۔ وہ اپنے شرک اور تمہارے ساتھ لڑنے سے باز رہیں۔

دوسرا قول:۔ کفر سے باز رہیں۔

تیسرا قول:۔ کافر و مشرک رہتے ہوئے بھی تمہارے ساتھ لڑنے سے باز رہیں۔

ان تہمیدی مسلمات کو سمجھنے کے بعد جواب کی تفصیل آسان ہو گئی ہے کہ آیت کریمہ کے ترجمہ کو جلالین کے مذکورہ قول پر استوار کر کے ”پھر اگر وہ کفر سے باز آ جاویں اور اسلام لائیں“ کہنا مفسرین کے مطابق نہیں بلکہ خلاف ہے کیوں کہ جلالین کی مذکورہ عبارت ”إِنْ أَنْتَهُوَ أَعْنِ الْكُفْرَ وَاسْلَمُوا“ عطیف تفسیری پر محمول ہے ورنہ عطیف نق کسی صورت بھی درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ عطیف نق میں معطوف و معطوف علیہ ایک دوسرے سے مغائر ہوتے ہیں جبکہ پیش نظر عبارت میں کفر و اسلام کے مابین تقابل تضاد ہونے کی بنا پر مغایرت نہیں بلکہ انتہاء عن الکفر التزام اسلام کے بغیر ممکن نہیں ہے جس کے مطابق انتہاء عن الکفر اور التزام اسلام ایک چیز کے دو نام ہیں اور جلالین کی یہ عبارت عطیف

(۱) تفسیر زاد المسیر، ج ۱، ص 182، مطبوعہ بیروت۔

تفسیری پر محمول ہونے کی بنا پر درست و بے غبار ہے جبکہ ترجمہ کو اس پر بنا کرنے والے مترجمین نے اُسے عطیف نق سمجھنے کی غلطی کر کے بناء الغلط علی الغلط کا ارتکاب کیا ہے جو احتیاطی تقاضوں کے منافی ہے۔ جلالین کی عبارت کا عطیف تفسیری پر محمول ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اکثر مفسرین کرام نے انتہاء عن الکفر اور التزام اسلام ان دونوں کو ذکر کرنے کے بجائے صرف ایک پر اکتفا کیا ہے یعنی انتہاء عن الکفر پر اکتفا کیا ہے یا التزام اسلام پر تفسیر القرطبی میں ہے:

”فَإِنْ أَنْتَهُوَ أَيْ عَنْ قَوْلِكُمْ بِالْإِيمَانِ“ (۱)

یہاں پر انتہاء کی تفسیر صرف ایمان لانے میں کی ہے اور قتال سے منع ہونا کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کا نتیجہ اور اس کا لازمہ ہی ہے۔ تفسیر روح المعانی میں ہے:

”فَإِنْ أَنْتَهُوَ أَعْنِ الْكُفْرَ بِالتَّوْبَةِ مِنْهُ“ (۲)

یہاں پر بھی انتہاء کی تفسیر ایمان لانے میں کی ہے کیوں کہ کفر سے توبہ تا نب ہونے سے مقصد اسلام میں داخل ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ اسلام اور کفر کے مابین تقابل تضاد ہونے کی بنا پر کفر سے نائب ہونے کو التزام اسلام لازم ہے۔

تفسیر الکشاف میں ہے: ”عَنْ الشُّرُكِ وَالْقِتَالِ“ (۳)

یہاں پر بھی انتہاء کی تفسیر اسلام قبول کرنے کے ساتھ کی ہے کیوں کہ کفر و شرک سے بیزار ہونے کا مطلب اسلام قبول کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر البیضاوی میں ہے: ”فَإِنْ أَنْتَهُوَ أَعْنِ الْقِتَالَ وَالْكُفْرَ“ (۴)

یہاں پر کفر کو ذکر کر کے اسلام لانے کو مراد لیا ہے کیوں کہ کفر سے بیزاری قبول اسلام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

(۱) التفسیر القرطبی، ج ۲، ص 353۔ (۲) روح المعانی، ج ۲، ص 760۔

(۳) الکشاف، ج ۱، ص 342۔

(۴) تفسیر بیضاوی مع شیخ زادہ، ج ۱، ص 500، دار احیاء تراث العربی۔

تفسیر کبیر میں ہے:

”قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ”فَإِنْ انْتَهَوْا عَنِ الْقِتَالِ وَقَالَ الْحَسَنُ فَإِنْ انْتَهَوْا عَنِ الشِّرْكِ حُجَّةُ الْقَوْلِ الْأَوَّلِ أَنَّ الْمُقْصُودَ مِنَ الْإِذْنِ فِي الْقِتَالِ مَنَعَ الْكُفَّارِ عَنِ الْمُقَاتَلَةِ فَكَانَ قَوْلُهُ فَإِنْ انْتَهَوْا مَحْمُولًا عَلَى تَرْكِ الْمُقَاتَلَةِ حُجَّةُ الْقَوْلِ الثَّانِي أَنَّ الْكَافِرَ لَا يَنْتَهِئُ عَنْ اللَّهِ وَرَحْمَتِهِ بِتَرْكِ الْقِتَالِ بَلْ بِتَرْكِ الْكُفْرِ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس ص نے فرمایا کہ آیت کریمہ ”فَإِنْ انْتَهَوْا“ سے مراد کفار کا اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے بھی مسلمانوں کے ساتھ تعرض کرنے سے باز رہنا ہے کہ اس صورت میں اُن کے ساتھ جہاد بالمسیف جائز نہیں ہے اور حضرت حسن البصری ص نے فرمایا کہ اس سے مراد کفر و شرک سے باز آنا ہے۔

اول قول کی دلیل یہ ہے کہ کفار کے ساتھ جہاد بالمسیف کرنے کا حکم دینے سے مقصد اُن کی طرف سے اسلام کے خلاف لڑنے کو روکنا تھا اب جب وہ خود اس سے منع ہو چکے ہیں تو اُن کے ساتھ جہاد بالمسیف بھی جائز نہیں ہوگا لہذا اس انتہا سے مراد بھی اسلام کے خلاف تعرض کرنے سے باز آنا ہوگا۔

دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ کافر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غفران و رحمت کا اُس وقت تک مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کفر سے باز نہیں آتا یعنی جب تک مسلمان نہیں ہوتا لہذا اس انتہا سے مراد بھی اسلام قبول کرنا ہے۔

امام فخر الدین الرازی کا یہ کلام درحقیقت اس حوالہ سے جملہ تفاسیر کا لُب لباب اور حاصل مقصد ہے جس کے مطابق آیت کریمہ میں مذکور انتہاء سے حاصل تفسیر یہ ہے کہ بعض اُسلاف نے اس سے مراد کفر سے باز آنا لیا ہے یعنی اسلام قبول کر کے اہل اسلام کی صف میں آنا جس سے قتال و جدال جیسی

(۱) التفسیر الکبیر، ج 5، ص 144۔

تمام منفی حرکتیں آپ ہی ختم ہو جاتی ہیں اور وہ مستحق قتل ہونے کے منظر سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کا استحقاق پاتے ہیں اور بعض اُسلاف نے اس سے مراد یہ لی ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے بھی اسلام کے خلاف لڑنے اور کسی قسم کے تعرض کرنے سے باز ہیں تو دُنیوی طور پر سابقہ لڑائی سے درگزر فرما کر اللہ تعالیٰ اُنہیں زندہ رہنے کا حق دیدیتا ہے جو اُس کی رحمت کا تقاضا ہے تاکہ امن و سکون کے ساتھ رہتے ہوئے اسلام کی دعوت و تبلیغ کو قبول کر کے اُخروی زندگی کو بھی اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کا مستحق بنا سکیں۔ مفسرین کرام کی ان تصریحات کی روشنی میں دیکھا جائے تو آیت کریمہ کے ترجمہ میں ”اپنے کفر سے باز آ جاویں اور اسلام قبول کر لیں“ جیسے انداز تطویل لا طائل کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ جب اسلام قبول کرنا اور کفر سے باز آنا ایک ہی چیز ہے تو پھر دونوں کو ذکر کر کے متن کے الفاظ پر اضافہ کرنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ ایسے میں ان تراجم کی حیثیت جملہ مفسرین کرام سے انحراف اور بے مصرف تطویل سے مختلف نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جلالین کی جس عبارت پر ان کو ہٹا کیا گیا ہے درحقیقت یہ اُس کے بھی منافی ہیں کیوں کہ اُسے عطف تفسیری پر محمول کر کے بے مصرف تطویل و تکرار سے بچایا جاسکتا ہے جبکہ ان میں عطف تفسیری پر محمول کر نیکی گنجائش نہیں ہے، جیسے اہل دانش سے مخفی نہیں ہے۔

حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو محدث ابن الجوزی کے بیان کردہ تین اقوال کا انجام بھی یہی دو ہیں کیوں کہ قول اول یعنی ”انْتَهَوْا عَنْ شَرِّكُمْ وَقِتَالِكُمْ“ کی حقیقت کفر سے باز آنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ لفظ ”وَقِتَالِكُمْ“ کا ذکر بطور لازمہ ہے کیوں کہ کفر سے باز آنے کو اسلام کے خلاف قتال کرنے سے منع ہونا لازم ہے اور کفر سے باز آنا آپ ہی اسلام کو قبول کرنا ہے کیوں کہ اسلام اور کفر میں تقابل تضاد ہونے کی وجہ سے ایک سے باز آنا دوسرے میں داخل ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے گویا حافظ ابن الجوزی کے بیان کردہ اول قول کی حقیقت کفر سے باز آنے کے سوا ہے جسکے مطابق آیت کریمہ ”فَإِنْ انْتَهَوْا“ کی صرف دو تفسیریں باقی رہ جاتی ہیں:

پہلی تفسیر:- کفر سے باز آئیں یعنی اسلام قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی علی الاطلاق بخشش اور رحمت کے مستحق بنیں۔

دوسری تفسیر:- کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے اسلام کی راہ میں رکاوٹ بننے سے باز آئیں، اسلام کے خلاف کسی سازش کا حصہ بننے سے اور مسلمانوں کے خلاف تعرض کرنے سے کنارہ کشی اختیار کریں۔

اس تفسیر کی بنا پر اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی غفوریت کا مظہر یہ کہ اسلام کے خلاف اُن کی سابقہ لڑائیوں پر دُنیوی زندگی میں ستر ڈالتا ہے، مسلمانوں کی تلوار اُن سے روکتا ہے اور اُن کے خلاف مسلح جہاد کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کا اُن پر رحم ہونے کا مظہر یہ کہ اسلام کے حوالہ سے پُر سکون و پُر امن زندگی گزارنے کی مہلت دینے کے ساتھ اسلام کی طرف آنے کی ترغیب اور کفر و شرک سے ترہیب کی اسلامی تبلیغ پر کان دھرنے کی ترغیب دیتا ہے، موقع فراہم کرتا ہے اور تقاضاء رحمت کی تکمیل فرماتا ہے یہ اس لیے کہ اسلام کو اپنی حقانیت اور فطری مذہب ہونے پر اتنا اعتماد ہے کہ دُنیا بھر کے غیر مسلم اقوام سے اپنی تبلیغ کو سننے کا مطالبہ کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اسلام کی حقیقی تبلیغ کو آزاد ذہن سے سننے کے بعد وہ زیادہ دیر تک غیر مسلم نہیں رہ سکتے ہیں۔ اسی اعتماد کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت و تبلیغ کو اہل اسلام پر ناقابل انکساک فریضہ قرار دیا ہے جس کی متعدد شکلیں ہیں اور ہر ایک کے اپنے موسم و جدا جدا تقاضے ہیں۔ الغرض تقریری، تحریری، صحافتی، سفارتی، مذاکراتی اور میڈیائی تبلیغات کی یہ تمام شکلیں اپنے اپنے تقاضوں کے مطابق قرآن و سنت کے روشنی میں اسلامی جہاد ہی کہلاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن شریف کی فطری تبلیغ اُن کے سامنے پیش کر کے انہیں اسلام کی

(۱) الفرقان، 52۔

طرف لانے کی بڑی محنت کریں۔
دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا وَاهِمُ الْجَهَنَّمِ وَمَنْ فِيهَا الْمَصِيرُ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ کفار و منافقین کو سمجھانے کے لیے جہاد تبلیغ کیجئے اور حقانیت اسلام کی سخت دلائل اُن پر واضح کیجئے اور ٹھکانہ اُن کا جہنم ہے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔

آیت کریمہ کے ان تراجم کا تطویل بلا طائل اور متن کی جامعیت کے منافی ہونے پر ان دلائل کے علاوہ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ متن کے لفظ ”انتهوا“ کے مظہر کو اُن کے اسلام لانے کیساتھ مختص بتانے کی صورت میں آیت کریمہ کا دوسرا حصہ یعنی ”فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ کی خبریت بے مقصد ہونا لازم آتا ہے یہ اس لیے کہ یہاں پر آیت کریمہ کے اس جملہ خبریہ کے ساتھ مخاطب اہل اسلام ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اُن پر غفور و رحیم ہونے کے مضمون کا انہیں پہلے سے علم ہے تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں علم بلاغت کے مطابق فائدہ خبر یا لازم فائدہ خبر کا افادہ ہو رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

(۱) التحريم، 9۔

لفظ شئی کی تحقیق اور مراد کی تشخیص

میرا سوال یہ ہے کہ ”آواہ حق“ میں تراجم قرآن کے تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ کے کنز الایمان والے ترجمہ کو اس لیے معیاری قرار دیا گیا ہے کہ یہ ”بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے“ کہنے کے انداز میں ممکن کی تمام صورتوں کو شامل ہے چاہے موجود ہو یا معدوم، اس پر یہ خلجان پیدا ہوتا ہے کہ یہ مذہب اہل سنت پر منطبق نہیں ہے اس لیے کہ اہلسنت کے نزدیک شئی ہمیشہ موجود ہوتا ہے معدوم کو شئی نہیں کہا جاتا، مہربانی کر کے اس کی وضاحت کی جائے۔ والسلام

مولانا شاہ منیر استاذ الحدیث دارالعلوم جامعہ حنیفیہ، کارخانہ مارکیٹ، خیبر روڈ حیات آباد پشاور۔

اس کے جواب میں سب سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ معدوم کو شئی کہنے یا نہ کہنے کے حوالہ سے اہل سنت و معتزلہ کے مابین اختلاف کو لغوی فتویٰ یا بحث لغوی سمجھنے کی جوش مشہور ہے اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے کیوں کہ لفظ ”شئی“ کا استعمال بطور اسم کس کے لیے ہو سکتا ہے اور کس کے لیے نہیں ہو سکتا۔ یہ خالص لغت کا مسئلہ ہونے کی وجہ سے قیاس و اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں رکھتا جبکہ ”عند الاشاعره شئی“ کا موجود کے ساتھ مختص ہونے اور عند المعتزلہ موجود و معدوم دونوں کو شامل ہونے کا تنازع لغوی نہیں بلکہ معنوی اور لسانی نہیں بلکہ اجتہادی مسئلہ ہے اور قرآن شریف کا ترجمہ کرنا اہل اسلام میں سے کسی فریق یا کسی مجتہد کا تابع نہیں بلکہ بجائے خود مستقل ذمہ داری ہے جس کے اپنی مستقل شرائط اور تقاضے ہیں جن میں سے آیات قرآنی کی لغوی اور لسانی و بلاغی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق الفاظ و انداز اختیار کرنا مخرج کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ کے کنز الایمانی ترجمہ ”بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے“

کے کس اور اس کے معارف کا راز بھی یہی ہے کہ اسے کسی اجتہادی ظن پر ہٹا کرنے کے بجائے معیاری ترجمہ کی ان ضروری شرائط پر استوار کیا گیا ہے اور لسان قرآنی کی لغت میں لفظ ”شئی“ کا مفہوم ”کُلِّ مَا يَصِحُّ أَنْ يَعْلَمَ وَيَخْبِرَ عَنْهُ“ متعین ہونا سب کو معلوم ہے کیوں کہ لغت سب کے لیے یکساں قابل فہم ہوتی ہے۔ نیز اس بات میں بھی اہل لغت سے لے کر اہل اجتہاد اور متکلمین اسلام سے لے کر مفسرین کرام تک سب متفق ہیں کہ قرآن و سنت کے جس جس مقام پر ”شئی“ کے ساتھ قدرت الہی کو متعلق بتایا گیا ہے وہیں پر اس سے مراد ممکن ہی متعین ہے یعنی واجب تعالیٰ جل جلالہ اور اس کی صفات کو شامل ہے نہ محال و متنع کو جس کے مطابق آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ کی طرح تینوں کو شامل ہونے کے بجائے صرف ممکن کی جملہ قسموں کو محیط ہے؛

پہلی قسم:- جو ظرف خارج میں موجود ہے جیسے دنیا بھر کے کلیات و جزئیات اور مقولات و مشاہدات جو دنیا کی عملی زندگی سے عبارت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّ اللَّهَ الْحَقُّ“ (۱)

دوسری قسم:- جو ظرف ذہن میں موجود ہے، جیسے انسانوں کے دخل عمل اور ان کے کسب و اختیار سے وجود میں آنے والے وہ تمام امور جن کا خالق اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۚ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ (۲)

تیسری قسم:- جواب تک ظرف خارج میں آیا ہے نہ ظرف ذہن میں بلکہ آئندہ کسی وقت انہیں وجود میں لانے کے ساتھ مشیت الہی متعلق ہو چکی ہے۔ عام اس سے کہ انسانوں کے کسب کو ان میں دخل ہو یا نہ ہو۔ اللہ نے فرمایا:

”يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (۳)

چوتھی قسم:- جو وجود میں آیا ہے نہ کبھی آئے گا کیوں کہ اپنی جگہ اُس کے وجود و عدم میں سے ہر ایک ممکن اور مقدور تحت القدرت ہونے کے باوجود اُسے وجود میں لانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی متعلق نہیں ہوئی ہے۔ جیسے فرمایا:

”وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا“ (۱)

کون نہیں جانتا کہ ابو جہل جیسے اُزلی کافروں میں ایمان پیدا کرنا فی نفسہ ممکن اور مقدور تحت القدرت ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے وجود میں لانے کا ارادہ نہیں فرمایا ہے جس وجہ سے ایسوں کو کبھی ایمان نصیب نہیں ہوتا۔

الغرض آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ میں لفظ ”شئی“ اپنے لغوی مفہوم پر محمول ہونے اور اس سے مراد اہل اقسام ممکن ہونے پر لغت قرآنی سے لے کر متکلمین اسلام اور مفسرین کرام سے لے کر فقہاء کرام تک سب متفق ہیں اور آیت کریمہ کا اس کے مطابق ترجمہ ہونے کا شرف کنز الایمان کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا، اور کنز الایمان کے اس امتیازی عرفان کا راز یہ ہے کہ اسے اشاعرہ و معتزلہ کے اختلاف پر بنا کرنے کے بجائے معیاری ترجمہ کے شرائط پر استوار کیا گیا ہے، مجتہد کی رائے کا تابع بنانے کے بجائے اُس کی مستقل حیثیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے، متن کے عموم اور ممکن کی تمام قسموں کو شامل ہونے کی قطعی حیثیت کو خوبصورت و جامع انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ایسے میں اسے اہل سنت کے منافی سمجھنا سو فہم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ لسان قرآنی کے مطابق لفظ ”شئی“ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک لغوی، دوسری معنوی۔

لغوی حیثیت:- یہ ہر اُس حقیقت کے لیے اسم ہے جس کی کسی نہ کسی عنوان سے پہچان ممکن ہو اور مخبر عنہ ہو سکے۔ اس حیثیت کا تعلق لغت کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کسی متکلم کو اس میں اختلاف برپا کرنے کی گنجائش ہے نہ کسی مجتہد کو نہ کسی فقیہ کو اور نہ کسی مفسر کو۔ اس لیے کل مکاتب

فکر مفسرین کرام نے بھی اپنی تفسیروں کو اسی پر بنا کیا ہے۔

معنوی حیثیت:- اس میں اشاعرہ و معتزلہ کے مابین اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف اصلی نہیں بلکہ دوسرے اختلاف کا جنم ہے وہ یہ ہے کہ اشاعرہ کے نزدیک وجود و عدم و موجود اپنے آپس میں خاص ضدین ہیں۔ جن کے مابین واسطہ نہیں ہے جس کے مطابق کسی شئی کا موجود ہونا آپ ہی اُس کے معدوم نہ ہونے پر دلیل ہے کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کسی شئی کا معدوم ہونا آپ ہی اُس کے موجود نہ ہونے پر دلیل ہے جس کے بعد اُس کے موجود نہ ہونے پر کوئی اور دلیل طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ معتزلہ کے نزدیک ایسا نہیں ہے بلکہ وجود و عدم اور موجود و معدوم کے مابین ثبوت کا واسطہ ہے یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شئی موجود بھی نہ ہو، معدوم بھی نہ ہو بلکہ ثابت ہو اور ثبوت شئی وجود شئی سے مختلف اور جدا حقیقت ہے۔ اہل سنت و معتزلہ کے مابین پائے جانے والے اس اختلاف سے معدوم کو شئی کہنے یا نہ کہنے کا اختلاف آپ ہی لازم آ جاتا ہے جس کی واقعی شکل کو سمجھنے کے لیے تمہیدی طور پر دو باتوں کو سمجھنا ضروری ہے:

پہلی بات:- ثبوت الشئی، تحقق الشئی، تقرر الشئی، تجوہر الشئی، فعلیت الشئی اور شیعیت الشئی جیسی تعبیرات جو علم کلام کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں ان میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی فرق نہیں ہے یعنی مفہوم ان سب کا ایک ہے جس کے مطابق ان سب کا فاعل ان کے ساتھ مذکور ہونے والے شئی کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔

دوسری بات:- وجود و عدم کے مابین ثبوت کا واسطہ ہونے یا نہ ہونے کے حوالہ سے اختلاف کی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ ”شیعیت الشئی فی ظرف ما“ کو یعنی کسی ظرف میں شئی کے تحقق ہونے کو وجود مساوی ہے یا نہیں۔ اہل سنت مساوی کہتے ہیں جس کے مطابق ان کے نزدیک شیعیت الشئی اور وجود الشئی ایک چیز کے دو نام ہیں۔ جبکہ معتزلہ اس سے اختلاف رکھتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ شئیۃ اشئی کو وجود نہ لازم ہے نہ مساوی بلکہ یہ وجود کے بغیر بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ شئیۃ و ثبوت، وجود سے جدا اور مستقل حقیقتیں ہیں جو وجود و عدم کے مابین واسطہ اور برزخ کی حیثیت میں ہیں۔

ان تمہیدات کو سمجھنے کے بعد اہل سنت و معتزلہ کے مابین مذکورہ ذیلی اختلاف کی حقیقت تک رسائی آسان ہو جاتی ہے یہ اس لیے کہ جب اہل سنت کے نزدیک وجود و عدم ایک دوسرے کے نقیض ہیں اور موجود و معدوم ایک دوسرے کی مخصوص ضدین ہیں جن کے مابین ثبوت و شئیۃ کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور وجود و ثبوت اور شئیۃ ایک دوسرے کے ساتھ مساوی فی المصادیق ہیں تو پھر جہاں پر بھی شئیۃ اشئی ہوگی وہاں پر وجود ہوگا اور شئیۃ اشئی بغیر وجود کے متصور نہیں ہو سکتی اور شئیۃ اشئی یا شئیۃ الذات کو وجود مساوی ہو جانے کے بعد آگے اس کی موجودگی کا ظرف عام ہے چاہے ظرف خارج ہو یا ظرف ذہن یا ان دونوں سے ماوراء نفس الامر یا عالم غیب۔ یہ ہے اہل سنت کے نزدیک شئی کا موجود کے ساتھ مختص ہونے کا پس منظر جس تک رسائی کے بغیر لفظ ”شئی“ کے حوالہ سے طرح طرح کی بدفہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، بے گناہ متکلمین اسلام پر لغت کو اپنی رائے کا تابع بنانے کا الزام دیا جا رہا ہے اور متکلمین کے اس معنوی اختلاف کو لغت میں اجتہاد کہہ کر التباس الحق بالباطل کیا جا رہا ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جبکہ ان بے گناہ حضرات نے اپنی کتابوں میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ اہل سنت و معتزلہ کے مابین یہ اختلاف معنوی ہے لفظی نہیں، اجتہادی ہے لغوی نہیں اور ظنی ہے قطعی نہیں۔ شرح عقائد میں لکھا ہے:

”الْمَعْدُومُ لَيْسَ بِشَيْءٍ إِنْ أُريدَ بِالشَّيْءِ الثَّابِتِ الْمُتَحَقِّقُ عَلَى مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ الْمُحَقِّقُونَ مِنْ أَنَّ الشَّيْئَ تَسَاوَى الْوُجُودَ وَالثَّبُوتَ وَالْعَدَمَ يُرَادُ النَّفْيُ فَهَذَا أَحْكَمُ ضَرُورِيٍّ لَمْ يُنَازَعْ فِيهِ إِلَّا الْمُعْتَزِلَةُ الْقَائِلُونَ بِأَنَّ الْمَعْدُومَ الْمُمَكِّنَ ثَابِتٌ فِي الْخَارِجِ وَإِنْ أُريدَ أَنَّ الْمَعْدُومَ لَا يُسَمَّى شَيْئًا فَهُوَ بَحْثٌ لُغَوِيٌّ مَبْنِيٌّ

عَلَى تَفْسِيرِ الشَّيْءِ بِأَنَّهُ الْمَوْجُودُ أَوِ الْمَعْدُومُ أَوْ مَا يَصِحُّ أَنْ يَعْلَمَ وَيُخْبِرَ عَنْهُ فَالْمَرْجِعُ إِلَى النَّقْلِ وَتَتَبُعُ مَوَارِدَ الْإِسْتِعْمَالِ“ (۱)

میر السید السند نے بھی آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّيْلَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ کے تحت ”شئی“ کے لغوی مفہوم کو واجب، ممکن اور ممکن کو شامل کہنے کے بعد مرادی مفہوم کو مطلق ممکن کے ساتھ مختص کہنے کی تائید کرتے ہوئے متکلمین کے حوالہ سے لکھا ہے:

”وَأَمَّا مَا ذَكَرَ فِي عِلْمِ الْكَلَامِ مِنْ أَنَّ الْمَحَالَ لَيْسَ بِشَيْءٍ إِتِّفَاقًا فَإِنَّ النِّزَاعَ فِي الْمَعْدُومِ الْمُمَكِّنِ هَلْ هُوَ شَيْءٌ أَمْ لَا فَذَلِكَ فِي الشَّيْئِ بِمَعْنَى التَّحَقُّقِ مُنْفَكًّا عَنْ صِفَةِ الْوُجُودِ لَا فِي إِطْلَاقِ لَفْظِ الشَّيْءِ عَلَى مَفْهُومِهِ فَإِنَّهُ مِنَ الْمَبَاحِثِ اللَّغَوِيَّةِ الْمُسْتَنَدَةِ إِلَى النَّقْلِ وَالسَّمَاعِ لَا مِنَ الْمَسَائِلِ الْكَلَامِيَّةِ الْمُبْنِيَّةِ عَلَى الْأَنْظَارِ الدَّقِيقَةِ“

اسلاف کی ان تصریحات کی موجودگی میں مذکورہ اشتباہ کو سؤ فہم کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ افسوس بالائے افسوس یہ کہ مباحث کلامیہ اور مسائل لغویہ کے مابین عدم تفریق کا المیہ صرف یہاں پر ہی نہیں بلکہ اور بھی متعدد جگہوں میں پایا جاتا ہے۔

خلاصۃ الجواب بعد التحقیق:۔ لسان قرآنی کے لفظ ”شئی“ کو موجود کے ساتھ مختص کہنے کا پس منظر تین (۳) باتوں سے خالی نہیں ہے:

پہلی بات:۔ وجود سے قطع نظر کر کے شئیۃ اشئی کا موجود ہونے یا نہ ہونے کے حوالہ سے کلامی اختلاف پر مقرر ہے جو اجتہادی وظن ہونے کی بناء پر آیت کریمہ کے ترجمہ کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ دوسری بات:۔ کثرت الاستعمال کی بنا پر ہے یعنی معدوم کے مقابلہ میں موجود کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے تو غلبہ استعمال کو دیکھ کر کہنے والوں نے اسے موجود کے ساتھ مختص کہہ دیا جو حقیقت

کے منافی ہے کیوں کہ موجود کے لیے زیادہ استعمال ہونا اور چیز ہے جبکہ اُس کے ساتھ مختص ہونا اور چیز ہے جن کے مابین تلازم ہے نہ مساوات جس وجہ سے مفسرین کرام کی غالب اکثریت نے بھی اس پر رد کیا ہے۔ شتے نمونہ از خردوارے روح المعانی میں ہے:

”وَيُشِيرُ إِلَى اسْتِعْمَالِهِ فِي الْمَوْجُودِ لَا يَنْتَهِضُ صَارًا فَلَا يَخْتَصُّ بِهِ لُغَةً“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ لفظ ”شئی“ کا موجود میں زیادہ استعمال ہونا اُس کے مفہوم کو معدوم کو شامل ہونے سے مانع نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ کثرت استعمال تخصیص کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ باہمی گفتگو میں موجودات کے حالات کیساتھ غرض و مقاصد کا تعلق زیادہ ہوتا ہے۔

ایسے میں اس ضعیف دے بنا قول کو آیت کریمہ کے ترجمہ جیسے قابل احتیاط عمل کی بنیاد قرار دینے کی غلطی کون کر سکتا ہے۔

تیسری بات:۔ شئی کو موجود کے ساتھ مختص کہنے والوں نے قاضی بیضاوی کی تقلید میں ایسا کہا ہے کیوں کہ قاضی نے کہا تھا کہ لفظ ”شئی“ باب ”سَمِعَ يَسْمَعُ“ سے ارادہ کرنے کے معنی میں مصدر ہے جو کبھی مبنی للفاعل استعمال ہوتا ہے اور کبھی مبنی للمفعول یعنی مشیئ الوجود کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر بیضاوی میں قاضی کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں:

”وَالشَّيْءُ يَخْتَصُّ بِالْمَوْجُودِ لِأَنَّهُ فِي الْأَصْلِ مَصْدَرُ شَاءَ أَطْلَقَ بِمَعْنَى شَاءَ تَارَةً وَحِينَئِذٍ يَتَنَاوَلُ الْبَارِي تَعَالَى كَمَا قَالُوا قُلْ أَيْ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ وَبِمَعْنَى مَشِئَةٍ أُخْرَى أَيْ مَشِئَةٍ وَجُودِهِ وَمَا شَاءَ اللَّهُ وَجُودُهُ فَهُوَ مَوْجُودٌ فِي الْجُمْلَةِ وَعَلَيْهِ قَوْلُهُ تَعَالَى ”إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“

قاضی بیضاوی کی اس عبارت میں دو چیزیں ہیں جن میں سے ایک لفظ ”شئی“ کا موجود کے ساتھ مختص

ہونے کا دعویٰ ہے اور دوسری اُس کی دلیل جس کو ”لأنه في الأصل مصدر شاء“ کے الفاظ میں قیاس مضر کے انداز سے ذکر کیا ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

مدعا:۔ الشَّيْءُ مُخْتَصٌّ بِالْمَوْجُودِ.

ضمری:۔ لِأَنَّهُ فِي اللَّغَةِ مَصْدَرُ شَاءَ الْمُتَقَسِّمِ إِلَى قَسْمَيْهِ.

گہری:۔ وَكُلُّ مَصْدَرٍ بِقَسْمَيْهِ مُخْتَصٌّ بِالْمَوْجُودِ.

نتیجہ:۔ فَالشَّيْءُ مُخْتَصٌّ بِالْمَوْجُودِ.

قاضی کے اس استدلال میں گہری نا قابل انکار ہے کہ مصدر چاہے مبنی للفاعل ہو یا مبنی للمفعول بہر حال موجود کے ساتھ ہی مختص ہوتا ہے لیکن ضمری محل نظر ہے یہ اس لیے کہ لسان قرآنی کے مطابق لفظ ”شئی“ کو مبنی الاطلاق مصدر قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ مصدر عامل ہوتا ہے جو اپنے فعل والا عمل کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ ”شئی“ مصدر ہونے کی صورت میں لازم کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ متعدی ہی استعمال ہوا ہے جس کے لیے فاعل و مفعول بہ دونوں ضروری ہوتے ہیں۔ جیسے آیت کریمہ ”وَمَا تَشَاءُ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ اور حدیث شریف ”مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ“ جیسے درجنوں نصوص سے سب کو معلوم ہے جبکہ لسان قرآنی میں لفظ ”شئی“ کا استعمال ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ درجنوں مقامات ایسے ہیں جن میں اسے مصدر پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ:

”وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ“ (۱)

اسی طرح آیت کریمہ: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا“ (۲)

اسی طرح حدیث شریف: ”كَانَ اللَّهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ شَيْءٌ“

اہل علم جانتے ہیں اس قسم تمام مواقع پر شئی سے مراد اسم محض اور ذوات و اعیان کے سوا اور

کچھ نہیں ہے۔ الغرض لغت سے لے کر قرآن و سنت تک اہم محض واعیان اور کبھی ممکن موجود، کبھی ممکن معدوم، کبھی موجود فی الذہن معدوم فی الخارج کبھی معدوم فی الخارج والذہن موجود فی الواقع جیسے حقائق کے لیے اس کے ناقابل انکار استعمالات و محاورات کو دیکھ کر قاضی بیضاوی کے ساتھ اُن سے متقدمین نے اتفاق کیا ہے۔ نہ اُن کے ہم عصروں نے اور نہ بعد والے محققین نے ایسے میں آیات قرآنی کے ترجمہ جیسے قابل احتیاط عمل کو اس پر بنا کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ”مَا يَصِحُّ أَنْ يُعْلَمَ وَيُخْبَرَ عَنْهُ“ کا اس کے لغوی مفہوم ہونے پر قاضی کے ماسوا باقی سب کا اتفاق ہے تو پھر لغت سے لے کر مفسرین اور متکلمین کی غالب اکثریت تک سب کے برخلاف صرف قاضی بیضاوی کی تقلید کرنے کو ہرگز انصاف نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ قرآن شریف کے ترجمہ جیسے کثیر الاحتیاط عمل کو اس پر بنا کر ناجائز ہو سکے۔

☆☆☆☆☆

جملہ متانفہ کی تعریف اور اقسام

میرا سوال یہ ہے کہ مدارج العرفان فی منہج کنز الایمان میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 24 کے دوسرے حصہ یعنی ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ کو جملہ متانفہ قرار دیا گیا ہے جبکہ جملہ متانفہ کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی کیوں کہ جملہ متانفہ ہمیشہ مقدر سوال کے جواب میں واقع ہوتا ہے۔ جس کی تین قسمیں ہیں؛ پہلی قسم:۔ کلام سابق میں موجود حکم کے کسی بھی سبب کا جواب ہوتا ہے، جیسے ”قَالَ كَيْفَ أَنْتَ قُلْتُ غَلِيلٌ..... سَهْرَدَائِمُ وَحُزْنُ طَوِيلُ“ ترجمہ مجھ سے پوچھا کہ کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ بیمار ہوں۔ جس کا سبب مسلسل بے خوابی اور ہمیشہ غم ہے اس میں ”سَهْرَدَائِمُ“ اور ”حُزْنُ طَوِيلُ“ جو اپنے آپس معطوف و معطوف علیہ ہیں خبر میں مبتداء محذوف کے لیے جو ”ہو“ ہے اور مبتداء اپنی خبر سے ملکر جملہ اسمیہ ہونے کے بعد جملہ متانفہ ہے جو کلام سابق سے پیدا ہونے والے سوال کا جواب ہے۔ یہ اس لیے کہ کلام سابق میں لفظ ”غلیل“ خبر ہے مبتداء محذوف کے لیے جو ”انا“ ہے اور مبتداء اپنی خبر سے ملکر جملہ اسمیہ ہونے کے بعد اس سے سوال مفہوم ہوا کہ تیری بیماری کا سبب کیا ہے؟ جس کے جواب میں ”سَهْرَدَائِمُ وَحُزْنُ طَوِيلُ“ کو جملہ متانفہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری قسم:۔ کلام سابق میں موجود حکم کے کسی خاص سبب سے سوال کا جواب ہوتا ہے۔ جیسے آیت کریمہ ”وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي. إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ“ (۱) اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں بتاتا بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے۔

(۱) الیوسف، 53۔

یہاں پر آیت کریمہ ”إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ“ جملہ اسمیہ کی شکل میں جملہ متانفہ ہے جو سابقہ جملہ سے پیدا ہونے والے تقدیری سوال کا جواب ہے کیوں کہ ”وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي“ کے جملہ کو سننے والوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا نفس بھی کسی کو برائی کا حکم دے سکتا ہے؟ جسکے جواب میں تاکید کے ساتھ کہا گیا کہ بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے۔

تیسری قسم:- کلام سابق میں پائے جانے والے حکم کے سبب کے سوا کسی اور طریقے سے اٹھنے والے سوال کا جواب ہوتا ہے۔ جیسے آیت کریمہ:

”قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ“ بولے سلام کہا سلام۔ (۱)

یہاں پر لفظ ”سلام“ جو مبتداء ہے جسکی خبر ”علیکم“ مخذوف ہے جس کی محصل عبارت ”سلام علیکم“ ہے جو جملہ اسلامیہ ہونے کے بعد مقولہ قول ہے اور یہی جملہ اسمیہ جملہ متانفہ ہے جو اپنے ماقبل جملہ فعلیہ یعنی ”سلاما“ جس کی محصل عبارت ”سَلَمْنَا سلاما“ ہے سے پیدا ہونے والے سوال کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ یہ اس لیے کہ جب فرشتوں نے ”سلاما“ کے جملہ فعلیہ کی شکل میں سلام کیا اُس سے سوال پیدا ہونے لگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے سلام کے جواب میں کیا کہا؟ جس کا جواب دیا گیا کہ اُن کے سلام کا جواب بہتر سلام سے دیا (جو جملہ اسمیہ ہونے کی وجہ سے دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے)۔ الغرض جملہ متانفہ کا سوالیہ مقدر کے جواب کے ساتھ مختص ہونے سے متعلق تلخیص المفتاح کی مکمل عبارت اس طرح ہے:

”وَيُسَمَّى الْفَصْلُ اسْتِيفَانًا وَكَذَا الثَّانِيَةُ وَهُوَ عَلَى ثَلَاثَةِ أَضْرِبٍ لِأَنَّ السَّوَالَ أَمَّا عَنْ سَبَبِ الْحُكْمِ مُطْلَقًا نَحْوَ شَعْرٍ قَالَ لِي كَيْفَ أَنْتَ قُلْتَ غَلِيلٌ..... سَهْرًا ذَائِمٌ وَحُزْنٌ طَوِيلٌ أَيْ مَا بِالْكَ غَلِيلًا أَوْ مَا سَبَبُ عَلَيْكَ وَآمَاعِنُ سَبَبٌ خَاصٌ نَحْوُ ”وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ“ وَهَذَا الضَّرْبُ يَقْتَضِي تَاكِيدَ

(۱) ہود، 69۔

الْحُكْمِ كَمَا مَرَّ وَآمَاعِنُ غَيْرُهُمَا نَحْوُ ”قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ“ أَيْ فَمَاذَا قَالَ“ (۱) جملہ متانفہ کی اس حقیقت اور ان اقسام کی روشنی میں آیت کریمہ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ کو اُس کے ماقبل ”فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا“ سے جملہ متانفہ کہنے کا فلسفہ قابل فہم نہیں ہے اس لیے کہ جملہ متانفہ مقدر سوال کے جواب کے بغیر نہیں ہوتا۔ جبکہ آیت کریمہ میں سوالیہ مقدر کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ نیز جملہ متانفہ پر او نہیں آتی جبکہ یہاں پر آئی ہوئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ متانفہ میں فن بلاغت اور علم نحو کی جدا جدا اصطلاحیں ہیں سوال کی بناء بلاغی متانفہ پر ہے جبکہ ہم نے مفسرین کرام کے مطابق آیت کریمہ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ کو جو متانفہ کہا ہے یہ نحوی اصطلاح پڑنی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آمد بلاغت کے نزدیک متانفہ میں مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:

ماقبل سے مفصول ہو یعنی حرف واصل کا اُس پر نہ آنا ضروری ہے کیوں کہ جملہ متانفہ وصل کے مقابلہ میں فصل کی قسم ہے اور فصل اُسی کو کہتے ہیں جس میں حرف واصل یعنی حرف عطف نہ ہو۔ مفتاح العلوم میں ہے:

”وَمَذَارُ الْفَضْلِ وَالْوَصْلِ هُوَ تَرْكُ الْعَاطِفِ وَذِكْرُهُ“ (۲)

اگر کسی جگہ میں اس پر ”واو“ یا ”فا“ آئے بھی ہو تو وہ عاطفہ ہرگز نہیں بلکہ اعتراضیہ کہلاتا ہے۔ حاشیہ کشاف میں میر السید السند نے لکھا ہے:

”وَالْوَاوُ الدَّاخِلَةُ عَلَيْهَا تُسَمَّى وَأَوَا اِغْتَرَا ضِيَةً لَيْسَتْ خَالِيَةً وَلَا عَاطِفَةً وَقَدْ تَدْخُلُ عَلَيْهَا فَأَوَا اِغْتَرَا ضِيَةً أَيْضًا“ (۳)

(۱) تلخیص المفتاح بحث الفصل والوصل، ص 40۔

(۲) مفتاح العلوم یوسف سکاکی، ص 108، مطبوعہ بیروت۔

(۳) حاشیہ کشاف میر السید السند، ج 1، ص 248۔

ماقبل سے پیدا ہونے والے سوال مقدر کا جواب ہو چاہے یہ سوال جس نوعیت کا بھی ہو۔ جیسے مفتاح العلوم میں اس کی مکمل تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَنَائِيَهُمَا أَنْ يَكُونَ الْكَلَامُ السَّابِقُ بِفَحْوَاهِ كَالْمَوْزِدِ لِلْسُّوَالِ فَتَنْزِلُ ذَلِكَ مَنْزِلَةً الْوَاقِعِ وَيَطْلُبُ بِهِذَا الثَّانِي وَقُوْعُهُ جَوَابُهُ فَيَقْطَعُ عَنِ الْكَلَامِ السَّابِقِ عَلَى مَوْقِعِهِ“ (۱)

ماقبل سے منقطع ہونے کے باوجود ایسا اتصال بھی ہو جیسے سوال اور اس کے جواب کے مابین ہوتا ہے۔ تلخیص المفتاح میں ہے؛

”وَأَمَّا كَوْنُهَا كَالْمُنْتَصِلَةِ بِهَا فَكُونُهَا جَوَابًا لِلْسُّوَالِ اقْتَضَتْهُ الْاُولَى فَتَنْزِلُ مَنْزِلَةً فَيُفْضَلُ عَنْهَا كَمَا يُفْضَلُ الْجَوَابُ عَنِ السُّوَالِ“ (۲)

کتاب المطول میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”لِمَا يَنْبَغِيهِمَا مِنَ الْإِتِّصَالِ“ (۳)

اس کے مقابلہ میں نحاۃ کے نزدیک جملہ مستانفہ کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ وہ ماقبل سے منقطع ہو یعنی اس کے حکم اور اعراب میں شریک نہ ہو۔ عام اس سے کہ ماقبل سے پیدا ہونے والے کسی سوال کا جواب ہو یا نہ ہو۔

نیز کلام کے درمیان واقع ہونے والے جملہ کو مستانفہ کہنے کی طرح نحاۃ کے نزدیک ابتدائی جملہ کو بھی مستانفہ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ محل اعراب میں نہ ہونا ان دونوں میں مشترک ہے، مابہ الامتياز کے ان خصوصیات کے علاوہ مستانفہ عند البغاء اور مستانفہ عند النحاۃ کے مابین دو باتیں قدر مشترک ہیں؛

(۱) مفتاح العلوم، 10۔

(۲) تلخیص المفتاح، ص 40، بحث الفصل والوصل۔

(۳) کتاب المطول للفتاویٰ، ص 258، مطبوعہ قم ایران مع حاشیہ میر السید السند۔

پہلی بات :- یہ دونوں محل اعراب سے خالی ہوتے ہیں یعنی مرفوع، منصوب اور مجرور ہونا اس کا کسی فریق کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔ مغنی اللہیب عن کتب الاعراب میں محل اعراب سے خالی جملوں کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”ثُمَّ الْجُمْلُ الْمُسْتَانْفَةُ نَوْعَانِ أَحَدُهُمَا الْجُمْلَةُ الْمُفْتَتَحُ بِهَا النِّطْقُ كَقَوْلِكَ ابْتِدَاءً زَيْدٌ قَائِمٌ وَمِنْهُ الْجُمْلُ الْمَفْتَتَحُ بِهَا السُّوَرُ وَالثَّانِي الْجُمْلَةُ الْمُنْقَطِعَةُ عَمَّا قَبْلَهَا نَحْوَمَاثٍ زَيْدٌ رَحِمَهُ اللَّهُ“ (۱)

دوسری بات :- جس نحوی مستانفہ پر ”واو“ آئی ہوئی ہو اسے ہر دونوں فریق جملہ مقررہ یا جملہ اعتراضیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں علم بلاغت کے مشہور امام جابر اللہ الزمخشری نے تفسیر الکشاف میں پیش نظر آیت کریمہ کی بلاغی حیثیت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے؛

”فَإِنْ قُلْتَ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ مَا مَحَلُّهَا قُلْتَ لَا مَحَلَّ لَهَا لِأَنَّهَا جُمْلَةٌ اِغْتَرِبَتْ اِضْيَافًا“

اس کی تشریح کرتے ہوئے میر السید السند نے لکھا ہے؛

”وَالْوَاوُ الدَّاخِلَةُ عَلَيْهَا تُسَمَّى وَأَوَّ اِغْتَرِبَتْ اِضْيَافًا لَيْسَتْ حَالِيَةً وَلَا عَاطِفَةً وَ قَدْ تَدْخُلُ عَلَيْهَا فَأَوَّ اِغْتَرِبَتْ اِضْيَافًا“ (۲)

تفسیر الفتوحات الالہیہ میں لکھا ہے؛

”وَوَاوُهَا لَيْسَتْ عَاطِفَةً بَلْ لِلْاِسْتِنَافِ فَلَا مَحَلَّ لَهَا مِنَ الْاِعْرَابِ“ (۳)

فریقین کے مابین جملہ مستانفہ کے حوالہ سے مابہ الاشتراک اور مابہ الانفراق کی اس تفصیل کو پیش نظر رکھ

(۱) مغنی اللہیب عن کتب الاعراب، لامام النحو جمال الدین ابن هشام۔

(۲) حاشیہ الکشاف لمیر السید السند مع الکشاف، ج 1، ص 248۔

(۳) الفتوحات الالہیہ، ج 1، ص 29، تحت الآیۃ المذكورۃ۔

کربعض مفسرین نے آیت کریمہ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ کو ماقبل سے جملہ مستانہ اور بعض نے جملہ معترضہ کہے جن میں کوئی تدافع ہے نہ منافات۔ اس کے علاوہ آیت کریمہ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ سے جملہ مستانہ عند البغاء ہونے کے احتمال کی نفی بھی نہیں کی جاسکتی بلکہ جملہ معترضہ عند الفریقین و مستانہ عند النجاة کہلانے کے باوجود اس احتمال سے بھی خالی نہیں ہے کہ مستانہ عند البغاء کی خاص صورت پر مشتمل ہو یہ وہ ہے جس میں کسی خاص کردار سے پیدا ہونے والے سوال کا جواب ہو۔ جیسے اس شعر میں:

زَعَمَ الْعَوَاضِلُ اِنِّي فِي غَمْرَةٍ صَدَقُوا وَلَكِنْ غَمْرَتِي لَا تَنْجِلِي
ملا مت کرنے والی جماعتوں نے گمان کیا کہ میں سختی میں ہوں انہوں نے سچ گمان کیا لیکن میری سختی معاف نہیں ہوتی۔

شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ”صدقوا“ جملہ مستانہ ہے۔ جس سے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے جو سابق کلام سے پیدا ہو رہا تھا کہ میرے متعلق گمان میں وہ سچے ہیں یا جھوٹے؟
پیش نظر آیت کریمہ میں بھی اس جیسے سوال و جواب کا امکان موجود ہے وہ اس طرح کہ جب اس سے قبل والے جملہ ”فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا“ میں مکرر قرآن کی عاجزی کا بتایا گیا کہ قرآن شریف جیسے کوئی سورۃ اب تک لانے سے عاجز ہونے کا انہیں یقین ہو چکا ہے کیا آئندہ بھی ایسے ہی عاجز رہیں گے یا لاسکیں گے؟

جس کا جواب جملہ مستانہ کے انداز میں دیا گیا کہ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ یعنی کبھی نہیں لاسکو گے۔

علم بلاغت کے باریک گوشوں کے پیش نظر آیت کریمہ کے اس بلاغی نکتہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا خاص کر جملہ مستانہ اعتراض کے زموں نہایت فکر آزا مہوتے ہیں۔ کتاب المطول میں کہا ہے:

”وَالْاِسْتِثْنَاءُ بَابٌ وَاسِعٌ مُتَكَثِرُ الْمَحَاسِنِ“ (۱)

اور استثنیاف عند البغاء میں ضروری ہے کہ وہ سوال مقدر کا جواب ہو۔ جسے محسوس کرتے ہوئے پیش نظر

آیت کریمہ کے کنز الایمانی ترجمہ میں ”اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے“ کہا گیا ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ علم نحو اور بلاغت کے یہ زموں اگر پیش نظر نہ ہوتے تو پھر آیت کریمہ کے ترجمہ میں ان الفاظ کا اضافہ کبھی نہ کرتے کیوں کہ کنز الایمان کے مصنف نے جس منہج پر آیات قرآنی کے ترجمہ کو استوار کیا ہے اس میں ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ متن کے الفاظ کے مطابق اپنے نئے الفاظ استعمال کرے۔ جس میں کوئی جملہ اضافہ کرنا تو دور کی بات ہے ایک کلمہ زیادہ استعمال کرنے سے بھی اجتناب کرتے ہیں بلکہ علم بلاغت کے عین مطابق ایک حرف کی کمی و بیشی کو بھی آیات قرآنی کے ترجمہ کے منافی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ کہ آیت کریمہ سے مقصد کو ظاہر کرنے میں کوئی لسانی رکاوٹ پیش آجائے یا کسی موقوف علیہ علم فن کے حوالہ سے ناگزیر مقتضی موجود ہو، جیسے پیش نظر آیت کریمہ ”وَلَنْ تَفْعَلُوا“ کا جملہ استثنیاف اعتراضیہ ہونا اس اضافہ کے لے ناگزیر موجب تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے جملہ شرائط پر یکساں نظر رکھنا اور اس کے تقاضوں کو نبھانے کا فریضہ انجام دینا کنز الایمانی ترجمہ کے سوا کہیں اور ناپید ہے۔ لیکن قرآن فہمی کے حوالہ سے مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ معیاری ترجمہ کی اہمیت، اس کی شرائط اور اس کے تقاضوں کی پہچان ہی مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ نیم خواندہ حضرات کا گلہ ہی کیا جبکہ اس حوالہ سے اچھے خاصے علماء کرام بھی غفلت برت رہے ہیں۔ (فَالِیَ اللّٰهِ الْمُسْتَعْلٰی)

(فَلِلّٰهِ دَرُّهُ مَتَرٌ جَمًّا مَّا اَبْلَغَهُ مَا اَفْصَحَهُ مَا اَكْمَلَهُ بَصِيرَةً فَجَزَاهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ)

☆☆☆☆☆

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا فلسفہ

دو تین سال قبل ماہنامہ آوازِ حق میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے متعلق بہت دلچسپ مباحث شائع کیے جاتے تھے جس سے قارئین کو اس حوالہ سے کافی روشنی ملتی تھی جب سے مدارج العرفان کا مضمون شائع ہونا شروع ہوا ہے تب سے دوسری علمی گفتگو کے لیے مجلہ میں صفحات ہی نہیں ہوتے جبکہ اہل علم اس مجلہ سے علمی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کی حقیقت کیا ہے؟ اور وحدۃ الشہود کی کیا ہے؟ نیز آیا وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کیا آپس میں متضاد ہیں یا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور ہمارے یہاں پنجاب میں سلسلہ قادریہ اور سلسلہ نقشبندیہ کے کچھ حضرات اس حوالہ سے لڑتے رہتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ عقیدت رکھنے والے حضرات وحدۃ الوجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اسی طرح حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف خود کو منسوب کرنے والے بعض حضرات وحدۃ الشہود کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں اور بعض انتہا پسند نقشبندی قادر یوں کو ختم گاہ کہتے ہیں یعنی ناپنے کو دینے سے مخرف خشک مزاج جبکہ ان کے مقابلہ میں دوسرا فریق ”مُکَلِّفُ نَفْسِ بَدِیْ عُدُوْ عَلَیْ“ کہتا ہے۔ آیا ان میں سے کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ مہربانی کر کے آوازِ حق کی قریبی اشاعت میں اس پر روشنی ڈالیں۔

ماسٹر رب نواز اراکین، گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 2، ڈی آئی خان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جواب:- انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں سے ہر ایک حق ہے، قرآن و سنت سے مستفاد ہے اور حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی، حضرت شیخ کبیر صدر الدین قونوی، مولانا جلال الدین رومی، حضرت خواجہ

عبداللہ انصاری، حضرت سہل ابن عبداللہ التستری، حضرت شاہ نعمت اللہ ولی اور مولانا عبدالرحمن جامی جیسے مسلمہ بزرگان دین کی علمی دستاویزات سے مُفْرَح و مشرُوح ہے لیکن اہل تقلید و اہل استدلال حضرات کی فہم سے ماوراء ہونے کی بنا پر وہ اس کے ساتھ مکلف بھی نہیں ہیں اور اس کے خلاف کوئی آواز جب بھی اٹھی ہے یا اٹھائی جا رہی ہے وہ صرف ان دو طبقوں کی طرف سے ہے جو ان کی مجبوری ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ الہیات کے حوالہ سے انسانوں کو حاصل ہونے والے علم کی تین قسمیں ہیں۔ تقلیدی، استدلالی اور کشفی۔

تقلیدی سے مراد ان حضرات کا علم ہے جو خود مسائل کو ان کے منابع سے اخذ کرنے سے قاصر ہیں جیسے متاخرین کا اپنے اسلاف و اکابرین کے بتائے ہوئے مسائل و احکام اور فتاویٰ جات و تعبیرات پر عمل کرنا۔

استدلالی سے مراد ان حضرات کا علم ہے جو شرعی احکام کو ان کے اصل منابع سے اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی قوت فکری کو صرف کر کے احکام پر ان کے اصول و مآخذ سے استدلال کرتے ہیں جیسے غیر منصوص مسائل میں متقدمین کا اندازِ عمل جو ان کے استدلال پر مبنی ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

کشفی سے مراد ان مخصوص کاملین کا علم ہے جن کی نگاہ بصیرت میں نظریات بمنزلہ بدیہیات ہوتے ہیں، اہل استدلال و اہل تقلید کی بصیرت سے ماوراء چیزیں ان کے تحت البصیرت ہوتے ہیں اور ماوراء العقل والحواس امور ان کی نگاہ میں بمنزلہ مشاہدات ہوتے ہیں اور وہ اپنی ایمانی فراست کی وجہ سے حدیث نبوی ﷺ ”اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ“ (مسلم شریف، ج 2، ص 506، ابواب الزہد) کی جھلک ہوتے ہیں۔

اصحاب علم کے ان تینوں طبقوں کے لیے حصول علم کے ذرائع ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بنا پر عملی زندگی میں بھی یہ ایک دوسرے سے شاکِی اور معترض رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر

تقلیدی علم والے دائرہ تقلید میں محدود و مجبوس ہونے کی بنا پر استدلالی علم والوں کو اپنے دائرہ حدود سے متجاوز دیکھ کر اُن پر اعتراض کرتے ہیں اور انہیں خطا کا سمجھ کر اُن کے خلاف فتویٰ جاری کرتے ہیں جو اُن کے دائرہ تقلید کا تقاضا ہوتا ہے۔ اسی طرح استدلالی علم والے اپنے دائرہ استدلال اور نظر و فکر کی دنیا میں محدود ہونے کی وجہ سے کشفی علم والوں کو اپنی رسائی فہم سے متجاوز دیکھ کر اُن پر اعتراضات کا انبار لگا دیتے ہیں اور اپنے علم کے مطابق اُن کے خلاف فتویٰ جاری کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں جبکہ کشفی علم والے اپنے دائرہ فراست و مشاہدہ کے مطابق ہر دونوں پر تعجب کرنے کے ساتھ اُن پر رحم بھی کھاتے ہیں کہ کاش وہ تقلید کے حصار میں مجبوس اور نظر و فکر کی کلفت کے اسیر ہونے کے بجائے رُتبہ کشف پر فائز ہوتے تو کبھی ہم پر اعتراض نہ کرتے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ تقلیدی و استدلالی دونوں علوم میں غلطی کا احتمال موجود ہوتا ہے جبکہ مخصوص کا ملین کے کشفی علم میں غلطی کا احتمال قطعاً نہیں ہوتا کیوں کہ وہ بمنزلہ مشاہدات ہونے کی بنا پر خلاف حقیقت ہونے کے شائبہ سے بھی محفوظ ہوتا ہے اور فراست ایمانی کا ثمر ہونے کی وجہ سے ہر قسم شکوک و شبہات اور مخالف احتمالات سے مبرا ہو کر عین الیقین کے درجہ میں ہوتا ہے اور یہ کشفی علم تقلیدی و استدلالی علم والوں کی رسائی فہم سے ماوراء ہونے کی بنا پر علم باطن بھی کہلاتا ہے کیوں کہ بداہت عقل و حواس سے ماوراء ہر چیز باطن ہی کہلاتی ہے اور ظاہری علم یعنی حواس و عقل سے ادراک کیے جانے والے علوم و فنون کی متعدد قسمیں ہونے کی طرح اِس کی بھی بے شمار قسمیں ہیں جن میں سے ہر قسم کا ملین کی مخصوص استعداد کے مطابق ہی من جانب اللہ انہیں عطا کی جاتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک کے کشفیات و معارف دوسرے کو بھی معلوم ہو نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر طبقہ کمال کا اپنا مقام اور اُس کے جدا تقاضے ہوتے ہیں حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا:

”ہر مقام در اعلوم و معارف جدا است و ہر حال در اقال علیحدہ ہس

فی الحقیقت تدافع و تناقص در علوم نباشد“ (۱)

(۱) مکتوبات امام ربانی، حصہ سوم، دفتر اول، مکتوب نمبر 160، ص 47۔

اِس کی ایسی مثال ہے جیسے ظاہری علوم و فنون میں کسی کی استعداد اور میلان طبع کے مطابق لسانی علوم کے کسی خاص شعبہ میں مہارت ہوتی ہے اور کسی دوسرے کے میلان طبع و استعداد کے مطابق عقلیات و معنویات کے کسی خاص شعبہ میں اور کسی کو الہیات کے کسی شعبہ میں تو کسی اور کو طبعیات یا نفسیات وغیرہ میں مہارت ہوتی ہے۔ الغرض علوم و معارف کی یہ تقسیم انسانوں کی ازلی استعداد کی تابع اور اُس کے مطابق ہے۔ اسی طرح کا ملین پر منکشف ہونے والے باطنی علوم و معارف بھی اُن کی باطنی استعداد، طہارت نفس، صفائی قلب اور قلب سلیم کی شرح تناسب کے مطابق ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک کامل پر منکشف ہونے والے حقائق دوسرے کامل پر بھی منکشف ہو، دوسرے پر منکشف ہونے والے تیسرے پر بھی منکشف ہو اور تیسرے پر منکشف ہونے والے حقائق و معارف چوتھے پر بھی منکشف ہوں۔ نہیں کشفی علوم و معارف کے سلسلہ میں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے کشفیات و معارف اُسی کی استعداد کے مطابق ہوتے ہیں اور ظاہری علوم کے ہر شعبہ کے ماہرین کا دوسرے شعبہ کے ماہرین سے جدا جدا دائرہ کار ہونے کی طرح مختلف باطنی علوم کے حامل اِن کا ملین کے بھی یعنی وحدة الوجود اور وحدة الشهود کا علم بھی طبقات علم کی مذکورہ قسموں سے خالی نہیں ہے۔

جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ جن نیم خواندہ حضرات نے اپنے بزرگوں سے جیسے سناویسی ہی اُن کی تقلید کی یعنی جن کے پیشواؤں نے انہیں وحدة الوجود کے حق ہونے کا کہا انہوں نے اُن کی تقلید میں اِسی کا عقیدہ بنالیا اور اِس کے خلاف سننے کے لیے تیار نہیں کیوں کہ تقلیدی علم کا تقاضا ایسا ہوتا ہے۔ اِسی طرح جن کے اکابرین نے انہیں وحدة الشهود کے حق ہونے کا کہا انہوں نے بھی اُن کی تقلید کرتے ہوئے اِسی پر عقیدہ جمالیا اور اِس کے خلاف سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جن کے بزرگوں نے انہیں اِس ترتیب کے ساتھ دونوں کے حق ہونے کا کہا کہ وحدة الوجود، وحدة الشهود کو پانے کے لیے بمنزلہ زینہ ہے، اُس سے مقدم ہے، اُس کو پانے کے لیے منزل راہ ہے اور اُسے حق سمجھ بغیر وحدة الشهود کے انکشاف پر فائز ہونا ممکن نہیں ہے۔ ماتحتوں کو ایسا سبق دینے والے خود بھی حق ہوتے ہیں اور

اُن کی تقلید کا پتہ گلے میں ڈال کر اُس پر ڈٹے رہنے والے مقلد بھی مُصیب اور حق بجانب ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مذکورہ دونوں مقلدوں کا خطی یا مصیب اور باطل و حق ہونے کی کوئی ایک صورت بھی واضح نہیں ہے کیوں کہ مقلد بمنزلہ نایاب ہوتا ہے جس کے منزل مقصود تک پہنچنے یا نہ پہنچنے کا دار و مدار اُس کی رہنمائی پر ہوتا ہے کہ رہنمائی کرنے والا اگر درست سمت رہنمائی کرے تو اُس کی تقلید کرنے والا بھی مصیب اور منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح اپنے ماتحت مقلدین کو وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود میں سے ایک کو حق بتانے والے نے دوسرے کے حق ہونے سے انکار کر کے صرف اُسی ایک کو حق کہا ہے تو پھر مقلد و مقلد دونوں خطا کار ہیں۔ شاید ایسے ہی کج فہم تابع و متبوع سے متعلق حضرت امام برہان الدین المرغینانی (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے فرمایا تھا:

فَسَادُ كَثِيرٍ عَالِمٍ مُنْهَكٌ..... وَانْجِبَ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَبِّكٌ

اور اگر دونوں کے حق ہونے کا کہا تھا یا دوسرے سے سکوت کر کے صرف ایک کے حق ہونے کا کہا تھا لیکن اُس کی تقلید کرنے والوں کو مغالطہ ہوا کہ انہوں نے دوسرے کے ناقی ہونے کے قول کو اُس بے گناہ کی طرف منسوب سمجھ کر نہ صرف خود خطا کار و خطی ہو رہے ہیں بلکہ اپنے حلقہ اثر سے متعلق آئندہ نسلوں کو بھی اس راہ خطا پر ڈال رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے متعلق مقلدین کی متعدد مثالیں ہیں۔ جن میں قوت استدلال اور نظر و فکر کی صلاحیت ہوتی ہے نہ کشف کی اہلیت بلکہ جیسے سنا ویسے ہی آگے چلا رہے ہیں جبکہ وحدۃ الوجود سے متعلقہ علم استدلالی ہوتا ہے جس میں استدلال کرنے والے اہل نظر وہ کاملین ہوتے ہیں جو باطن کی صفائی اور قلب سلیم کے حوالہ سے ظاہر بین اہل نظر سے بالاتر اور اہل کشف کے قریب تر ہوتے ہیں جس کی بدولت اُن کا استدلال بھی فراست ایمانی کا ثمر ہوتا ہے اور اہل ظاہر کے پائے چوبین کی بے تمکینی کے برعکس پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہوتا ہے جیسے مولانا جلال الدین رومی نے حضرت صدر الدین قونوی کے اس رُتبے سے متعلق فرمایا ہے:

ہائے استدلالیان چوبین بود
ہائے چوبین سخت بے تمکین بود
غیر آن قطبِ زمان دیدہ و در
کذبانش کویہ گردد خیرہ سر

شکوک و شبہات بے پاک توٹ استدلال کے اس عظیم رُتبے پر فائز ہونے کی بنا پر اس مقدس طبقہ کو اگر ظاہری اہل نظر اور اہل کشف کے مابین برزخ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان حضرات کا کمال بالائے کمال یہ کہ وحدۃ الوجود پر ان کا استدلال قرآن و سنت سے متجاوِز نہیں ہوتا۔ مثلاً نمونہ از خردارے یہ کہ آیت کریمہ ”هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ“ (الحدیہ، 3) یعنی اللہ تعالیٰ ہی اول اور وہی آخر اور وہی ظاہر اور وہی باطن۔

ان حضرات کی طرف سے اس آیت کریمہ سے وحدۃ الوجود پر کیے جانے والے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف سے خالی نہیں ہے۔ یعنی ایک وجہ سے اول ہے تو دوسری وجہ سے آخر ہے، اسی طرح ایک حیثیت سے ظاہر ہے تو دوسری حیثیت سے باطن ہے، اور یہ سب کچھ وجود کے اعتبار سے ہے اور وجود سب کا ایک ہے جو قابل کثرت نہیں ہے کہ موجودات کی کثرت کے مطابق متعدد ہو سکے اگر فرق ہے تو وہ صرف وجوب و امکان میں ہے، خالق و مخلوق میں ہے، قدیم و حادث میں ہے اور علت و معلول ہونے میں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ اپنے ان اوصاف میں محض حقیقت ہے اور مستقل ہے جبکہ مخلوق اپنے ان اوصاف میں اُسی کے محتاج اُسی کی طرف منسوب اور منہ البدلیۃ والیہ النہایہ ہیں۔ جیسے فرمایا:

كُلُّ مَافِي الْكَوْنِ وَهُمْ أَوْحِيَالٌ أَوْعُكُوسٌ فِي الْمَرَايَا أَوْ ظَلَالٌ
کون نہیں جانتا کہ کسی اصل کی طرف منسوب ہوئے بغیر وہم کا وجود ممکن ہے نہ خیال کا اور شیشہ میں نظر آنے والی صورت کا وجود ہو سکتا ہے نہ سایہ کا۔ الغرض وحدۃ الوجود پر شرح صدر کی حد تک تسلی و اطمینان

اور حق الیقین کا رتبہ حاصل ہونے کے بعد ہی وحدۃ الشہود پر کشفی علم یعنی عین الیقین حاصل ہوتا ہے جو مخصوص کالمین میں اہل کشف کا خاصہ ہوتا ہے اور کالمین کا یہ طبقہ وحدۃ الوجود پر مطلع ہونے والے استدلالی طبقہ کالمین سے صفائی باطن، انابت الی اللہ اور قلب سلیم کے حوالہ سے بالاتر ہوتا ہے کیوں کہ وجود کی وحدت کو استدلال کے ذریعہ سمجھنے کی تکلیف اٹھانے کے بجائے مشاہدہ سمجھتا ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے اور مشاہدہ کی یہ صورت بصیرت حدی یا فراست ایمانی سے خالی نہیں ہے تو پھر استدلال کی کلفت اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

خلاصہ الکلام :- وحدۃ الوجود کے رتبہ میں بین الحق و بین الخلق وجود کی وحدت کو ایسے استدلال کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے جو واقعی ہے، شکوک و شبہات سے پاک ہے اور حق الیقین پر منتج ہے جبکہ وحدۃ الشہود کے رتبہ میں اسی وحدت کا شہود بالبصیرت ہوتا ہے، فراست ایمانی کا شمر ہوتا ہے اور نظر و فکر دوڑانے سے استغناء و آزادی ہوتی ہے جیسے حضرت شیخ اکبر علی الدین ابن عربی (نور اللہ مرقدہ الشریف) نے فصوص الحکم کے فص اسحاقی میں فرمایا:

فَمَنْ شَهِدَ الْأَمْرَ الَّذِي قَدْ شَهِدْتُهُ يَقُولُ بِقَوْلِي فِي خَفَاءٍ وَاعْلَانٍ

بزرگان دین کے زمرہ میں اہل نظر و اہل کشف کے مطابق وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو

ایک دوسرے کے متضاد قرار دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے کتابات شریف میں واضح لکھا ہوا ہے کہ وہ بھی اپنے والد کی طرح اُس وقت تک بین الحق و بین الخلق وجود کی وحدت کو نظر و فکر سے سمجھنے کے رتبے پر فائز رہا جب تک حضرت خواجہ باقی باللہ کی توجہات میسر نہ ہوئی تھی اور حضرت کی توجہات کی برکت سے ترقی کر کے وحدۃ الشہود کے رتبے پر فائز ہوا جس میں بین الحق و بین الخلق وجود کی وحدت کا مشاہدہ بالبصیرت ہوتا ہے اور ایمانی فراست کا شمر ہوتا ہے۔ حضرت کی اپنی عبارت مکتوب نمبر ۳۱ بنام شیخ صوفی میں یوں ہے:

”مخدوما مکروما معتقد فقیر از خود ردی بار مشرب اہل توحید بود

والد فقیر قدس سرہ بظاہر برہمیں مشرب بودہ اندوہر سبیل دوام
بہمین طریق اشتغال داشته اند باوجود حصول نگرانی تمام در
باطن کہ بجانب مرتبہ بی کیفی داشته اند و بحکم ابن الفقیہ
نصف الفقیہ فقیر را ازین مشرب از درونی علم حفظ وافر بود ولذت
عظیم داشت تا آنکہ حق سبحانہ تعالیٰ بہ محض کرم خویش
بخدمت ارشاد پناہی حقائق و معارف آگاہی مویذ الدین الرضی
شیخنا و مولنا و قبلتنا محمد الباقی قد سنا اللہ تعالیٰ بسرہ رسانید
و ایشان بہ فقیر طریقہ علیہ نقشبند یہ تعلیم فرمودند و توجہ بلیغ
بحال ابن مسکین مرغی داشتند بعد از ممارستہ این طریقہ علیہ
در اندک مدت توحید وجود منکشف گشت و غلود دین کشف
پیدا شد علوم و معارف ابن مقام فراوان ظاہر گشتند و کمر
فیقہ از در فائق ابن مرتبہ مانده باشد کہ آن را منکشف نہ گردانید
ند در فائق معارف شیخ محی الدین ابن العربی را کما ینبغی لایح
ساختند“ (۱)

بزرگان دین کی اس روشنی میں علماء حق کو چاہئے کہ اُن لوگوں کی اصلاح کریں جو ان کو متضاد
کہہ کر ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لیے پھر رہے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اسلامی تربیت و تعلیم سے محروم
ہیں اور حقیقی صوفیاء کرام کے طریقہ عمل سے دور ہیں جو کرنے کے ضروری مسائل چھوڑ کر اس قسم غیر
ضروری مباحث میں نہ صرف خود پڑے رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی الجھاتے رہتے ہیں۔ نیز یہ لوگ
نظر و فکر کی صلاحیت سے محروم محض مقلد یا اہل نظر و استدلال کے نچلے طبقہ میں ہونے کی وجہ سے ان

مباحث کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے دائرہ استطاعت سے ماوراء مباحث میں پڑے گا ایسے ہی ٹھوکریں کھائے گا جو یہ کھارہے ہیں۔ (أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ)

یہ لوگ اس وجہ سے بھی قابلِ رحم ہیں کہ یہ غیر معیاری مشائخ اور جعلی پیروں کی ناقص صحبت کے اسیر ہونے کی وجہ سے حقیقی مشائخ اور علماء حق کی بابرکت صحبت سے محروم ہیں۔ کچھ نیم خواندہ حضرات کو وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہور کے حوالہ سے جو اختلاف نظر آ رہا ہے اور جس بنیاد پر یہ حضرات، حضرت مجدد الف ثانی جیسے کامل و اکمل رہنمائے اسلام کو وحدۃ الوجود سے منحرف بتا رہے ہیں اور انہیں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی (نور اللہ مرقدہ الشریف) کے توحیدی نظریہ کے خلاف کہہ رہے ہیں اس کی بنا حضرت مجدد نو اللہ مرقدہ کے مکتوب نمبر 31 ہے جو حقیقت میں اس الزام سے پاک ہے لیکن نیم خواندہ حضرات نے سلفیہم کی بنا پر حضرت کے اس کثیر المعارف مکتوب کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے جبکہ حقیقت میں حضرت کے یہ مکتوب شریف حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کی فصوص الحکم شریف اور فتوحات مکیہ شریف کے اُن مقام کی حقیقی تشریح ہے جن میں وحدۃ الوجود سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ اللہ نے توفیق دی تو حضرت کے اس مکتوب شریف کی مکمل تشریح دنیا کے سامنے پیش کروں گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

☆☆☆☆

سورة البقرہ، آیت 38 کی تفسیر

مسئلہ یہ ہے کہ ماہنامہ آواز حق میں ریگولر تحریر جو قرآن شریف کے تراجم کے مابین تقابلی جائزہ سے متعلق ہے اُس میں سورة البقرہ، آیت نمبر 38 سے متعلق کنز الایمانی ترجمہ کی جن خوبیوں کو ذکر کیا گیا ہے وہ جامعیت کی اعلیٰ مثال ہونے کے باوجود مسئلہ ابھی تک تشکیک ہے وہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے ہدایات و احکام کا آنا امر واقعی ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بھی شک سے پاک ہے تو پھر ”فَمَا يَتَّبِعُكُمْ مِّنْ شَيْءٍ هَٰذَا“ (البقرہ، 38) جیسے شک پر دلالت کرنے والے شرطیہ کلام کا کیا مصرف ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان میں اور خاص کر لسانِ قرآنی میں حرف شرط ”إِنْ“ شک کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے المفصل فی اللغو میں ہے:

”وَلَا تُسْتَعْمَلُ إِنْ إِلَّا فِي الْمَعَانِي الْمُخْتَمِلَةِ الْمَشْكُوكِ فِي كَوْنِهَا“

یعنی ”اِنْ“ شرطیہ استعمال نہیں کیا جاتا مگر اُن معانی میں جن کے ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو۔

علمِ نحو کے اس اصول سے واقف حضرات کے لیے یہ آیت کریمہ ناقابلِ فہم اس لیے ہے کہ لسانِ قرآنی کے اس اصول سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف شک کی نسبت بھی نہیں کی جاسکتی کہ اُس عالم الغیب والشہادۃ ذات کو انسانوں کی طرف ہدایات و احکام بھیجنے میں شک تھا۔ (العیاذ باللہ)

السائل..... قاری بہادر خان (مولانا) ناظم الامور دارالعلوم جامعہ نعیمیہ بلاک نمبر ۱۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی، 14/09/2010

جواب:- انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ سوال صرف اس ایک مقام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قرآن شریف کے ان تمام مقامات پر اس کا تصور اٹھتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکطرفہ فیصلہ ہونے والے امور قطعاً کو ”ان“ شرطیہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں نہ صرف یہ کہ متعدد مقامات پر اس کی مثالیں موجود ہیں بلکہ بعض جگہوں میں ایک ہی آیت کریمہ میں ایک سے زیادہ مثالیں مذکور ہوئی ہیں۔ جیسے ”وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمْ أَنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ (البقرہ، 23) کے آغاز میں ”وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا“ کے انداز میں اور آخر میں ”إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ کے انداز میں اور اس کے متصلاً بعد ”فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا“ (البقرہ، 24) کے الفاظ میں یہ سب اس کی مثالیں ہیں۔ مذکورہ سوال کا تصور ان سب میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ”لَقَدْ صَدَّقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَنَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ“ (الحج، 27) جیسے مقامات پر بھی اعتراض کا یہی تصور لگا ہوں کے سامنے آ جاتا ہے جس کو محسوس کرتے ہوئے ہر مقام پر مفسرین کرام نے بھی اپنے اپنے انداز میں اس کی توجیہات پیش کی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام مقامات تنکلم کی طرف سے شک پر نہیں بلکہ مخاطب کی طرف سے عدم جزم کی بنا پر ہیں جو کلام کرنے کا مخصوص انداز ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو بطور تمہید سمجھنا ضروری ہے؛

تمہید اول:- علم نحو کی جن کتابوں میں حرف ان شرطیہ کے استعمال کو مواقع شک کے ساتھ جو مختص کہا گیا ہے یہ فی الجملہ درست ہونے کے باوجود جامع نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ آئمہ بلاغت کی تعبیر زیادہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ ”ان“ شرطیہ میں اصل یہ ہے کہ اُس کا مدخول جزم و یقین سے خالی ہونا ہے۔ مفتاح العلوم میں ہے؛

”أَمَّا إِنْ فَهِمَ لِلشَّرْطِ فِي الْإِسْتِقْبَالِ وَالْأَصْلُ فِيهَا الْخُلُوعُ عَنِ الْجَزْمِ بِوُقُوعِ

الشَّرْطِ كَمَا يَقُولُ الْقَائِلُ إِنْ تَكْرُمْنِي أَكْرِمَكَ وَهُوَ لَا يَعْلَمُ أَتَكْرِمُهُ أَمْ لَا فَإِذَا اسْتَعْمِلْتَ فِي مَقَامِ الْجَزْمِ لَمْ تَحُلْ عَنْ نَكْتَةِ“
تلخیص المفتاح میں ہے؛

”اصل ان عدم الجزم بوقوع الشرط“

آئمہ بلاغت کی یہ تعبیر نکتہ کی تعبیر سے زیادہ جامع اور مناسب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جزم و یقین کا نہ ہونا وجود شک کی نسبت عام ہے جس کے مطابق جزم و یقین کا نہ ہونا وجود شک کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے اور اُس کے بغیر بھی پایا جاسکتا ہے جیسے ظن، وہم اور تقلید کی صورتوں میں ہوتا ہے جبکہ وجود شک کی صرف ایک صورت ہے جو لفظ ”ان“ کے استعمال کے حوالہ سے معروضی حالات کی منافی ہے اس نکتہ کو محسوس کرتے ہوئے نکتہ کے طبقہ متاخرین نے بھی آئمہ بلاغت کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔ جیسے شرح الکافی فی النحو ”الرضی“ میں اُس پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”إِنَّ إِنْ لَيْسَتْ لِلشَّكِّ بَلْ لَعَدَمِ الْقَطْعِ فِي الْأَشْيَاءِ الْجَائِزِ وَقُوْعُهَا وَعَدَمُ وَقُوْعِهَا لَا لِلشَّكِّ“ (۱)

یعنی حرف ”ان“ شرطیہ شک کے لیے نہیں بلکہ اُن چیزوں کے عدم جزم و یقین کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا واقع ہونا اور نہ ہونا دونوں ممکن ہیں۔

تمہید دوم:- قرآن شریف کی ہر آیت کریمہ بلاغت کی جدا اعجاز پر فائز ہے۔

تمہید سوم:- بلاغت کی دنیا میں کنایہ کو صریح پر فوقیت ہونے کی طرح مجاز کو بھی حقیقت پر فوقیت ہوتی ہے۔ تلخیص المفتاح میں ہے؛

”أَطْبَقَ الْبُلْغَاءُ عَلَى أَنَّ الْمَجَازَ وَالْكِنَايَةَ أَبْلَغُ مِنَ الْحَقِيقَةِ وَالتَّصْرِيحِ“ (۲)

یعنی تمام بلغاء اس پر متفق ہے کہ مجاز حقیقت سے اور کنایہ صریح سے ابلغ ہوتے ہیں۔

(۱) الرضی، ج 2، ص 253، مطبوعہ قم ایران۔ (۲) تلخیص المفتاح، ص 71۔

تمہید چہارم:- کسی خاص نکتہ اور باریک و لطیف منتہی کی بنا پر کلام کو مقتضائ الظاہر کے خلاف انداز میں پیش کرنا بھی علم بلاغت کی ایک صنف ہے مفتاح العلوم میں علم المعانی کے مختلف تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”إِنْ اخْرَاجَ الْكَلَامَ لَا عَلَى مَقْتَضَى الظَّاهِرِ طَرِيقٌ لِلْبَلَاغَةِ يَسْلُكُ كَثِيرٌ تَنْزِيلَ نَوْعٍ مَكَانَ نَوْعٍ بِاعْتِبَارِ مِنَ الْإِعْتِبَارَاتِ فَلْيَكُنْ عَلَى ذِكْرِ مِنْكَ“ (۱)

یعنی کلام کو کبھی مقتضائ الظاہر کے برعکس صادر کرنا بھی بلغاء کا ایک رستہ ہے جس کے مطابق کسی اعتبار کو پیش نظر رکھ کر بہت سے بلغاء ایک نوع کی جگہ دوسرے نوع کو استعمال کرنے کی راہ پر چلتے ہیں۔

تلخیص المفتاح میں ہے:

”وَكَثِيرٌ أَمَّا يُخْرِجُ عَلَى خِلَافِهِ“ (۲)

یعنی بے اوقات کلام کو مقتضائ الظاہر کے خلاف بھی صادر کیا جاتا ہے۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے شرح المطول میں کہا ہے:

”إِنْ وَفَّرَهُ فِي الْكَلَامِ كَثِيرٌ فِي نَفْسِهِ“ (۳)

یعنی مقتضائ الظاہر کے خلاف کلام کرنا بجائے خود کلام بلیغ میں زیادہ ہے اگرچہ مقتضائ الظاہر کے مقابلہ میں کم ہے۔

تمہید پنجم:- ”ان“ شرطیہ کے وضع میں اُس کے مدخول (شرط) کے وقوع یا عدم وقوع کے ساتھ عدم جزم و یقین کبھی متکلم کے حوالہ سے ہوتا ہے اور کبھی مخاطب کے حوالہ سے جلیبی علی المطول میں ہے:

(۱) مفتاح العلوم بحث علم المعانی، ص 104۔

(۲) تلخیص المفتاح بحث احوال الاسناد الخبری، ص 8۔

(۳) کتاب المطول علی التلخیص مع حاشیہ میر السید السند، ص 49، مطبوعہ قم ایران۔

”فَإِنْ إِنْ قَدْ يُسْتَعْمَلُ فِي شَكِّ الْمُخَاطَبِ“ (۱)

یعنی ”ان“ شرطیہ مخاطب کے شک میں بھی کبھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تمہید ششم:- ”ان“ شرطیہ اپنے اصل سے برعکس جب بھی کسی امر متعین میں استعمال ہو جائے وہیں پر کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دوسرے کا احسان بھول کر اپنا احسان جتانے والے کو اپنا احسان یاد دلانے کے لیے کہا جاتا ہے:

”إِنْ أَحْسَنْتَ إِلَيَّ فَقَدْ أَحْسَنْتَ إِلَيْكَ“

یعنی اگر تو نے مجھ پر احسان کیا ہے تو میں نے بھی تجھ پر احسان کیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ یہاں پر ”ان“ شرطیہ کے مدخول یعنی شرط متکلم و مخاطب دونوں کے نزدیک متعین الوقوع ہے کہ اُس کے امر واقع ہونے پر دونوں کو جزم و یقین ہے۔ اس کے باوجود مقتضائ الظاہر کے خلاف صادر کیے جانے والی اس شرط سے مقصد جواب شرط کے انداز میں مخاطب کو اپنے احسان کی طرف متوجہ کرانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح گھر میں کسی شخص کی موجودگی سے متعلق پوچھنے پر اُس کی موجودگی پر جزم و یقین ہونے کے باوجود ملازم کہتا ہے:

”إِنْ كَانَ فِيهَا أَخْبِرُكَ“، یعنی اگر وہ گھر میں ہو تجھے بتاؤں گا۔

یہاں پر اپنے جزم و یقین سے برعکس ان شرطیہ استعمال کرنے سے اُس کا مقصد مالک کا خوف بھی ہو سکتا ہے، مالک کو اُس پوچھنے والے کے شر سے بچانا بھی ہو سکتا ہے، اس انداز کلام کے ذریعہ اُسے ٹھہرانا اور پھنسانا بھی ہو سکتا ہے اور مالک کا پڑھایا ہوا سبق دہرانا بھی ہو سکتا ہے کہ مالک نے اُسے اسی طرح کی ہدایت دے رکھی ہو۔ اسی طرح باپ کا اپنے بیٹوں سے یہ کہنے کی مثال بھی مشہور ہے:

”إِنْ كُنْتُ أَبَاكُمْ فَأَطِيعُونِي“، یعنی اگر میں تمہارا باپ ہوں تو میری اطاعت کرو۔

کون نہیں جانتا کہ یہاں متکلم و مخاطب دونوں کو شرط کے ساتھ جزم و یقین ہے اس کے

(۱) حسن الجلیبی علی المطول، ص 22، مطبوعہ قم ایران۔

باوجود مقتضا الظاہر کے خلاف ان شرطیہ استعمال کرنے سے اُس کا مقصد بیٹوں کے اس جزم و یقین کا عدم بنانا ہے کیوں کہ وہ اپنے اس جزم و یقین کے مطابق عمل نہیں کر رہے ہیں ورنہ نافرمانی کبھی کرتے۔ الغرض ان شرطیہ اپنے مدخول یعنی شرط کے ساتھ جزم و یقین ہونے کی صورت میں جہاں پر بھی استعمال ہوتا ہے خلاف مقتضا الظاہر کہلاتا ہے جو کسی نکتہ و باریک اور لطیف اعتبار سے خالی ہرگز نہیں ہوتا۔ ان مسلمات کو سمجھنے کے بعد قرآن شریف کے اُن تمام مقامات پر اُٹھنے والے مذکورہ اشکال کا جواب آسان ہو جاتا ہے۔ پیش نظر آیت کریمہ ”فَلْيَأْمُرْ أُولَئِكَ بِمَا أُيْمَنُ بِهِمْ“ میں اس طرح کہ حضرت آدم وحواء (عَلَيْهِمَا السَّلَام) کو جنتی زندگی سے متعلق اُکھوتا حکم ”لَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ“ کی شکل میں جو ملتا تھا اُس کی خلاف ورزی کرنے اور جنت سے نکالے جانے کی صورت میں سزا پانے کے بعد وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ دنیوی زندگی سے متعلق ہدایات ملنے کے لیے جزم و یقین کرتے کیوں کہ اُس وقت کے حوالہ سے اُن کے حالات بتا رہے ہیں کہ انہیں ”رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا سَاءًا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ کے دوہرے تصور میں ڈوبے رہنے کے سوا کوئی اور فکر ہی نہیں تھی چہ جائیکہ دنیوی زندگی سے متعلق ہدایات ملنے کے لیے جزم و یقین کر بیٹھے۔ جیسے سورۃ الاعراف، آیت نمبر 23 اور اس کے سیاق و سباق سے معلوم ہو رہا ہے۔ ایسے میں آیت کریمہ ”فَلْيَأْمُرْ أُولَئِكَ بِمَا أُيْمَنُ بِهِمْ“ میں ”ان“ شرطیہ کا استعمال مخاطبین کی طرف سے عدم جزم کی بنا پر ہے۔ جیسے تمہید نمبر 5 میں بیان ہو چکا ہے لیکن آیت کریمہ ”وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا“ میں دونوں کو اس کے مدخول کے ساتھ بالقطع والیقین علم ہے جس میں عدم جزم کا تصور کسی ایک جانب سے بھی نہیں ہے اس کے باوجود خلاف مقتضا الظاہر لفظ ”ان“ کا استعمال صرف اس مقصد کے لیے ہے کہ مخاطبین کے ریب اور اس کے ساتھ اُن کے جزم کو کا عدم بتانا مراد ہے کیوں کہ اس کے خلاف اتنے واضح دلائل موجود ہیں کہ تقلید جلد کے ماحول سے نکل کر آزاد شعور فطرت کے مطابق ذرا توجہ کریں تو یہ آپ ہی زائل ہو سکتا ہے۔ جبکہ آیت کریمہ کے آخری حصہ والی شرط ”إِنْ كُنْتُمْ“

صدیقین“ اس کے برعکس ہے، اصل پر محمول ہے اور مقتضا الظاہر کے مطابق ہونے کے ساتھ اصل پر بھی منطبق ہے کیوں کہ اس میں شرط متکلم کے حوالہ سے متحقق الوقوع ہے نہ مخاطب کے حوالہ سے متکلم کے حوالہ سے اس لیے نہیں ہے کہ یہاں پر متکلم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کو یہاں پر مخاطبین کے صادق ہونے کا نہیں بلکہ اُس کے نقیض یعنی عدم صدق اور کاذب ہونے پر یکطرفہ علم ہے کہ وہ بالیقین کاذب ہیں اور مخاطب کے حوالہ سے اس لیے نہیں ہے کہ صدق اُس قول و عمل اور عقیدہ کو کہا جاتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہو جبکہ یہاں پر مخاطبین کا عقیدہ جمل مرکب یا اندھی تقلید سے خالی نہیں ہے جو خلاف واقعہ ہوتا ہے ایسے میں شرط ”كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ کے اول میں آئے ہوئے حرف شرط ”ان“ کے استعمال کو محمول علی الاصل اور اخراج الکلام علی وفق مقتضا الظاہر کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

حاشیتی اضافہ:- مدارس اسلامیہ کے اساتذہ کرام بالخصوص تفسیر بیضاوی اور جلالین پڑھنے اور پڑھانے والے حضرات کو اس سے روشنی لینے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس آیت کریمہ کے تصور کے ساتھ ہی اس کی نحوی اور ترکیبی حیثیت کے حوالہ سے پیش نظر اشکال کا تصور ہونا امر یقینی ہے جس کے حل پر ان تفسیروں میں توجہ دی گئی ہے نہ ان کی شروح و حواشی میں جبکہ آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کو اس قسم شبہات سے پاک و محفوظ کر کے آگے منتقل کرنا فرانس منہی میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح معنی میں اپنی کتاب کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

تمہید ہفتم:- آیت کریمہ ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا﴾ میں لفظ ”ان“ کے استعمال کے حوالہ سے تفصیل ہے جس پر نظر رکھے بغیر اس حوالہ سے کچھ کہنا احتیاطی تقاضوں کے منافی ہوگا وہ اس طرح ہے کہ اس کے نزول میں دو احتمال ہیں:

پہلا احتمال:- مکرین قرآن کا سابقہ آیت یعنی ”إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ کے نازل ہونے کے بعد اُس کے مطابق مقابلہ کرنے کی کوشش سے پہلے نازل ہوئی ہے جیسے بعض تفاسیر

سے معلوم ہو رہا ہے حضرت سنداً محققین میرا سید السند نے بھی حاشیہ کشاف میں ایسا ہی کہا ہے اس صورت میں حرف شرط ”ان“ کا استعمال مخاطبین کے عدم جزم پر مبنی ہے کیوں کہ قرآن شریف کی مثل لانے کے حوالہ سے زور آزمائی کرنے سے پہلے انہیں اپنے عجز و ناتوانی پر جزم نہیں بلکہ ایسے کلام بنا کر لانے کا بے مصرف گمان تھا اور خود کو اس پر قادر سمجھتے تھے۔ جیسے ”لَمْ نَشَأْ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا“ (الانفال، 31) سے صاف ظاہر ہے گویا مقابلہ کر نیکی عملی کوشش سے قرآن کا حال اس شرط ”فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا“ کے مضمون میں شک کرنے والوں سے مختلف نہیں تھا۔

دوسرا احتمال: یہ منکرین قرآن کا اُس کی مثل لانے کے حوالہ سے زور آزمائی کرنے اور شکست خوردہ ہونے کے بعد نازل ہوئی ہے جس کے مطابق متکلم و مخاطب میں سے کسی ایک کو بھی عدم جزم نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو بھی اُن کے عجز و شکست خوردہ ہونے کا قطعاً و یقیناً اور یک طرفہ علم ہے اور مخاطبین کو بھی اپنی شکست پر جزم و یقین حاصل ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود آیت کریمہ ”جَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا“ (النمل، 14) کے مطابق زبان سے انکار کرتے ہیں معاشرہ میں اپنی شکست چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور آیت کریمہ ”لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَافِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَبُونَ“ (نہم السجدہ، 26) کے مطابق اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے باز نہیں آتے ہیں اس صورت میں آیت کریمہ میں حرف ”ان“ کا استعمال مشہور مثال ”إِنْ كُنْتُمْ إِنْسَانًا فَهَدِّبْ نَفْسَكَ“ کے قبیل سے ہوگا جس میں متکلم و مخاطب میں سے کسی ایک کو بھی شرط کے تحقق میں عدم جزم نہیں ہے بلکہ ہر ایک بالجزم و یقین جانتا ہے کہ وہ انسان ہی ہے اس کے باوجود عدم جزم پر دلالت کرنے والا لفظ ”ان“ استعمال کرنے سے مقصد مخاطب پر استہزاء، اُس کی بیوقوفی کا اظہار اور انسانیت کے مقتضی کی طرف متوجہ کرانا، یا اپنے جزم و یقین کے مطابق عمل کرنے کی طرف توجہ دلانے جیسے کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے آیت کریمہ کا بھی یہی حال ہے کہ اپنی شکست و عجز پر حاصل ہونے والے جزم و یقین کے برعکس

پر پیگنڈا کرنے والے مخاطبین کی بیوقوفی ظاہر کرنے اور اس جزم کے مقتضی پر عمل کرنے کی طرف یا اپنے جزم کے مطابق عمل کر کے ایمان لانے اور ناز و جنم سے بچنے کی تدبیر کی طرف متوجہ کرنے میں سے کوئی ایک مقصد ضرور ہے جس کے پیش نظر مقتضی الظاہر کے خلاف حرف ”ان“ استعمال کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ کے عجز ہونے کی زندہ مثال ہے کہ بلاغت شناس حضرات ان میں سے جس زاویہ سے بھی اُسے لیتے ہیں اُس پر منطبق پاتے ہیں اور اخراج الکلام علی خلاف مقتضی الظاہر کے لیے ضروری اعتبارات میں سے متعدد مقاصد کو محیط ہونے میں یکتا و بے نظیر پاتے ہیں تو پھر اسکی بے مثل بلاغت کے سامنے دُنیا بھر کے بلغاء ملکر بھی عاجز کیوں نہ ہو۔ (فَسُبْحَانَهُ مَا أَعْظَمَ شَانَهُ)

تہمید ہشتم: آیت کریمہ ”لَقَدْ صَدَّقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْرُّءَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ“ (الفتح، 27) میں حرف شرط ”ان“ کا استعمال مقتضی الظاہر کے خلاف ہونے کے فلسفہ میں مندرجہ ذیل مقاصد ہو سکتے ہیں:

پہلا مقصد: مسلمانوں کو ”انشاء اللہ“ کہنے کی اہمیت بتانے کے لیے ایسا کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ جاننے کے باوجود ”إِنْ شَاءَ اللَّهُ“ کہا ہے تو ہمیں بدرجہ اولیٰ اس کی پابندی کرنی چاہئے اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمام خلائق سے بے نیاز ہوتے ہوئے تخلیق آدم سے متعلق ملائکہ سے مشورہ کیا ہے جس سے مقصد انسانوں پر مشورہ کی اہمیت ظاہر کرنا اور اُس پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہے جس کے مطابق کل مکاتب فکر مفسرین کرام نے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کے ساتھ مشورہ کرنے کا فلسفہ یہی کچھ بتایا ہے۔ جیسے وہیں پر اسی ایک فلسفہ کے اعتبار سے یہی ایک نکتہ کافی ہے جیسے بلاغت کے معیار پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ ویسے یہاں پر بھی بندوں کو انشاء اللہ کہنے کی اہمیت بتانا مقصد کے طور پر کافی ہے۔

دوسرا مقصد: آیت کریمہ میں شرط ”إِنْ شَاءَ اللَّهُ“ کا تعلق فعل ”لَتَدْخُلُنَّ“ کے ساتھ

بلا واسطہ اور اولاً وبالذات ہونے کے ساتھ اُس کے جملہ متعلقات یعنی ”اُمِّیْنِ، مُخْلِیْنِ، مُقْصِرِیْنِ، لَا تَخَافُوْنَ“ کے ساتھ بھی ہے مگر اُس کے واسطے سے ثانیاً وبالعرض اور ان پانچوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جسکے متعلق تمام مخاطبین کو جزم و یقین ہو کیوں کہ ان کی صفوں میں وہ بھی موجود تھے جن سے متعلق ”وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ“ فرمایا گیا ہے تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ لوگ واقعہ حدیبیہ میں بھی موجود تھے اور آئندہ سال عمرۃ القضاء کے موقع پر بھی موجود تھے اور اول سال ان باتوں کا وجود میں نہ آنے پر اعتراض کرنے والوں کی اکثریت بھی اُن ہی کی تھی۔ ایسے میں آیت کریمہ کے فی الجملہ مخاطبین پر عدم جزم صادق آتا ہے جو خلاف مقتضا الظرہ کو عین مقتضا الحال بنانے کے لیے کافی ہے۔

الغرض پیش نظر آیت کریمہ ”فَإِذَا بَايَعْتُمْ مَبِیْنِیْ هَذِی“ میں استعمال ہونے والی شرط کے حوالہ سے وارد ہونے والا اشکال اسی کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ قرآن شریف کے اُن تمام مقامات میں اس کا تصور پیدا ہوتا ہے جن میں شرط کے وقوع یا لا وقوع کے حوالہ سے بالقطع والیقین کی طرف علم کے مالک ہونے کے باوجود عدم جزم والیقین کے انداز میں کلام فرمایا ہے جن میں سے ان پانچ مقامات کی جو تشریح ہم نے پیش کی یہ باقی تمام کو سمجھنے کے لیے رہنما اصول کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

☆☆☆☆

ترجمہ القرآن ممکن ولا ممکن

سوال یہ ہے کہ مجلہ آذوقہ میں قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کرنے کو سب سے مشکل عمل کہا گیا ہے، اس کا فلسفہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مہربانی کر کے مجلہ میں اس کی وضاحت کی جائے۔

السائل محمد صدیق (مولانا) معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول بمقام شہر جنوبی وزیرستان..... ۲۰۱۰-۱۰-۱۱

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مکمل وضاحت مدارج العرفان کے مقدمہ میں آچکی ہے جو پہلی جلد کے شروع میں ہے جس کی تفصیل ہم نے وہیں پر پیش کی ہوئی ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ترجمہ کا فن بجائے خود کچھ شرائط کے حامل اور مستقل فن ہے جس کے مطابق اصل کتاب لکھنے سے اُس کا معیاری ترجمہ دوسری زبان میں کرنا مشکل ہے۔ جبکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ دوسرے تراجم سے بھی زیادہ شرائط کے حامل ہونے کی بنیاد پر سب سے زیادہ مشکل ہے جو توفیق ایزدی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ کسی بھی حوالہ سے قرآن شریف کی معیاری تفسیر کرنے کے لیے پیشروان اسلام کے مطابق جتنی بھی شرائط ہیں وہ سب کی سب قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے ضروری ہونے کے ساتھ اُن کے علاوہ کچھ اضافی شرائط بھی یہاں پر ضروری ہیں جن کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ معیاری نہیں ہو سکتا جس وجہ سے یہ ممکن بھی ہی لا ممکن بھی ممکن اُن کی لیے ہی جو اس کی تمام شرائط کے جامع ہو اور ناممکن اُن کے لیے ہے جو شرائط کی جامعیت اور اہلیت سے عاری ہو۔ مثال کے طور پر جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی لغت سے لے کر محاورات تک اور کنایات سے لے کر لوازمات تک کا احاطہ ضروری ہے، آیت کریمہ کی عبارت النص اور اُس کے نزول سے مقصد کی پہچان ضروری ہے، سیاق و سباق کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ اصول تفسیر ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ پر نظر ہونا ضروری ہے

اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تنگی دامن یا کسی بھی لسانی مجبوری کے بغیر آیت کریمہ کے الفاظ سے کم و بیش الفاظ استعمال نہ کرنا ضروری ہے ورنہ ترجمہ معیاری نہیں ہوگا نہ صرف اتنا بلکہ قرآن شریف کا بلاغت کے جملہ فنون و اقسام پر مشتمل ہونے کی بناء پر معیاری ترجمہ کے لیے آیت کریمہ کی بلاغی نوعیت کی پہچان بھی ضروری ہے کہ آیا حقیقت کے قبیل سے ہے یا مجاز یا کنایہ کے قبیل سے۔ نیز لغت کی زبان میں استعمال ہوئی ہے یا شریعت کی زبان میں اور مجاز ہونے کی صورت میں مجاز مرسل ہے یا تشبیہ، مجاز مرسل ہونے کی صورت میں اصل و فرع کے مابین علاقہ اتصال کی کون سی قسم ہے اُس کی پہچان بھی ضروری ہے کیوں کہ ہر صورت کا ترجمہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح تشبیہ ہونے کی صورت میں استعارہ کے قبیل سے ہے یا تشبیہ بلغ کے قبیل سے اِس کی پہچان بھی اِس لیے ضروری ہے کہ اِس میں بھی ہر صورت کا ترجمہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اُس کے علاوہ فصل، وصل اور متن کے فصل، وصل اور ایجاز کی حیثیت کو جان کر ترجمہ میں اُس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا بھی ضروری ہے ورنہ فصل کا ترجمہ وصل میں یا وصل کا ترجمہ فصل میں کرنے کو مطابق اصل کہا جاسکتا ہے نہ ایجاز والی آیت کا ترجمہ مساوات و تطویل میں کرنے کو معیاری ترجمہ کہا جاسکتا ہے کیوں کہ قرآن شریف کی ایک ایک آیت فصاحت و بلاغت کی لا جواب مثال ہے اور ہر دور تاریخ کے شہسوارانِ بلاغت شناس ہو سکتا ہے جو اِیجاز کے منافی ترجمہ کو اِس کا معیاری ترجمہ کہہ سکے۔ جبکہ دنیائے بلاغت کے تقابل میں نہ صرف جملوں کی تعداد کو دیکھا جاتا ہے بلکہ حروف کی بھی پیمائش ہوتی ہے اور دو بلغ کلاموں میں سے نمبر اُسی کو دیا جاتا ہے جس کے الفاظ و حروف کم ہو حالانکہ مقصد کی ادائیگی میں دونوں یکساں ہوتے ہیں بلاغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے:

قَدْ يُوصَفُ الْكَلَامُ بِالْإِبْجَازِ وَالْإِطْنَابِ بِإِعْتِبَارِ قِلَّةِ حُرُوفِهِ وَكَثْرَتِهَا بِالنِّسْبَةِ إِلَى
كَلَامٍ آخَرَ مُسَاوِلَهُ فِي أَصْلِ الْمَعْنَى كَقَوْلِهِ:

”يَصُدُّ عَنِ الدُّنْيَا إِذَا عَنُ سُوْدَدٍ“ وَقَوْلُهُ

”وَلَسْتُ بِنَظَّارٍ إِلَى جَانِبِ الْغِنَى..... إِذَا كَانَتْ الْعُلْيَاءُ فِي جَانِبِ الْفَقْرِ“

وَيَقْرُبُ مِنْهُ قَوْلُهُ تَعَالَى ”لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ“

وَقَوْلُ الْحِمَاسِيِّ

”وَنُنَبِّئُكُمْ أَنَّ شَنَا عَلَى النَّاسِ قَوْلُهُمْ..... وَلَا يُنَبِّئُكُمْ الْقَوْلَ حِينَ نَقُولُ“ (۱)

بلاغت کی دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل معنی مرادی کو ادا کرنے میں برابر دو کلاموں کا تقابل ایجاز و اطناب کے حوالہ سے قلت حروف اور کثرت حروف کے اعتبار سے بھی کیا جاتا ہے اور جس میں حروف کم ہو اُسے ایجاز اور جس میں حروف زیادہ ہو اُسے اطناب کہا جاتا ہے حالانکہ اصل معنی پر دلالت کرنے میں دونوں یکساں ہوتے ہیں جس کی مثال میں یہ کہ ”يَصُدُّ عَنِ الدُّنْيَا إِذَا عَنُ سُوْدَدٍ“ کے مصرع کو شعر ”وَلَسْتُ بِنَظَّارٍ إِلَى جَانِبِ الْغِنَى..... إِذَا كَانَتْ الْعُلْيَاءُ فِي جَانِبِ الْفَقْرِ“ پر محض اِس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ اِس کے الفاظ و حروف دوسرے شعر کے الفاظ و حروف کے مقابلہ میں کم ہیں حالانکہ اصل مقصد پر دلالت کرنے میں دونوں یکساں ہیں اور دونوں سے مقصد بھی ایک ہے جو غربت و فقر کی زندگی میں سرداری ملنے کی صورت میں دولت اور دنیا کی آسائشوں سے منہ موڑنے پر فخر کرنا ہے اور آیت کریمہ ”لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ“ کے ساتھ حماسی کے مذکورہ شعر کا بلاغی تقابل بھی اِس کے قریب ہے کیوں کہ دونوں میں متکلم کا مقصد دوسروں پر اپنا بول بالا بتانا ہے کہ ہم سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے جبکہ ہم سب سے پوچھنے والے ہیں اور ہماری بات کو مسترد کرنے والا کوئی نہیں ہے جبکہ ہم سب کو مسترد کر سکتے ہیں۔ مقصد پر دونوں کی دلالت یکساں ہونے کے باوجود آیت کریمہ کو حماسی کے اِس شعر پر بلاغی فوقیت اِس لیے حاصل ہے

کہ اس کے الفاظ و حروف کم ہیں۔

معنی اللیب عن کتب الاعاریب میں ہے؛

”يَنْبَغِي لِلْمُعَرَّبِ أَنْ يَتَخَيَّرَ مِنَ الْعِبَارَاتِ أَوْ جَزْأَهَا وَاجْتَمَعَهَا لِلْمَعْنَى الْمُرَادِ
فَيَقُولُ فِي نَحْوِ ضَرِبَ ”فَعِلٌ مَاضٍ لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ“ وَلَا يَقُولُ ”مَبْنِيٌّ لِمَا لَمْ يُسَمَّ
فَاعِلُهُ“ لَطُولِ ذَلِكَ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ نحوی کو چاہئے کہ عبارت میں مختصر اور معنی مرادی کو جامع الفاظ استعمال کرے تو ”ضَرِبَ“ جیسے مجہول صیغوں کی تعبیر میں ”ضَرِبَ“ ”فَعِلٌ مَاضٍ لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ“ کہہ اور نہ کہے کہ ”ضَرِبَ مَبْنِيٌّ لِمَا لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ“ کیوں کہ اُس کے مقابلہ میں یہ طویل ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر ”ضَرِبَ فَعِلٌ مَاضٍ لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ“ کہنے کو ایجاز اور ”ضَرِبَ فَعِلٌ مَاضٍ مَبْنِيٌّ لِمَا لَمْ يُسَمَّ فَاعِلُهُ“ کہنے کو اس کے مقابلہ میں اطباء جو کہا گیا ہے اس میں صرف ایک حرف کا فرق ہے کہ دوسرے میں زیادہ اور پہلے میں کم ہے حالانکہ دونوں مبلغ ہیں اور دونوں سے مقصد بھی ایک ہے اور اُس پر دلالت کرنے میں بھی دونوں یکساں ہیں۔ اس کے باوجود اول کو دوسرے پر ترجیح دینے کی واحد وجہ یہی ہے کہ دوسرے کے مقابلہ میں اُس کے اندر ایک حرف کم ہے۔

جب انسانوں کے کلام میں بلاغت کے تقابل کا یہ حال ہے تو پھر قرآن شریف کے ترجمہ میں اصل پر اضافات و تطویلات اور اطنابات کو معیاری ترجمہ کون کہے اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ علم المعانی اور علم بیان پر مکمل دسترس حاصل کئے بغیر قرآن شریف کی تفسیر کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ جیسے مفتاح العلوم میں ہے؛

”إِنَّ الْوَاقِفَ عَلَى تَمَامِ مُرَادِ الْحَكِيمِ تَعَالَى وَتَقَدَّسَ مِنْ كَلَامِهِ مُتَقَبِّرٌ إِلَى هَذَيْنِ

(۱) مغنی اللیب، ج ۲، ص ۷۴۰، مطبوعہ دارنش الکتاب الاسلامیہ شیش محل لاہور۔

الْعَلَمِينَ كُلَّ الْإِفْتِقَارِ فَالْوَيْلُ كُلُّ الْوَيْلِ لِمَنْ تَعَاطَى التَّفْسِيرَ وَهُوَ فِيهِمَا
رَاجِلٌ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ و تقدس کے کلام سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے درپے شخص ان دو علموں کی طرف پوری طرح محتاج ہے تو پھر پوری طرح ہلاکت ہو اُس شخص کے لیے جو ان دونوں میں پیدل و تہی دست ہوتے ہوئے قرآن شریف کی تفسیر کرنے بیٹھ جاتا ہے۔

جب ان شرائط کے بغیر قرآن شریف کی معیاری تفسیر کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر ان کی دھجیاں اڑانے پر مشتمل تراجم کو معیاری کون کہے حالانکہ قرآن شریف کی تفسیر کرنا چاہے جس عنوان سے بھی ہو ترجمہ کے مقابلہ میں آسان ہے کیوں کہ معیاری تفسیر کی شرائط اتنی نہیں ہیں جتنی معیاری ترجمہ کے لیے ہیں اور نہ ہی تفسیر سے ترجمہ کے مشکل ہونے کے نکتے کو سمجھنے کے لیے یہی ایک ماہہ التفریق کافی ہے کہ تفسیر میں متن سے اضافی الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ تفسیر کا کیا مطلب جبکہ معیاری ترجمہ کے لیے متن سے اضافی الفاظ استعمال نہ کرنا ضروری ہے ورنہ ترجمہ کا معیار گر جائے گا۔

حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن کو جو اردو زبان میں لکھا گیا اولین ترجمہ سمجھا جاتا ہے صرف اس وجہ سے دوسرے تراجم پر ترجیح دی جاتی ہے کہ اس میں متن کے مطابق پنے تلے الفاظ استعمال کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کرنے کو مشکل نہیں تو اور کیا کہا جائے۔ اس کے علاوہ چند مثالوں کی شکل میں بھی اس کے مشکل ہونے کے فلسفہ کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی مثال:- سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیت کریمہ ”ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ“ میں لفظ ”ذَلِكَ“ تین الگ الگ حقائق سے مرکب ہے؛

(۱) مفتاح العلوم بحث علم المعانی والبیان، ص ۷۰، مطبوعہ تہران۔

اول:- لفظ ”ذَا“ ہے جو اسم اشارہ واحد مذکر محسوس بصر کے لیے ہے۔

دوم:- حرف تبعید ”ل“ ہے۔

سوم:- حرف خطاب ”ک“ ہے جبکہ لسانِ قرآنی کے اہل زبان آپس میں گفتگو کرتے ہوئے اس لفظ کو سنتے ہی ان تینوں کے مظاہر و مصرف کو بھی سمجھتے ہیں ورنہ علمِ نحو کی کتابوں میں ان کے الگ الگ مفادات اور ہر ایک کے جدا جدا مدلول بتانے سے کوئی مقصد ہی نہیں رہتا لیکن توفیق الہی کے بغیر مترجم کے لیے ان تینوں کے تراجم کو ظاہر کرنا ممکن نہیں کیوں کہ اگر اسم اشارہ ”ذَا“ کا ترجمہ کرے تو باقی دو بغیر ترجمہ کے رہ جاتے ہیں اور اگر حرف تبعید یا حرف خطاب میں سے کسی ایک کا کرے تو اسم اشارہ کا ترجمہ رہ جاتا ہے چہ جائیکہ تینوں کا حق ادا کر سکے جبکہ متن کے مطابق مختصر و جامع الفاظ میں ان تینوں کے تراجم سے قاصر ترجمہ کو ضخامت معیاری کہہ سکے ہیں نہ بلغاء، سیبویہ اُسے تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے نہ تفتازانی اور لسانی قرآنی کے اہل زبان اسے گوارا کرتے ہیں نہ اہل تفسیر۔ ایسے میں اس کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق کے بغیر ناممکن نہ تو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

دوسری مثال:- آیت کریمہ کے آخری حصہ ”لَا رَيْبَ فِيْهِ“ میں لفظ ”رَيْب“ لسانِ قرآنی میں بھی اور مفسرین کرام کے مطابق بھی شک سے عبارت ہے اور شک تصور کی اُن قسموں میں سے ہے جو نسبت تامہ خبریہ سے اس طرح متعلق ہوتی ہے کہ جانہین میں سے کسی ایک طرف بھی راجح و مرجوح نہیں ہوتی جبکہ یہاں پر ”لَا رَيْبَ فِيْهِ“ کے فرمان میں اس کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے جبکہ کتاب نسبت ہی نہیں ہے چہ جائیکہ نسبت تامہ خبریہ ہو۔ ایسے میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا معیاری ترجمہ کرنا اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق کے بغیر ممکن ہو سکے۔

تیسری مثال:- میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعونییوں کے مظالم سے نجات دینے کے بعد فرمایا ”وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلٰءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ“ (البقرہ، 49) جس میں ”وَ فِيْ ذٰلِكُمْ“ کا اشارہ فرعونی مظالم کی

طرف ہونے کی صورت میں لفظ ”بَلٰءٌ“ کا ترجمہ ابتلا بالسیات میں متعین ہو جاتا ہے اور نجات دلانے کی طرف ہونے کی صورت میں لفظ ”بَلٰءٌ“ کا ترجمہ احسان و انعام میں متعین ہوتا ہے اور لغت و محاورہ اور علمِ خود بلاغت کے مطابق بھی دونوں جائز ہیں اور مفسرین کرام نے بھی دونوں احتمالات کو یکساں بیان کیا ہے۔ الغرض کسی طرح بھی ان میں سے ایک کو لے کر دوسرے کو مسترد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ایسے میں مترجم کے نہ صرف عرفان کا بلکہ احتیاط کا بھی امتحان ہوتا ہے کہ کیا کرے ایک کے مطابق ترجمہ کرتا ہے تو دوسرا رہ جاتا ہے جس کی اجازت عرفان دیتا ہے نہ ایمان اور دونوں کا ترجمہ کرے تو متن پر اضافہ ہو کر بلاغت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے۔ ایسے میں کون کہہ سکتا ہے کہ توفیق الہی کے بغیر کوئی اس کا معیاری ترجمہ پیش کر سکے۔

چوتھی مثال:- حضرت ابراہیم (عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) کو زمین و آسمان کی بادشاہی دکھانے کا فلسفہ بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وَلْيَكُوْنُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ“ (الانعام، 75) جس کے ظاہری مفہوم یہی ہیں تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ جبکہ حقیقت میں انہیں اللہ تعالیٰ سے متعلق یقین پہلے سے حاصل تھا جس کی بدولت پوری قوم کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا چرچا فرما رہے تھے، دعوت الی اللہ دے رہے تھے اور مشرکین کو عاجز و مہوت کر رہے تھے جو قرآن شریف کے متعدد مقامات سے ظاہر ہے۔ ایسے میں اس کا معیاری ترجمہ جو آیت کریمہ کے سیاق و سباق کے ساتھ واقعہ کے بھی مطابق ہو اور جملہ شرائط پر بھی منطبق ہو عرفانِ نصیبی کی توفیق کے بغیر کون کر سکتا ہے۔

پانچویں مثال:- مذکورہ آیت کریمہ کے متصلاً بعد ستارہ پرستوں پر رد کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کا وہ کلام جس کے مطابق بالترتیب ستارے، چاند اور چمکتے سورج کو دیکھ کر ”هٰذَا رَبِّيْ“ (الانعام، 76) فرمایا جس کے لسانی قرآنی اور نحوی اصولوں کے مطابق ظاہری مفہوم کا مراد ہونا ممکن ہی نہیں ہے اور حرفِ استفہام محذوف قرار دے کر ”آهٰذَا رَبِّيْ“ کہنا ظاہر کے خلاف ہونے کے ساتھ خلافِ الاصل بھی ہے ایسے میں ان تینوں مقامات کے معیاری ترجمہ وجود میں لانا عرفانِ نصیبی کے بغیر کس کے لیے

ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معیاری ترجمہ کی اہمیت، شرائط اور اُس کے احتیاطی تقاضوں سے نا آشنا حضرات کے سامنے ترجمہ کے نام سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ اُسے معیاری ہی سمجھتے ہیں جو ان کی ماحولیاتی یا ذہنی مجبوری ہوتی ہے چاہے ”إِنِّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ“ کا ترجمہ ”زرد رنگ کے بیل“ میں کیوں نہ کیا گیا ہو اور مفرد کا جملہ میں یا جملہ کا مفرد میں کیوں نہ کیا گیا ہو، اللہ وحدہ لا شریک کی تعظیم و آداب کو انسانوں کی تعظیم و آداب پر قیاس کیوں نہ کیا گیا ہو۔ جس کی دلخراش مثالوں کی سینکڑوں قسمیں مدارج العرفان فی مناجح کنز الایمان میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (فَالِی اللّٰهِ الْمُشْتَكٰی)

☆☆☆☆

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنا

سوال یہ ہے کہ آواز حق میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنے کو بدعت شنیعہ کہا گیا ہے حالانکہ اچھے خاصے علماء اور کچھ مشائخ کرام بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں جمع کے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ خاص کر اشرف علی تھانوی کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں اور امام احمد رضا کے فتاویٰ رضویہ سے بھی اس کا جواز مفہوم ہوتا ہے اگرچہ خلافِ اولیٰ ہی سہی کہ انہوں نے اس نوعیت کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

”اللہ عزوجل کو ضمائر مفردہ سے یاد کرنا مناسب ہے کہ وہ واحد، احد، فرد، وتر ہے اور تعظیماً جمع میں بھی حرج نہیں۔“

ہمارے کچھ ساتھیوں نے آواز حق میں یہ پڑھ کر تعجب کا اظہار کیا کیوں کہ اللہ جل جلالہ کی تعظیم کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنے کو قرین ادب اور اچھا سمجھا جاتا ہے اور حدیث میں آیا ہے ”مَرَّاهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ حَسَنٌ“ (عمدة القاری شرح صحیح البخاری، ج 24، ص 106، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) اور قرآن شریف میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تعظیم کے لیے جمع کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جیسے ”لَنَحْنُ نَقْصُ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقُصَصِ“ (یوسف، 3) اس کی وضاحت کر کے طمانیت کا سامان کریں۔ (جَزَاكَ اللّٰهُ)

السائل: نعمت اللہ مولانا استاذ دارالعلوم جامعہ نور یہ شمس العلوم خاران شہر بلوچستان، 16 دسمبر 2010
اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں کسی بھی فرد بشر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم و ادب کو انسانوں کی تعظیم و ادب پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرے، نہیں اسلام میں ہرگز اس کی اجازت نہیں ہے۔ باقی یہ کہنا کہ اچھے خاصے علماء اور مشائخ ایسا

کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہر انسان قرآن و سنت کا پابند ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عالم شرعی دلیل ہے نہ کوئی مشائخ بلکہ علماء و مشائخ صرف اس بناء پر قابل تعظیم ہیں کہ قرآن و سنت کے پابند ہیں اگر یہ نہیں تو پھر اُن کی تعظیم لازم ہے نہ تقلید۔ اس حوالہ سے امر واقع یہ ہے کہ روز اول سے لے کر آج تک کسی قابل ذکر عالم دین نے ایسا کیا ہے کہ نہ کسی قابل تقلید مشائخ نے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کل مکاتب فکر اہل اسلام میں یہ انداز تعظیم کسی سے بھی منقول نہیں ہے تو بے مصرف نہیں ہوگا ہاں غیر معیاری مشائخ اور اُن کے دم چھلے نیم خواندہ علماء کی بات ہی اور ہے جنہیں الہیات کا علم ہے نہ قرآن و سنت کے مندرجات کا وہ بے چارے بجائے خود قابل اصلاح ہوتے ہیں، تنبیہ کے محتاج ہوتے ہیں اور نا قابل تقلید ہوتے ہیں تو پھر اُن کے عمل کو دلیل جواز بنانے کا کیا جواز ہے۔ اور حدیث کی کتابوں میں موجود حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے قول ”مَا رَأَى الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ حَسَنٌ“ (عمدة القاری شرح صحیح البخاری، ج 24، ص 106، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) سے اس کے جواز پر استدلال کرنا بے مصرف ہونے کے ساتھ غیر معقول بھی ہے کیوں کہ اس کے مصرف وہی مسائل ہیں جن میں کوئی نص موجود نہ ہو اور مزاج اسلام کے بھی منافی نہ ہو اور اُن کی شرعی حیثیت بھی واضح نہ ہو مگر یہ کہ اہل اسلام مستحسن سمجھ کر اُن پر عمل کر رہے ہوں تو اُن سے منع کرنا جائز نہیں ہے ورنہ طریقہ پیغمبر ﷺ کے برعکس مروان اور بنو مروان کی ایجاد کردہ بدعات کو بھی جائز کہنا پڑے گا، بنو امیہ کے خلفاء نے کتنی بدعات کو مستحسن سمجھ کر مروج کیا تھا اُن سب کو جائز قرار دینا ہوگا کیوں کہ وہ مسلمان ہی تھے۔ آج کے مسلمانوں کے مستحسن سمجھے جانے والے عمل کو اس بنیاد پر جائز قرار دینے والوں کو اس سے مفر نہیں ہے کہ اُن سب کو جائز اور عند اللہ حسن کہہ کر سنت نبوی ﷺ سے منہ موڑ لیں۔ (الْعَيَاذُ بِاللَّهِ) شتے نمونہ از خوارے بخاری شریف میں آیا ہے کہ مدینہ شریف کے گورنر مروان ابن الحکم نے عید کی نماز قبل الخطبہ کی سنت مستمرہ سے برعکس نماز سے پہلے خطبہ دینے لگا، صحابی رسول حضرت ابوسعید خدریؓ نے اُسے ٹوکا اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق پہلے نماز بعد میں خطبہ کی

اُسے تبلیغ کی تو اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جس سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنے کی بات تو کر رہا ہے وہ متروک ہو چکی ہے جس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا:

”مَا أَعْلَمُ وَاللَّهِ خَيْرٌ مِّمَّا لَا أَعْلَمُ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس گمراہی کو تم مستحسن سمجھ کر مروج کر رہے ہو اور ہم اُسے جائز نہیں سمجھتے ہیں اُس سے وہ سنت نبوی ﷺ بہتر ہے جس کو ہم سمجھتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ سنت مستمرہ کو ترک کر کے اُس کی جگہ مَن پسند کی بدعت مروج کرنے والے یہ خلفاء بنو امیہ اور اُن کا عملہ مسلمان ہی تھے لیکن دنیوی اور سیاسی مقاصد کے لیے جب انہوں نے یہ سب کچھ کیا تو اُس وقت کے صحابہ کرام نے اُسے مسترد کیا اور ”مَا أَعْلَمُ وَاللَّهِ خَيْرٌ مِّمَّا لَا أَعْلَمُ“ جیسے تاکید کی کلام میں اُس کے بطلان کا اظہار فرمایا۔ جہاں تک قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنے سے استدلال کرنا ہے کہ اگر یہ ناجائز ہوتا اللہ تعالیٰ اپنے لیے جمع کے الفاظ کیوں استعمال فرماتا تو یہ پہلے سے بھی زیادہ نامعقول ہے، لسان قرآنی اور علم نحو و بلاغت سے نا آشنا کی نتیجہ ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے اندر جس مقام پر بھی اپنی ذات کے لیے جمع کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہیں بلکہ انسانوں کے حق میں جمع ہیں کیوں کہ لسان قرآنی کی لغت سے لے کر علم نحو اور بلاغت تک سب نے بیک آواز لکھا ہوا ہے کہ اس قسم جتنے الفاظ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے استعمال فرمایا ہے وہ اُس وحدہ لا شریک کے حق میں جمع نہیں بلکہ واحد تکلم معظم نفسہ کہلاتے ہیں۔ المعجم الوسیط میں ہے:

”وَقَدْ يُعْبَرُ بِهَا الْوَاحِدُ عِنْدَ إِزَادَةِ التَّعْظِيمِ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی انسانوں کے حق میں جمع کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کے

(۱) بخاری شریف مع شرح عمدة القاری، ج 5، ص 278۔

(۲) المعجم الوسیط، ج 1، ص 915، مطبوعہ بیروت۔

ساتھ واحد متکلم بھی اپنی ذات کی تعبیر کرتا ہے جب اپنی عظمت جتنا مقصد ہو۔
مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے؛

”وَمَا وَدَّعَى الْقُرْآنُ مِنْ إِخْبَارِ اللَّهِ تَعَالَى عَنْ نَفْسِهِ بِقَوْلِهِ ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ فَقَدْ قِيلَ هُوَ إِخْبَارٌ عَنْ نَفْسِهِ وَخُذَهُ لَكِنْ يَخْرُجُ ذَلِكَ مَخْرَجَ الْإِخْبَارِ الْمَلُوكِيِّ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ جیسے جمع کے الفاظ میں جو خبر دی ہے یہ بادشاہوں کے انداز کلام کے قیل سے ہے جو واحد متکلم ہونے کے باوجود اپنی عظمت ظاہر کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔
انحو الوانی میں ہے؛

”لِلْمُتَكَلِّمِ ضَمِيرَانِ: أَنَا لِلْمُتَكَلِّمِ وَخُذَهُ، وَ”نَحْنُ“ لِلْمُتَكَلِّمِ الْمُعْظَمِ نَفْسَهُ أَوْ مَعَهُ غَيْرُهُ“ (۲)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ متکلم کے لیے دو ضمیر ہیں جن میں سے ایک انا ہے جو واحد متکلم کے لیے ہے اور دوسرا ”نَحْنُ“ ہے جو کبھی واحد متکلم معظم نفسہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی جمع متکلم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جمع الجوامع میں ہے؛

”وَنَحْنُ لَهُ مُعْظَمًا أَوْ مُشَارًا“ (۳)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کی زبان پر جمع استعمال ہونے والے الفاظ میں ایک ”نَحْنُ“

(۱) مفردات القرآن، ص 504، مطبوعہ نور محمد اصحاب المطابع کراچی۔

(۲) النحو الوافی، ص 204، مطبوعہ تہران۔

(۳) جمع الجوامع فی النحو للسیوطی، ج 1، ص 60، مطبوعہ تہران۔

بھی ہے جس کی درحقیقت دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ واحد متکلم معظم نفسہ کے لیے ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ جمع متکلم کے لیے ہوتا ہے۔

اس کی شرح جمع البوامع میں ہے؛

”نَحْنُ لِلْمُتَكَلِّمِ مُعْظَمًا لِنَفْسِهِ نَحْوُ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ أَوْ مُشَارًا كَمَا نَحْنُ اللَّذَوْنَ صَبَحُوا الصَّبَاحَا“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کی زبان میں جمع کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ میں ایک لفظ ”نَحْنُ“ بھی ہے جس کی درحقیقت دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ وہ واحد متکلم معظم نفسہ کے لیے ہوتا ہے جیسے قرآن شریف کی یہ آیت ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ اور دوسری وہ ہے جو جمع متکلم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ”نَحْنُ اللَّذَوْنَ صَبَحُوا الصَّبَاحَا“ میں ہے۔

الغرض جمع متکلم کے انداز میں جہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی کلام فرمایا ہے چاہے ضمیر مرفوع منفصل ”نَحْنُ“ کی شکل میں ہو جو قرآن شریف کے متعدد مقامات پر آیا ہے یا ضمیر مرفوع متصل کی شکل میں ہو جیسے ”خَلَقْنَا، نَزَّلْنَا، فَسَمْنَا“ جیسے الفاظ میں قرآن شریف کے متعدد مقامات پر پھیلا ہوا ہے یا ضمیر منصوب منفصل ”ایانا“ کی شکل میں ہو۔ جیسے قرآن شریف میں ”ان کنتم ایانا تعبدون“ جیسے مقامات پر آیا ہے یا ضمیر منصوب متصل ”نا“ جیسے ”إِنَّا، وَمَا ظَلَمُونَا“ جیسے قرآن شریف کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ یا ضمیر مجرور متصل ”نا“ کی شکل میں ہو۔ جیسے ”إِلینا“ جیسے مقامات میں قرآن شریف کے اندر کی جگہوں میں آیا ہے، یا جمع مذکر بعقل کی شکل میں ہو جیسے ”خَلَقُونَ، فَاعِلُونَ، فَاعِلُونَ“ جیسے الفاظ میں قرآن شریف کے متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

یا حرف مضارع علامت جمع متکلم کی شکل میں ہو جیسے ”لَدْخَلْکُمْ، نَخْرِجْکُمْ، نَحْی و نَمِیت“ جیسے

(۱) جمع البوامع شرح جمع الجوامع، ج 1، ص 60، مطبوعہ تہران۔

الفاظ میں قرآن شریف میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کو لسان قرآنی میں جمع کہا گیا ہو بلکہ سب نے انہیں واحد متکلم معظم لنفسہ کے قبیل سے ہی شمار کیا ہے جس کے بعد ان میں سے صرف ایک کے واحد متکلم معظم لنفسہ کے لیے ہونے کی نوعیت کے بارے میں تحکاۃ کے مابین قدرے اختلاف پایا جاتا ہے وہ جمع متکلم مضارع کے لیے استعمال ہونے والا نون علامت مضارع ہے کہ جس فعل مضارع پر وہ داخل ہوتا ہے اُس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہونے کی صورت میں بعض نحاة اُس کا واحد متکلم معظم لنفسہ ہونے کو حقیقت کہتے ہیں جبکہ بعض اسے مجاز پر محمول کرتے ہیں لیکن اس سے مراد واحد متکلم معظم لنفسہ ہونے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے باقی اس کے سوا جتنے بھی ہیں اُن سب کی واحد متکلم معظم لنفسہ میں حقیقت ہونے پر تمام نحاة متفق ہیں۔ جیسے حاشیۃ الصبان علی الاشمونی علی الفیہ ابن مالک، جلد 1، صفحہ 111، مطبوعہ تہران میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے واحد متکلم معظم لنفسہ کی حیثیت سے استعمال ہونے والے ان تمام مقامات کو پیش نظر رکھ کر مفسرین کرام نے بھی ان کی وہی حقیقت بیان کی ہیں جو لسان قرآنی کے ماہرین سے لے کر امامانِ نحو تک سب نے بیان کی ہیں۔

تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ ”فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتٌ کُلِّ شَیْءٍ“ میں اللہ تعالیٰ کا اپنی واحد ولا شریک ذات کے لیے بظاہر جمع کے الفاظ ”اخرجنا“ استعمال کرنے کا فلسفہ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”وَ اِخْتِیَارُ ضَمِّیْرِ الْعُظْمٰیۃِ ذُوْنَ ضَمِّیْرِ الْمُتَّکَلِّمِ وَ حَذُّہٗ لِاَظْہَارِ کَمَالِ الْعِنَاۃِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں پر اپنی واحد ولا شریک ذات کے لیے اللہ تعالیٰ نے صرف واحد متکلم کا صیغہ ”اخرجنا“ استعمال کرنے کے بجائے واحد متکلم معظم لنفسہ ”اخرجنا“ جو استعمال فرمایا ہے اس سے مقصد نباتات کو پیدا کرنے کا اہتمام بتانا ہے کہ ہم نے ان کو اپنی شانِ عظمت کے مطابق پیدا فرمایا ہے۔

(۱) تفسیر روح المعانی، ج 7، ص 238، مطبوعہ بیروت۔

الغرض تعظیم شانِ الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اسے جائز بتانے کے لیے اس قسم آیت قرآنی سے استدلال کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اس لیے کہ لسان قرآنی کے ماہرین اور امامانِ نحو سے لے کر امامانِ بلاغت اور مفسرین کرام تک سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی ذات کے بارے میں استعمال کیے جانے والے ان الفاظ کو جمع نہیں بلکہ واحد متکلم معظم لنفسہ کے قبیل سے شمار کیا ہے جو جمع متکلم کے مقابلہ میں ایک مستقل چیز ہے۔ جب یہ جمع ہی نہیں ہیں تو پھر اُن سے استدلال کا کیا جواز باقی رہتا ہے۔ ایسے میں اس استدلال کو استدلال کہنے کے بجائے اشتباہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا جس کا منشاء اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تعظیم شانِ الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنے والے خطا کاروں کو لسان قرآنی کی لغوی حیثیت تک رسائی ہے نہ نحوی اور بلاغی حیثیت تک اور عظمتِ شانِ الہی کا پاس ہے، نہ مفسرین کرام پر نظر ایسے میں انہیں اشتباہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ شانِ الہی کی تعظیم و ادب کرنا عبادت ہے اور عبادت وہ جائز ہوتی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو ورنہ پیغمبر ﷺ کے خلاف کسی کی عبادت قبول ہوتی ہے نہ ادب جب قرآن و سنت سے اس کا جواز نہیں ملتا اور اللہ کے کسی ایک پیغمبر نے بھی ایسا نہیں کیا ہے تو پھر اس کے جواز کا کیا تصور باقی رہ جاتا ہے جہاں تک فتاویٰ رضویہ کا حوالہ ہے تو اُس میں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیوں کہ فتاویٰ رضویہ میں تعظیم شانِ الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے ایسے کرنے کو نہیں بلکہ محض تعظیم کے لیے جمع ضمائر استعمال کرنے کو لا حرج کہا گیا ہے جیسے اُس کے الفاظ ”اللہ عزوجل کو ضمائر مفردہ سے یاد کرنا مناسب ہے کہ وہ واحد، احد، فرد، وتر ہے اور تعظیماً جمع میں بھی حرج نہیں۔“ (فتاویٰ رضویہ، ج 15، ص 547، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن لاہور) سے صاف ظاہر ہے۔ یہ فتاویٰ دو باتوں کے ساتھ مختص ہے:

پہلی بات:۔ تعظیم الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنا نہیں بلکہ محض تعظیم ہے۔

دوسری:۔ محض تعظیم کے لیے جمع کے جن ضمائر کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے وہ عربی زبان کے نہیں بلکہ اردو زبان کے ضمائر جمع ہیں کیوں کہ فتویٰ پوچھنے والے نے اردو زبان میں ایسے

کرنے سے متعلق پوچھا تھا عربی میں نہیں۔

نیز عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے ضمائر جمع استعمال کر کے ”ہُمْ“ یا ”اَنْتُمْ“ جیسے الفاظ استعمال کرنا عقلاً و نقلاً باطل ہے اور عربی زبان و اردو زبانوں سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اردو محاورہ میں عربی سے برعکس ضمائر جمع جیسے ”اُن“ ہے جو لفظ ”اِس“ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ”اُن“ ہے جو لفظ ”اِس“ کے مقابلہ میں ہوتا ہے جس کے مطابق فتاویٰ رضویہ کے یہ الفاظ ”اللہ عزوجل کو ضمائر مفردہ سے یاد کرنا مناسب ہے کہ وہ واحد، احد، فرد، وتر ہے اور تعظیماً جمع میں بھی حرج نہیں“ صرف اس بات کے ساتھ مختص ہیں کہ اللہ عزوجل کی تعظیم کے لیے اُس کی شان میں لفظ ”اِس“ کی جگہ ”اُن“ کہنے میں اسی طرح محل و مقام کی مناسبت سے لفظ ”اُس“ کہنے کی جگہ ”اُن“ استعمال کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ تعظیم شان الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے فعل جمع یعنی (اللہ کریں گے، اللہ عذاب دیں گے، اللہ فرماتے ہیں) جیسے استعمال جائز ہو یا دو چیزوں کے مابین رابطے کے لیے استعمال ہونے والے جمع کے ساتھ مختص لفظ ”ہیں“ کا استعمال جائز ہو۔ مثلاً کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہیں، اللہ تعالیٰ رحمن ہیں اور رحیم ہیں، وہ کرم فرمانے والی ذات ہیں۔

الغرض فتاویٰ رضویہ کے مذکورہ فتویٰ کا اس جیسے استعمال سے کوئی ربط ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اُس سے اس کے جواز پر استدلال کرنا درست ہو۔ جہاں تک تھانوی کی تحریروں سے اس کے جواز پر استدلال کا تصور ہے تو یہ قابل توجہ ہی نہیں ہے کیوں کہ اُس کی تحریروں اس سے زیادہ خطرناک مضامین سے بھری پڑی ہیں جس وجہ سے وہ قابلِ حُجّت ہرگز نہیں بلکہ متنازعہ شخص ہے جس کی حفظ الایمان، بسط البنان اور تغیر العوان جیسی تحریروں کی بنیاد پر حسام الحرمین علی منکر الکفر والین جیسے فتاویٰ شائع ہو چکے ہیں جو یوہندی، بریلوی قید و بند کے افکار سے آزاد علماء اسلام اور چاروں مذاہب اہلسنت کے غیر جانبدار مفتیان کرام کے حقیقی فتویٰ ہیں یہاں پر اس حقیقت سے بہت کم حضرات آگاہ ہوں گے کہ تعظیم الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے افعال استعمال کرنے کی اس بدعت

شیعہ کے اصل موجد بھی تھانوی ہے کیوں کہ اُس سے قبل اردو زبان میں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ اس لیے کہ اردو ادب و محاورہ کی شروعات سے لے کر تھانوی کے زمانہ تک کے دورانیہ میں شاہ ولی اللہ خاندان کے عظیم چشم و چراغ شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز سے لے کر خیر آبادی فضلاء اسلام تک بڑے بڑے فضلاء وقت اور اسلام کی ہمہ جہت خدمات انجام دینے والے اداروں کی کمی نہیں تھی کسی نہ کسی انداز میں اُن سب نے تعظیم الہی کی میراث چھوڑی ہے لیکن یہ انداز کسی ایک سے بھی منقول نہیں ہے خاص کر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے اردو زبان میں قرآن شریف کے کئے گئے ترجموں کو قرآنی تبلیغ کی بنیاد سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے بعد والوں کو روشنی دکھائی ہے لیکن تعظیم الہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنے کا یہ انداز اُن کے ہاں سے بھی کہیں نہیں ملتا۔ الغرض تھانوی کا ترجمہ قرآن وجود میں آنے سے پہلے اس کی قطعاً کوئی مثال نہیں تھی جس کے بعد آنکھیں بند کر کے اُس کی تقلید کرنے والے اسے اپنا رہے ہیں جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کیوں کہ یہ ایسی بدعت شیعہ ہے کہ اردو زبان کی شروعات سے لے کر تھانوی کے وقت تک کہیں بھی اس کی مثال نہیں ملتی تو پھر بدعت کے سوا اسے اور کیا کہا جائے۔

☆☆☆☆☆

ترجمہ اور ترجمانی کی تفریق

سلام و آداب کے بعد سوال یہ ہے کہ آواز حق میں جاری تحریر تفسیر ”مدارج العرفان“ میں متعدد بار یہ الفاظ پڑھنے کو ملتے ہیں کہ فلاں ترجمہ حقیقی ہے، فلاں ترجمہ باللائم ہے اور فلاں ترجمانی ہے ترجمہ نہیں اور فلاں مفسرین سے خلاف ہے مہربانی کر کے اس کی وضاحت کریں کہ کیا ترجمہ اور ترجمانی ایک چیز نہیں ہے؟ یہ بھی وضاحت کریں کہ حقیقی ترجمہ کیا ہوتا ہے اور ترجمہ باللائم کیا ہوتا ہے؟

کئی سالوں سے شائع ہونے والی اس تحریر کو پڑھنے سے اتنا تو پتہ چل گیا کہ قرآن شریف کے اب تک لکھے گئے تمام تراجم معیاری نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ معیاری اور ناقابل اعتراض ترجمہ صرف وہی کہلاتا ہے جو شرائط کے مطابق ہو اور جو شرائط اس تحریر میں ہم نے پڑھی ان پر بھی ہر شخص کو تسلی ہو رہی ہے کہ یہ عین حقیقت ہیں لیکن ترجمانی کو ترجمہ سے جدا کرنے، اسی طرح حقیقی ترجمہ اور ترجمہ باللائم کو ایک دوسرے سے مختلف کہنے کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔

اس کے ساتھ تیسرا سوال یہ بھی اُلجھن کا سبب بنا ہوا ہے کہ جو تراجم تفاسیر کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معیاری کہلاتے ہیں اس سے کیا مراد ہے کیوں کہ تفسیر کی کتابیں صحابہ کرام کی لکھی ہوئی تو ہیں نہیں کہ انہیں معیار کہا جائے بلکہ مختلف نظریات کے حامل شخصیات نے اپنی سمجھ کے مطابق لکھی ہوئی ہیں جس وجہ سے اُن کی آراء بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو پھر اُن میں سے کس کے خلاف ترجمہ کو غیر معیاری کہا جائے اور کس کے موافق کو معیاری کہا جائے۔

مہربانی کر کے ان تینوں سوالوں کا تسلی بخش جواب شائع کریں۔ محمد قاسم بلوچ، خطیب عربی مسجد خاراں شہر بلوچستان ۲۰۱۱ء - ۱۲ - ۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ و ترجمانی کے مابین تفریق کو وضاحت کے ساتھ تفسیر مدارج العرفان فی منہج کنز الایمان کے مقدمہ میں لکھا جا چکا ہے وہیں پر دیکھا جائے تاہم یہیں پر بطور جواب مختصر اتنا سمجھا جائے کہ ترجمہ کی درستی کے لیے دوسری تمام شرائط کی پابندی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ متن کے الفاظ کے مطابق پنے نئے الفاظ استعمال کیے جائیں جس میں کمی و بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی جس کے مطابق متن میں مذکور کسی اسم و فعل یا کسی مستقل حرف کو نظر انداز کرنا جائز ہے اور نہ اضافہ کرنا۔ جبکہ ترجمانی کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے جس کے مطابق ترجمانی کرنے والے کا اصل مقصد آیت کریمہ سے مقصد نزول کو آگے بیان کرنا ہوتا ہے جبکہ ترجمہ کرنے والے کو ایک ہی وقت میں اُس کی جملہ شرائط کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

نیز قرآن شریف کی ترجمانی عجمی زبان کے ساتھ عربی میں بھی ہو سکتی ہے جبکہ ترجمہ عربی میں نہیں بلکہ عجمی زبانوں کے ساتھ ہی خاص ہے کیوں کہ عربی زبان میں قرآن شریف کی جس آیت کریمہ اور اُس کے جس لفظ سے متعلق بھی جو مثبت گفتگو یا تحریر ہوتی ہے وہ اُس کی تفسیر، تشریح، تاویل یا اُس کی کسی بھی حیثیت کی توضیح سے خالی نہیں ہوتی جبکہ ترجمہ ان سب سے جدا مستقل حقیقت اور ان سب کا مظہر ہوتا ہے جس کو دوسری زبان میں معنوی قرآن بھی کہا جاسکتا ہے۔ نیز ترجمانی کا تعلق معانی سے ہوتا ہے جس کے مطابق اصل کلام سے مقاصد اور صرف مقاصد کو دوسری زبان میں بیان کیا جاتا ہے جبکہ ترجمہ کا تعلق اسل کلام کے الفاظ و معانی دونوں کے ساتھ ہوتا ہے جیسا اُس کی تعریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ”اببدال الفاظ القرآن اللسان الآخر التي تقوم مقامها“ سے عبارت ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حقیقی ترجمہ اور ترجمہ باللائم کے مابین تفریق کو ایسا سمجھا جائے جیسا فلسفہ کی زبان میں حد تمام اور رسم تمام کے مابین ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کی تعریف میں حیوان ناطق کہا جائے تب بھی درست ہے کہ دوسرے تمام جانداروں سے وہ ممتاز ہو جاتا ہے۔ اسی

طرح حیوان ضاحک کہا جائے تب بھی درست ہے کہ اس سے بھی وہ دوسرے تمام جانداروں سے کھر کر ممتاز ہو جاتا ہے یعنی انسان کی پہچان اور اس کو دوسروں سے ممتاز کرنے کی راہ میں کوئی فرق نہیں ہے حالانکہ اول اس کی حقیقت ہے کیوں کہ انسان کی حقیقت حیوان ناطق کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ دوسرا حقیقت نہیں بلکہ اس کا خاصہ ہے کیوں کہ انسانوں کی رسائی فہم کے مطابق حیوان ضاحک کا مجموعہ مرکب انسان کے سوا کسی دوسری مخلوق میں نہیں پایا جاتا ہے۔ انسان کی پہچان کے حوالہ سے یہ دونوں تعریف ہی کہلاتے ہیں اور دونوں درست ہیں البتہ دوسروں کی فہمائش کے لیے ان میں سے ہر ایک کے استعمال کرنے کے محل و مصرف جدا ہوتے ہیں، جن کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں۔

حقیقی ترجمہ اور ترجمہ باللازم کا بھی تقریباً یہی حال ہے کہ کسی آیت کریمہ کے حقیقی ترجمہ میں اس کی حقیقت اور اس کے منطوق اور حقیقی مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ ”فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ“ (البقرہ، 275) کا ترجمہ ”تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی تو وہ باز رہا تو اس کے فائدے کے لیے، اس کی ملک ہے وہ ریوی جو پہلے لے چکا ہے“ کے انداز میں کیا جائے یہ اس کا حقیقی ترجمہ ہوگا کیوں کہ اس میں اس کی ہیئت ترکیبی سے لے کر جملہ الفاظ کے حقیقی مفہوم کو ظاہر کیا گیا ہے اور اس کے ترجمہ میں یوں کہا جائے ”تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا“ یہ اس کا ترجمہ باللازم ہوگا اس لیے کہ آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم یعنی آیت کریمہ سے قبل لیے گئے ریوی کا اس کے فائدہ کے لیے ہونے اور اس کی ملک ہونے کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے حلال ہو۔

ترجمہ باللازم کے مواقع اور فوائد:-

آیات قرآنی کے حقیقی ترجمہ کے بجائے ترجمہ باللازم کی راہ اس وقت اختیار کی جاتی ہے

جب معیاری ترجمہ کی جملہ شرائط کے مطابق حقیقی ترجمہ مقذور ہو، اصل کے ایجاز و اختصار اور اس کی فصاحت و بلاغت کے مطابق ہونا ممکن نہ ہو اور تطویل سے بچنے کے لیے کوئی مخلص نہ ہو گیا اس کے مصرف وہی خاص مواقع ہوتے ہیں جن میں حقیقی ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان کا دامن تنگ ہو اور اس کے فوائد میں یہ ہے کہ آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ہونے کے ساتھ جملہ اعتراضات سے بھی پاک و محفوظ ہوتا ہے، جملہ شرائط کے مطابق ہونے کے ساتھ اصل کی عبارت النص کو ترجمہ والی زبان کی طرف منتقل کرنے میں واضح ہوتا ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ کہ ایجاز و اختصار میں آیت کریمہ کے مناسب ہوتا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جن تراجم کو مفسرین کے خلاف ہونے کی بنا پر غیر معیاری کہا جاتا ہے اس کی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت:- جہاں پر آیت کریمہ یا اس کے کسی لفظ کے معنی میں لسان قرآنی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ احتمالات ہو اور خارجی قرائن و شواہد سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو اور مفسرین نے بھی ان میں سے کسی کو ترجیح دیے بغیر یکساں ذکر کیا ہو۔ ایسے میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ترجمہ کو ان میں سے ایک پر بنا کرنے کے بجائے ایسا انداز اور ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو ان سب کو شامل ہو اگر ترجمہ والی زبان کی تنگی دامن اس کی اجازت نہ دے تو ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں ذکر کرنے کے بعد یا نئے تنویع کے ساتھ دوسرے کو بریکٹ میں کیا جائے تاکہ ترجمہ والی زبان میں اصل کے مطابق الفاظ کی عدم دستیابی کی طرف اشارہ ہو سکے۔

تقاضائے احتیاط کے اس فریضہ پر عمل کرنے کے بجائے اگر ترجمہ کو ان میں سے صرف ایک پر بنا کیا جائے تو یہ تقاضائے احتیاط کے منافی ہونے کے ساتھ اس وجہ سے بھی غیر معیاری کہلائے گا کہ مفسرین کے انداز سے انحراف ہے۔ غیر معیاری تراجم کی فہرست میں شامل اس کی مثالوں میں سے شتہ نمونہ از خروارے یہ کہ آیت کریمہ ”وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ“ کے اب تک کئے گئے وہ تمام

تراجم بھی شامل ہیں جن میں ”اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی، اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے صبر کی بڑی سخت آزمائش تھی، اور یہ سخت امتحان تھا تمہارے پروردگار کا، اس نجات دینے میں تمہارے رب کی بڑی مہربان تھی“ جیسے یکطرفہ انداز میں کیے گئے ہیں کیوں کہ پہلے تینوں کو متن کے لفظ ”بَلَاءٌ“ کے صرف ایک مفہوم یعنی آزمائش پر بنا کیا گیا ہے جبکہ چوتھے کو انعام و مہربانی والے مفہوم پر بنا کیا گیا ہے جو تقاضائے احتیاط کے منافی ہونے کے ساتھ جمہور مفسرین سے بھی انحراف ہے کیوں کہ یہاں پر مفسرین کرام نے لفظ ”بَلَاءٌ“ کے مذکورہ ایک مفہوم کو مراد لینی قرار دینے کے بجائے دونوں کو کسی ترجیح کے بغیر یکساں ذکر کیا ہے حالانکہ مفسر ہونے کی حیثیت سے ایک پر اکتفا کرنے کو ناجائز کہا جاسکتا ہے نہ غیر مناسب اس کے باوجود مفسرین کا کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے بغیر دونوں کو یکساں ذکر کرنا مقتضائے احتیاط ہونے کے سوا کوئی اور فلسفہ نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ لفظ ”بَلَاءٌ“ لغت کے اعتبار سے بھی ان دونوں مفہوموں کا یکساں احتمال رکھتا ہے اور مراد الہی ہونے کی حیثیت سے بھی دونوں درست ہیں تو پھر ترجمہ جیسے ہمہ جہت قابل احتیاط عمل کو صرف ایک پر بنا کرنے کی کیا تلک ہے۔ اس کے برعکس جنہوں نے اس کا ترجمہ ”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی (یا بڑا انعام)، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش یا بڑا انعام تھا“ جیسے انداز میں کیا ہے یہ مقتضائے احتیاط ہونے کے ساتھ مفسرین کے بھی مطابق ہے۔

دوسری صورت:- جہاں پر آیت کریمہ کے ایک سے زیادہ مفہوم ممکن ہوں جن میں سے مفسرین نے کسی ایک کو ترجیح دی ہو اور خارجی قرآن و شواہد سے بھی اُسے تائید مل رہی ہو۔ ایسے مواقع پر ترجمہ کو مفسرین کی ترجیح کے خلاف مرجوح احتمال پر بنا کیا جائے تو وہ غیر معیاری کے سوا اور کچھ نہیں کہلائے گا۔ اس کی مثال جیسے آیت کریمہ ”فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ“ (البقرہ، 54) کے اب تک اُردو زبان میں کیے گئے یہ تراجم (اور مارڈالوا اپنی اپنی جان، اور ہلاک کرڈالوا اپنی جانیں، اور اپنے آپ کو قتل کرو، تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو) ان چاروں میں سے پہلے تین

مفسرین سے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معیاری ہیں۔ کیوں کہ جمہور مفسرین نے یہاں پر آیت کریمہ کے اس مفہوم کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد خود کشی نہیں بلکہ ایسوں کو قتل کرنا ہے کہ جنہوں نے پھڑے کی پرستش نہیں کی تھی وہ انہیں قتل کریں جنہوں نے پرستش کی تھی اگرچہ وہ اُن کے باپ، بیٹے اور بھائی، بہن ہی کیوں نہ ہوں۔ آیت کریمہ کے اس مفہوم کو درلیہ بھی ترجیح ہے کہ خود کشی کرنے کا جواز اُس وقت کی شریعت میں بھی نہیں تھا، جیسا اب نہیں ہے۔ اور رولایہ بھی کہ اس کے مراد الہی ہونے پر کثیر روایات موجود ہیں۔ تفسیر زادالمیسر میں ہے:

”قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالُوا أَيْمُوسَى كَيْفَ يَقْتُلُ الْأَبَاءَ الْأَبْنَاءَ وَالْإِخْوَةَ الْإِخْوَةَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ظُلُمَةً فَمَا يَرَوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے فرمایا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ باپ، بیٹوں کو اور بھائی، بہنوں کو کس طرح قتل کریں تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر اندھیرا نازل کیا جس میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ تفسیر روح المعانی میں اس سلسلہ کی کثرت روایات کو قابل عمل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”وَلَوْلَا أَنَّ الرِّوَايَاتِ عَلَىٰ خِلَافٍ ذَلِكَ لَقُلْتُ بِهِ تَفْسِيرًا“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ خود کشی کے خلاف روایات اگر نہ ہوتی تو میں اس کو تفسیر کے طور پر بیان کرتا۔

خلاصۃ الکلام:- تفاسیر کے خلاف ہونے کی وجہ سے ترجمہ کے غیر معیاری ہونے کی ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے اور ذخیرہ تفاسیر میں صرف وہی تفاسیر معتبر ہیں جن کے لکھنے والوں کے کردار سے یہ معلوم ہو کہ وہ متعصب نہیں تھے، بدعتی و گمراہ نہیں تھے اور اپنے مخصوص نظریہ کو

(۱) تفسیر زادالمیسر لعبد الرحمن ابن جوزی المتوفی 597، ج 1، ص 70، مطبوعہ بیروت۔

(۲) روح المعانی، ج 1، ص 260، مطبوعہ بیروت۔

اصل سمجھ کر آیات قرآنی کو اُس کے تابع بنانے کی گراہی میں مبتلا نہیں تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے مسلمہ اصول و شرائط کے مطابق آیات قرآنی کی روشنی سے لوگوں کو مستفیض کرنے کے اسلامی جذبہ کے تحت حسبِ اللہ یہ سب کچھ کیا ہے اس معیار کی پابندی معلوم ہو جانے کے بعد جس فقہی مسلک سے بھی متعلق ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

الحمد للہ اسلاف کی اکثر تفاسیر کو دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسی پاک جذبہ ایمان کے تحت یہ لکھی ہیں بغیر واقعی ثبوت کے کسی مفسر سے متعلق تعصب کا گمان کرنا بجائے خود گناہ ہے اور قابلِ غور بات یہ کہ قرآن شریف کا ترجمہ تفسیری روایات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل حقیقت ہے، مستقل شرائط کے ماتحت ہے اور ہمہ جہت متعینی احتیاط عمل ہے جس میں مترجم کے لیے ناگزیر ہے کہ تفسیری حقائق سے بھی روشنی لے کیوں کہ اسلاف کا ذخیرہ علمِ اخلاف کے لیے مینارہ نور ہوتا ہے لیکن مترجم کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ترجمہ کی شرائط سے قطع نظر کر کے اُسے کسی تفسیری روایت پر یا کسی مفسر کی رائے پر بنا کرے کیوں کہ تفسیروں میں موجود ہر بات درست نہیں ہوتی اور کسی تفسیر کو قرآن بھی نہیں کہا جاسکتا۔ جبکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ جس زبان میں بھی لکھا گیا ہو وہ اُس زبان میں معنوی قرآن کہلاتا ہے۔ (وَاللّٰهُ الْمَوْفِقُ وَهُوَ يَهْدِي إِلَى سَبِيلِ الرَّشَادِ)

وانا العبد الضعیف

پیر محمد چشتی، کان اللہ..... ۲۰ مارچ ۲۰۱۱ء

حقیقی ترجمہ اور ترجمہ باللازم کا فرق

مسئلہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن سے لے کر تانہوز دو سو سال کے دوران اُردو زبان میں قرآن شریف کے لکھے گئے تراجم کے تقابلی جائزہ میں کنز الایمان کے جن مناجح کا یا معیاری ترجمہ کے لیے جن شرائط کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب قابلِ فہم ہیں لیکن اس تحریر میں قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کو ترجمہ بالحقیت اور ترجمہ باللازم کے نام سے جن دو قسموں میں منحصر کہا گیا ہے اس کی سمجھ مشکل ہو رہی ہے اس لیے کہ قرآن شریف کے ذخیرہ تفسیر میں ان قسموں کا کوئی ذکر پایا جاتا ہے نہ تراجم کے اس طویل سلسلہ میں کسی نے ان کو ذکر کیا ہے۔ مدارج العرفان کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ بالحقیت اور ترجمہ باللازم میں منحصر قرار دے کر ان دونوں سے مادراء تراجم کو غیر معیاری اور ناقابلِ قبول کہنا مدارج العرفان کا خاص انداز ہے جو اس کے بغیر کہیں اور سلف صالحین کے ذخیرہ کتب میں نہیں پایا جاتا۔ جس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس کی مکمل وضاحت کی جائے۔

الرسال..... مفتی عبدالحلیم ہزاروی، مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم غوثیہ پرانی سبزی منڈی کراچی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ان مخصوص الفاظ یعنی ترجمہ بالحقیت اور ترجمہ باللازم کے تذکرہ کو مدارج العرفان کا خاص انداز کہنا ہے تو یہ بالیقین درست ہے کہ حقیقت و واقعہ کا اس انداز سے اظہار کرنے کی سعادت اسی کا مقدر تھی جو اپنے وقت پر وجود میں آئی جو ”کُلُّ الْأُمُورِ مَرْهُونٌ بِأَوْقَاتِهَا“ کے مطابق نظامِ نکوین کا مظہر ہے لیکن اس کے معنوں اور پس منظر سے متعلق یہ کہنا کہ ذخیرہ تفسیر میں نہیں پایا جاتا بالکل غلط ہے بلکہ تفسیر کی کوئی ایک کتاب بھی ان سے خالی نہیں ہے جس کو سمجھنے کے لیے ان کی حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ترجمہ بالحقیت:- کسی آیت کریمہ کی ہیئت ترکیبی کے حقیقی مدلول سے لے کر اُس کے جملہ مفردات کے حقیقی مفہومات تک کو معیاری ترجمہ کی جملہ شرائط کے مطابق دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ ”وَاللّٰهُ مُجِيبٌ بِالْكَفْرِ“ کا ترجمہ ”اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے“ کے انداز میں کیا جائے۔

ترجمہ باللائم:- آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کے لازمہ کو دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔ مثال کے طور پر مذکورہ آیت کریمہ کا ترجمہ ”اور کافر اللہ کے گھیرے میں ہیں“ کے انداز میں کیا جائے۔ تو یہ ترجمہ بالحقیت نہیں بلکہ ترجمہ باللائم ہوگا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا انہیں گھیرنا اس کے بغیر نہیں ہوتا کہ یہ اُس کے گھیرے میں ہو اور مفسرین کرام کا کوئی بھی طبقہ ان دونوں کے معنوں اور ان کی حقیقت سے متجاوز ہو کر تفسیر نہیں کر سکتا بلکہ آیات قرآنی کی ہر تفسیر کے لیے بنیادی عنصر ان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اصول دین اور اسلامی عقائد پر آیات قرآنی سے استدلال کرنے والے طبقہ متکلمین کا انداز استدلال ہو یا بلاغی حیثیت سے فکر آزمائی کرنے والوں کا ذوق لطیف، نحوی اصولوں کے حوالہ سے جائزہ لینے والے ہوں یا فروعی اور احکامی حوالہ سے۔ بہر تقدیر یہ سب کے سب ان ہی کے فروع اور ان ہی کے مظاہر ہیں ایسے میں قرآن شریف کی کسی تفسیر کا ان سے خالی ہونے کا تصور ہی نہیں رہتا۔ لیکن مفسرین کے یہ دونوں عمل یعنی تفسیر کو آیت کریمہ کے حقیقی معنی پر بنا کر نا بھی اور اُس کے لازم پر بنا کر نا بھی تفسیر ہی کہلاتا ہے۔ مثلاً آیت کریمہ کے حصہ ”الْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ“ (التوبہ، 111) کا مفہوم حضرت عبداللہ ابن عباس نے ”الْقَائِمُونَ عَلَى طَاعَةِ اللّٰهِ“ میں بتایا ہے۔ جیسے امام بخاری نے لکھا ہے:

”قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ الْحُدُودُ الطَّاعَةُ“ (۱)

یعنی ابن عباس نے کہا ہے کہ حدود اللہ سے مراد ”طَاعَةُ اللّٰهِ“ ہے۔

(۱) بخاری شریف، ج 1، ص 390، کتاب الجہاد۔

اسی طرح کل مکاتب فکر اہل تفسیر نے بھی کسی نہ کسی انداز سے آیت کریمہ کے اس مفہوم کو تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے۔ شتہ نمونہ از خروارے روح المعانی، سورۃ النساء، آیت نمبر 13 میں مذکور لفظ ”يُنْكَحُ حُدُودَ اللّٰهِ“ کی تفسیر ”شَرَائِعُ اللّٰهِ، إِطَاعَةُ اللّٰهِ، تَفْصِيْلَاتُ اللّٰهِ“ اور ”شُرُوطُ اللّٰهِ“ جیسے متعدد چیزوں میں کی ہے۔ (تفسیر روح المعانی، ج 4، ص 233)

اور سورۃ التوبہ، آیت نمبر 111 میں مذکور لفظ ”الْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ“ کی تفسیر سے متعلق لکھا ہے:

”إِنَّ الْمَأْثُورَ عَنِ السَّلَفِ كَاهِنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا وَغَيْرِهِ تَفْسِيرُ الْحَافِظِينَ لِحُدُودِ اللّٰهِ بِالْقَائِمِينَ عَلَى طَاعَتِهِ سُبْحَانَهُ“ (۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ بے شک حضرت ابن عباس جیسے اسلاف سے اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت قائم کرنے میں منقول ہے۔

کون نہیں جانتا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے لے کر صاحب روح المعانی جیسے متاخرین تک کا یہ انداز اور یہ تشریح آیت کریمہ کی تفسیر باللائم کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور یہی چیز جب حدیث کی شروح میں مذکور ہو جائے یا شارحین حدیث اسے ذکر کریں تو پھر تفسیر نہیں بلکہ تشریح کہلائے گی۔ جیسے حضرت عبداللہ ابن عباس (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا) کی مذکورہ تفسیر باللائم کا تذکرہ کرتے ہوئے عمدہ القاری شرح بخاری میں لکھا ہے:

”بَعْنَى طَاعَةِ اللّٰهِ وَكَانَتْ تَفْسِيرُ بِاللَّائِمِ لِأَنَّ مَنْ أَطَاعَ اللّٰهُ وَقَفَ عِنْدَ امْتِنَالِ أَمْرِهِ وَاجْتِنَابِ نَهْيِهِ“ (۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابن عباس کا حدود اللہ کا مفہوم اطاعت اللہ میں بتانا تفسیر باللائم کے طور پر ہے کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب کرتا ہے وہ

(۱) تفسیر روح المعانی، ج 11، ص 32، مطبوعہ بیروت۔

(۲) عمدۃ القاری شرح بخاری، ج 14، ص 79، مطبوعہ بیروت۔

لا زمانہ فارمانی و معصیت سے منع ہوتا ہے۔

مدارج العرفان میں تفہیم کے اسی انداز کو ترجمہ باللازم کہا گیا ہے جس کے مقابلہ میں ترجمہ بالتحقیق ہے گویا آیات قرآنی کے ترجمہ کے سلسلہ میں متن کے حقیقی مفہوم کے کسی لازم کو اُس کے ترجمہ کے طور پر ذکر کرنے کو یہاں پر جو ترجمہ باللازم کہا گیا ہے اسی چیز کو کتب تفسیر میں تفسیر باللازم اور شروح حدیث میں تشریح باللازم کہا گیا ہے۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ اسلاف کے ذخیرہ کتب میں اس کا ذکر نہیں ہے بجائے خود غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ قرآن شریف کا جو ترجمہ ان دونوں کے خلاف ہو وہ معیاری نہیں ہو سکتا۔

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ معیاری ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن فہمی کے لیے جملہ علومِ آلیہ کے مطابق ہونے کے ساتھ اصل کی جامعیت اور اُس کے مقصدِ نزول کے بھی مطابق ہو اور ان سب کا تعلق اُس کے حقیقی مفہوم کے ساتھ ہے یعنی جب تک آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کا تعین نہیں ہوتا اُس وقت تک اُس کے لوازمات کی پہچان ہو سکتی ہے نہ تقاضوں کی، بلاغی حیثیت سے بحث ہو سکتی ہے نہ فقہی احکام سے، مفہوم مخالف کا اشارہ ممکن ہو گا نہ مفہوم مطابق کا کیوں کہ ہر تفسیر و تاویل اور ہر تشریح و تفہیم کی بنیاد اور سب کے لیے اصل الاصول آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اسی فلسفہ کی بنیاد پر عام حالات میں آیات قرآنی کی تفسیر کو بھی اسی پر استوار کیا جاتا ہے اور ترجمہ کو بھی جن کو بالترتیب تفسیر بالتحقیق اور ترجمہ بالتحقیق کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ ترجمہ کی نسبت تفسیر میں زیادہ گفتگو کی گنجائش ہوتی ہے جس وجہ سے مفسر آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کی طرف راجع ہونے والے کسی بھی مفہوم کو موضوع بحث بنا سکتا ہے چاہے اُس کے ساتھ بعید سے بعید تریب ہی کیوں نہ ہو ترجمہ کا معاملہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ یہاں پر متن کے مطابق پنے ثلث الفاظ میں اصل مقصد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے سوا اضافی ایک لفظ استعمال کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی اور جہاں پر ترجمہ والی زبان کی تنگی دامن کی بنا پر ایسا ہونا ممکن نہ ہو تو وہیں پر ترجمہ باللازم کی راہ اختیار کرنی

ہوتی ہے کیوں کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں ایجاز و اختصار کا اہتمام کرنا سب سے اہم ہے تاکہ ترجمہ اصل کے مطابق ہو سکے ورنہ اصل کی فصاحت و بلاغت کے منافی ہوگا۔ الغرض ترجمہ بالتحقیق ہو یا باللازم ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ جملہ شرائط کے مطابق ہو ورنہ کسی ایک سے انحراف پر بھی معیار سے نکل جائے گا چاہے بالتحقیق ہو یا باللازم اور اگر ان دونوں سے خارج کسی بھی مفہوم پر استوار کیا گیا ہو تو اُس کے معیاری ہونے یا آیت کریمہ کی شان کے لائق ہونے کا تصور ہی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

سورة یاسین آیات 7 تا 9 کی تفسیر

سوال یہ ہے کہ سورة یسین شریف میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ سے متعلق فرمایا:

”لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ إِنَّا جَعَلْنَا فِيهِۦمُ آغْصَانًا فَهُمْ إِلَىٰ آلاذِقَانٍ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ“ (۱)

مفسرین کرام کے مطابق مفہوم اس کا یہ ہے کہ عذاب ان کا مقدر ہونے کی وجہ سے انہیں ایمان نصیب نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کی راہ میں ایسے موانع ورکاؤئیں کھڑی کی ہیں جیسے کسی شخص کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ کر گلے میں طوق ڈالا گیا ہو تو سر اوپر رہنے کی وجہ سے وہ اپنے گرد و پیش دیکھنے سے عاجز ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ نے ان کے آگے پیچھے دیواریں کھڑی کر کے اوپر سے بھی ڈھانپا ہے جس وجہ سے وہ چاروں طرف سمجھ سے عاجز ہیں۔

اس سے مندرجہ ذیل سوالات کا پیدا ہونا فطری بات ہے:

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کی خبر دی تو اللہ کی خبر و کلام کا صدق واجب اور جھوٹ محال و ناممکن ہونے کی بنا پر ان کا ایمان لانا بھی ناممکن و محال قرار پایا جبکہ اللہ تعالیٰ کسی ناممکن چیز کو وجود میں لانے کے لیے کسی انسان کو مکلف نہیں فرماتا۔ جیسے ارشاد ہے کہ:

”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ (۲)

استطاعت کے سوا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مکلف نہیں فرماتا۔

(۱) یس، 7 تا 9۔ (۲) البقرہ، 286۔

تو پھر مشرکین مکہ سے ایمان کا مطالبہ کرنا، رسول ﷺ کو ماننا اور ان کے احکام ماننے کا امر کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

جب اللہ تعالیٰ نے خود ان پر ایمان لانے کے راستے اور سمجھ کی سہولیات بند کر دی ہیں تو پھر انہیں عذاب دینا کون سا انصاف ہے کیا یہ عدل و انصاف کے منافی نہیں ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ہر کلام اور ہر خبر تقدیر الہی کے مطابق ہوتی ہے تو جب ان کا ایمان نہ لانا اور آگے پیچھے دیواروں کے حصار میں محصور ہونا تقدیر کا فیصلہ ہے تو پھر ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور ہے کہ انہیں عذاب دیا جاتا ہے؟

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پہلے سوال کا جواب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مفہومات ثلاثہ کی حقیقت پہچانی جائے جو اس طرح ہے کہ مفہومات ثلاثہ یعنی واجب، محال اور ممکن میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں۔

واجب کی ایک قسم وجوب ذاتی ہے جس کو وجوب عقلی بھی کہتے ہیں جس کا ہونا ضروری اور نہ ہونا محال ہو جس کا مصداق و مظہر اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لا شریک اور اُس کی جملہ صفات و کمالات ہیں، اس حیثیت سے کہ وہ اُس کی صفات و کمالات ہیں۔

دوسری قسم وجوب عادی ہے جس کا ہونا عادی ضروری ہو اور نہ ہونا محض عادت کے حوالہ سے محال ہو ورنہ فی نفسہ ممکن ہوتا ہے۔ اس کی مثالوں میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو کسی سبب کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی پینے کے بعد پیاس کا بجھنا جو فی نفسہ امر ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو دس بالٹیاں پی جائے پھر بھی پیاس کا بجھنا نصیب نہ ہو جیسے سرسام کی بیماری میں ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کریمانہ عادت جاری ہے کہ انسانوں کے عمل سے ان اسباب کا وجود میں آنے کے فوراً بعد مصلحت ان کے نتائج و مقاصد اور ثمرات و مطالب ان پر مرتب فرماتا ہے۔ دنیا کا سارا نظام

حیات ماتحت الاسباب ہونے کی بنا پر وجوب عادی کے اس خود کار نظام قدرت کے مطابق چل رہا ہے جس کا خالق صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے۔

محال کی ایک قسم محال ذاتی ہے جس کا ہونا محال اور نہ ہونا ضروری ہوتا ہے جیسے اللہ وحدہ لا شریک کی ذات و صفات اور اس کے جلال و جمال کے منافی ہر کوئی عمل جیسے رسول، عابد اور شفیع ہونا کیوں کہ رسول ہونا انسان کے حق میں اعلیٰ صفت و کمال ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے اس لیے کہ رسول اپنے پیچھے والے کا محتاج اور اس کے حضور نیاز مند ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج و نیاز مند ہونے سے منزہ و مقدس اور بے نیاز ہونے کی بنا پر اس کا کسی کی طرف سے رسول و پیغمبر نہ ہونا ضروری اور ہونا محال ہے۔ یہی حال عابد ہونے کا بھی ہے عبادت کرنا انسان کی اعلیٰ صفت و کمال ہونے کے باوجود خالق کائنات جل جلالہ و عم نوالہ کے لیے عیب ہے اس لیے کہ عابد ہمیشہ معبود کا محتاج اور اس کے حضور نیاز مند ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا جملہ خلأقی سے بے نیاز، سب کا محتاج الیہ اور سب کا حاجت روا ہونے کی بنا پر کسی کے حضور نیاز مندی کرنے سے منزہ و مقدس ہو کر کسی کے لیے عابد ہونا اس کا محال و ناممکن اور نہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اللہ کا کسی کو چھڑانے کے لیے یا کسی کی حاجت برآوری کے لیے کسی اور کے سامنے شفاعت و سفارش کرنا بھی فی نفسہ ناممکن و محال ذاتی ہے کیوں کہ شفاعت کرنے والا جس کے حضور شفاعت کر رہا ہوتا ہے اس کے بغیر متعلقہ کام کو خود انجام دینے سے عاجز ہوتا ہے جبکہ محجز عیب ہے جو اللہ کی شان اقدس کے منافی ہونے کی بنا پر اس پر محال ہے جس کا نہ ہونا ضروری اور ہونا غیر ممکن ہے۔ انسانوں کے جملہ افعال و صفات کا یہی حال ہے کہ وہ صفت مدح ہو یا صفت ذم بہر تقدیر مربوط بالاسباب ہونے، ممکن ہونے اور عیب و نقصان ہونے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے لیے ذاتاً و عقلاً محال و ناممکن ہیں۔

دوسری قسم محال عادی ہے جس کا نہ ہونا فی نفسہ ممکن اور عادتاً ناممکن ہوتا ہے جیسے تمام روئے زمین کے انسانوں کا مسلمان ہونا یا سب کا غیر مسلم ہونا جن میں سے ہر ایک کو عقل جائز سمجھتی ہے یعنی ان میں سے

کسی ایک کے ہونے کو بھی ضروری نہیں سمجھتی اور نہ ہونے کو بھی ضروری نہیں سمجھتی بلکہ ہر جانب برابر ہے۔ اسی طرح زمین و آسمان کو سونے میں یا چاندی میں تبدیل کرنا جو فی نفسہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے متعلق ہو سکتا ہے لیکن عملاً و عادتاً ایسا کرنا محال ہے۔

ممکن کی ایک قسم ممکن خاص ہے جس کے جانب وجود و عدم میں سے کسی ایک کو بھی انسانی عقل ضروری نہ سمجھے جس کے نتیجے میں اس کے ہر دونوں جانب ممکن اور برابر ہوتے ہیں۔ انسانوں کے جملہ افعال و اعمال اس امکان کے مظاہر و مثالیں ہونے کے ساتھ جملہ محسوسات و معقولات بھی اس کی مثالوں میں شامل ہیں۔

دوسری قسم ممکن عام ہے جس کے جائزین میں سے ایک کا غیر ضروری ہونا معتبر ہوتا ہے جبکہ دوسری جانب عقل کی توجہ و التفات ہی نہیں ہوتی۔ اس کو ممکن عام کہنا اس وقت تک درست ہے جب تک دوسری جانب عقل کی توجہ و التفات نہیں ہوتی ورنہ عقل کا اس کی طرف متوجہ ہونے کے بعد یہ ممکن عام ہونے کی صفت سے نکل کر ”احد المفہومات الثلاثة“ یعنی واجب، محال اور ممکن خاص میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کو ممکن عام کہنے کا جواز بھی یہی ہے کہ انجام کار اس کے مصداق و افراد ممکن خاص کے مقابلہ میں 2/3 زیادہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر عقل کا نوع انسانی کے وجود کو غیر ضروری جاننا اس کے ساتھ دوسری جانب یعنی اس کا وجود میں آنے کو ضروری یا غیر ضروری ہونے کی طرف توجہ نہ ہونے تک نوع انسانی کا عدم ممکن عام کہلائے گا۔ جس کے مطابق ”عَدَمُ الْإِنْسَانِ مُمْتَكِنٌ“ کے قضیہ میں مذکور ممکن سے مراد ممکن عام ہوگا اور توجہ کرنے کے بعد اس کا وجود میں آنے کو بھی غیر ضروری جانے کا تو اس وقت ممکن خاص کہلائے گا جس کے مطابق ”عَدَمُ الْإِنْسَانِ مُمْكِنٌ“ کے اندر مذکور ممکن سے مراد ممکن خاص ہوگا اور دفعتاً جائزین کو غیر ضروری جاننے کے بعد ”وُجُودُ الْإِنْسَانِ مُمْتَكِنٌ“ اور ”عَدَمُ الْإِنْسَانِ مُمْتَكِنٌ“ میں سے ہر ایک ممکن خاص کہلائے گا اسی طرح ”شریک الباری تعالیٰ ممکن“ قضیہ میں ممکن جو شریک الباری پر محمول ہو رہا ہے اس وقت تک ممکن عام کہلائے گا

جب تک اس کی جانب عدم کے ضروری یا غیر ضروری ہونے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف جانب وجود کو غیر ضروری تصور کیا جا رہا ہو ورنہ جانب عدم یعنی اس کے عدم کی طرف متوجہ ہو کر اس کو ضروری جاننے کے بعد ممکن عام کی صفت و تعبیر سے نکل کر محال کے زمرہ میں شامل ہوگا کیوں کہ محال وہی ہوتا ہے۔ جس کا وجود غیر ضروری اور عدم ضروری ہوتا ہے اس مرحلہ میں شریک الباری تعالیٰ ممکن کہنا موبہم غلط ہونے کی بنا پر شرعاً ناجائز ہوگا بلکہ شریک الباری محال کہنا ہی متعین ہوگا۔

یہی حال اس ممکن عام کا ہے جو انجام کار واجب کہلاتا ہے جیسے ”صدقہ سبحانہ و تعالیٰ ممکن“ قضیہ میں جب تک جانب وجود کے ضروری یا غیر ضروری ہونے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف اور صرف جانب عدم کے سلب ضرورت کا تصور ہو ورنہ اس کے ساتھ جانب وجود کی طرف متوجہ ہونے کے بعد اسے ضروری جاننے کے مرحلہ میں امکان عام کی صفت و تعبیر سے نکل کر واجب کہلاتا ہے کیوں کہ واجب وہی ہوتا ہے۔ جس کا وجود ضروری اور عدم غیر ضروری ہو۔ اس صورت میں صدقہ سبحانہ و تعالیٰ ممکن کہنا موبہم غلط ہونے کی بنا پر شرعاً ناجائز ہوگا بلکہ صدقہ سبحانہ و تعالیٰ واجب کہنا لازم ہوگا۔

تفصیل در تفصیل اور مزید وضاحت:- اس طرح ہے کہ ممکن خاص میں جانبین غیر ضروری ہوتے ہیں یعنی جانب وجود بھی غیر ضروری اور جانب عدم بھی غیر ضروری ہوتی ہے جبکہ ممکن عام میں صرف سلب ضرورت جانب مخالف ہوتی ہے جس کا انجام حاکمیت عقل کے بعد اس تفصیل کے مطابق واجب یا ممکن پر منتج ہوتا ہے جو ابھی ہم نے پیش کی ممکن خاص کی پھر تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم:- ممکن علی الاطلاق ہے جس میں سلب ضرورت جانبین کے سوا کسی اور کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ جیسے انسانوں کے جملہ افعال و اعمال۔

دوسری قسم:- ممکن بالذات واجب بالغیر ہے جیسے جمہور متکلمین کے مطابق جملہ صفات باری تعالیٰ۔

تیسری قسم:- ممکن بالذات ممتنع بالغیر ہے جیسے کسی بھی مخلوق کا عدم وجود یعنی پیدا نہ ہونا جو فی نفسہ

ممکن ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ارادہ تکوینی کے ساتھ مسبوق و متعلق ہونے کے اعتبار سے ممتنع قرار پاتا ہے کیوں کہ ارادہ تکوینی کی مراد کا وجود میں نہ آنا صاحب ارادہ کے عجز کی یقینی علامت ہے، جو اللہ تعالیٰ پر محال و ممتنع ہے اور جو محال کو مستلزم ہو وہ ہمیشہ محال بالغیر کہلاتا ہے۔

ان حقائق کو سمجھنے کے بعد سوال نمبر (۱) کا جواب آسان ہو گیا کیوں کہ جن کفار و مشرکین کے ایمان نہ لانے کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے وہ کلام الہی ہے اور کلام الہی صفت الہی ہے جو واجب الصدق اور ممتنع الکذب ہے جبکہ ان لوگوں کا ایمان لانا اور نہ لانا ہر دو ممکن بمعنی ممکن خاص اور ممکن علی الاطلاق ہیں جو ممکن بالذات ہونے کے ساتھ بالترتیب محال بالغیر اور واجب بالغیر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کے ساتھ متعلق ہونے سے قطع نظر ان کا ایمان لانا ممکن تھا کیوں کہ فاعل مختار ہونے کے ناطے ایمان کے لوازمات کا ارتکاب بھی اور اس کے اضرار کا ارتکاب بھی ان کے تحت القدرت ہیں کسی ایک اعتبار سے بھی عاجز نہیں ہیں اور ایمان لانے اور اطاعت کرنے کے ساتھ مکلف بھی اسی حیثیت سے ہیں اس میں عدل و انصاف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے بلکہ تکلیف بالممكن ہی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ ان کے ایمان نہ لانے کو جاننے اور دنیا کو اس سے آگاہی و خبر دینے کے باوجود انہیں مکلف بالا ایمان کر کے ان سے ایمان و اطاعت کا مطالبہ کرنے کا فلسفہ کیا ہے؟

تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا ہے۔ جیسے فرمایا:

”وَلَوْلَا أَنْ تُصِيبَهُمْ مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَتَتَّبِعَ إِلَيْكَ وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ (۱)

نیز فرمایا:

”وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُمْ بَعْدَ مَا مِنْ قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ إِلَيْكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَذِلَّ وَنَخْزَى“ (۲)

قرآن شریف کے ان دونوں مقامات سے ایک ہی مقصد ہے کہ ایمان لائے بغیر مرنے والے کفار و مشرکین کو رسول بھیج کر ایمان کی دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ اگر نہ کی جاتی تو قیامت کے دن یہ عذر کرتے کہ خدا یا تو نے ہماری طرف رسول بھیج کر تبلیغ کیوں نہ کرائی تاکہ ہم بھی ایمان لا کر اپنا مستقبل سنوارتے۔ اسی فلسفہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

”لَئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کی خبر دینے کے باوجود رسول بھیج کر انہیں تبلیغ و دعوت دینے کا فلسفہ تمام حجت بتایا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد ہیں من جملہ ان میں سے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے جانشین و رتاء و مسلم مبلغین کو دعوت و تبلیغ کا ثواب دینا ہے۔ جیسے فرمایا:

”وَأَنَّ لَكَ لَا أَجْرًا غَيْرَ مُمْنُونٍ“ (۲)

یعنی تیرے لئے حساب سے ماوراءِ اجر و ثواب ہے۔

نیز حدیث شریف میں اللہ کے رسول ﷺ نے دعوت و تبلیغ دینے والوں کو عظیم اجر و ثواب کا یہ رتبہ پانے کے لیے ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”لَا يَهْدِي اللَّهُ بَكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ خُمُرِ النَّعَمِ“ (۳)

تیری تبلیغ سے ایک آدمی کو ہدایت نصیب ہونا بھی تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ اچھا ہے۔

ایک فلسفہ اس کا یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو تبلیغ کر کے درہ اسلام میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ سب کے سب ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کے مصداق و مظہر نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک معاشرہ، ایک کنبہ اور ایک علاقہ و برادری کے ہوتے ہوئے بھی ”يُؤْمِنُونَ“ اور ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کا اختلاط ہوتا ہے عام لوگوں کو

”يُؤْمِنُونَ“ اور ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کے انجام کا پتہ نہیں ہوتا کہ کون ایمان لائے گا اور کون نہیں اور کس کے مقدر میں ایمان لکھا ہوا ہے اور کس کے نہیں جیسا فرمایا:

”مَا كَانَ اللَّهُ لِيُذِلَّ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ“ (۱)

تو ظاہر ہے کہ اس مشترکہ تبلیغ کے نتیجہ میں ان لوگوں کا دائرہ اسلام میں آکر ”يُؤْمِنُونَ“ کا مظہر بننا بھی اس کا عظیم فلسفہ ہے۔

﴿ضروری وضاحت﴾ یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں سے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کی خبر دے کر ان کا خاتمہ بالکفر ہونے پر مہر لگائی ہے، انہیں زمانہ نزول قرآن کے ابو جہل اینڈ کو کے ساتھ مخصوص تصور کرنے کا جو عام تصور پایا جاتا ہے غلط ہے کیوں کہ اُس وقت جس دشمن اسلام کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے یہ نام مقرر کیا تھا۔ اس کے پس منظر میں اس دشمن رسول کا جہل مرکب میں مبتلا ہونے کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی ایسے میں ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کی خبر صادق کے نازل ہونے کا سبب اگرچہ وہ مخصوص لوگ تھے لیکن اس تصور کی گنجائش اسلام میں نہیں ہو سکتی کہ وہ زیر زمین ہونے کے بعد کوئی اور اس کا مصداق و مظہر نہ ہو، ورنہ خدا نخواستہ اللہ کی کتاب، یہ خبر اور یہ کلام مخصوص اشخاص سے متعلق قصہ و حکایت بن کر رہ جائے گا۔ جس کا تصور بھی اسلام میں نہیں ہے کیوں کہ اللہ کی کتاب کا اور اس کے ایک ایک حصہ کا رہتی دنیا تک جملہ انسانوں کے لیے نصاب تبلیغ و رہنما و ہدایت ہونا ضروریات دین کے قبیل سے ہے۔ جس کو زمانہ ماضی کے ساتھ خاص کہنے والا مسلمان نہیں رہ سکتا۔

جس کا مقتضا یہی ہے کہ ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کی یہ خبر الہی دنیا بھر کے ان تمام غیر مسلم افراد کو شامل ہو جائے جو اسلام کے حوالہ سے جہل مرکب میں مبتلا ہیں، جن کی اصلاح ممکن نہیں ہے یعنی ممکن بنفسہ او ممتنع بالغير

ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ”لَا يُؤْمِنُونَ“ ہونے کے باوجود دنیا کی آنکھوں سے مستور العاقبہ ہے، جن کو دعوت ایمان دینے پر علماء امت ایسے ہی مکلف و مسئول ہیں جیسے رحمت عالم ﷺ مسئول تھے، جنہیں دعوت ایمان دے کر تبلیغ کرنے میں ایسے ہی مامور ہیں جیسے ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین مامور تھے الغرض ایسے افراد کو تبلیغ کرنے کا جو فلسفہ انبیاء کرام کے زمانہ اقدس میں تھا علماء امت کے زمانہ تبلیغ میں بھی قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ اس لیے کہ کج کلاہان عالم جن کا انجام چاہے ”يُؤْمِنُونَ“ ہو یا ”لَا يُؤْمِنُونَ“ انہیں دعوت تبلیغ کر کے صراط مستقیم کی طرف لانے کی کوشش ہر دور تاریخ کے صلحاء پر فرض رہی ہے چاہے وہ جس خطہ ارض، جس زمانہ اور جس قوم و قبیلہ کے افراد ہوں۔ عمومت قرآن کے اس فلسفہ کے عین مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب رحمت عالم ﷺ کی زبان سے کہلوا یا ”لَا نَذْرَ لَكُمْ وَ مَنْ بَلَغَ“ (الانعام، 19) جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف مجھ پر اس لیے نازل فرمایا ہے کہ تمہیں بھی اور ان سب کو بھی کفر کے انجام بد سے ڈراؤں جس کو اس کی تبلیغ پہنچ سکتی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی کافر و شرک الغرض کسی بھی انسان پر سمجھ کی راہیں مسدود نہیں فرماتا، نہ کسی کو گمراہ کرتا ہے، نہ کسی کو حق سننے سے بہرہ کرتا ہے، نہ حق کو دیکھنے سے اندھا اور سمجھنے سے گونگا کر کے اپانچ بنانے کے بعد شریعت کو سمجھنے، سننے دیکھنے اور اس پر ایمان لانے کے ساتھ مامور کر کے ظلم کرتا ہے۔ حاشا و کلا رب کریم و کی ذات اقدس اس سے پاک و سبحان ہے جیسا فرمایا:

”وَمَا نَابِظُلَامٍ لِلْعَبِيدِ“ (۱)

دوسری جگہ فرمایا: ”وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ“ (۲)

تیسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“ (۳)

سورة یسین شریف کی محمول آیات میں مشرکین و کفار کے آگے پیچھے دیوار لگانے اور انہیں بے بصیرتی کے پردہ میں ڈھانپنے کا جو ذکر آیا ہے یہ سب کچھ ان کے اپنے برے اعمال کے نتائج ہیں جو اللہ وحدہ

(۱) قی، 29۔

(۲) غافر، 31۔

(۳) البقرة، 185۔

لا شریک کے بنائے ہوئے خود کا نظام عدل کے مطابق ان پر مرتب ہوتے ہیں جیسے سورة المطففين میں فرمایا:

”كَذَّابٌ زَانٌ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ (۱)

ہرگز کسی اور نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ ان کے اپنے اختیاری گناہوں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔

اس اجمالی جواب کی تفصیل کو سمجھنے کے لیے اسلام کے مندرجہ ذیل مسلمات کو بطور تمہید سمجھنا ناگزیر ہے: پہلا مسلمہ:- ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کے افعال و اعمال کے حوالہ سے مختار کل پیدا فرمایا ہے جس کے مطابق وہ اچھا کرے یا بُرا، اللہ تعالیٰ اس کی راہ نہیں روکتا یہ الگ بات ہے کہ اُس کے ایمان و اطاعت پر خوش ہوتا ہے اور کفر و محصیت پر ناراض ہوتا ہے۔ خوش اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں بندے کا اپنا مفاد ہے، اس کے مستقبل کی ترقی و عروج ہے اور اس کی سر بلندی و فلاح ہے اور اللہ تعالیٰ از لا، ابتداً ہمیشہ کے لیے اپنے بندوں کو ترقی و عروج اور سر بلندی و فلاح میں دیکھنا پسند فرماتا ہے، اپنے کسی بھی بندے کو کسی وقت بھی زوال پذیر، سر پست اور مستحق عذاب دیکھنا گوارا نہیں فرماتا۔

دوسرا مسلمہ:- انسان کے اچھے اعمال کے اچھے نتائج و لوازمات اور برے اعمال کے برے نتائج و لوازمات ہوتے ہیں چاہے ان کا ظہور اس جہاں میں ہو یا قبر میں یا آخرت کے کسی بھی مرحلہ میں۔ نیز ان لوازمات و نتائج کا اسے احساس ہو یا نہ ہو، وہ ان پر خوش ہو یا ناخوش بہر تقدیر ان کا اپنے اپنے اوقات کے مطابق وجود میں آنا اللہ کے بنائے ہوئے خود کا نظام قدرت کے ماتحت اٹل، حتیٰ اور ناقابل انکار حقیقت ہے۔

تیسرا مسلمہ:- انسانوں کے دخل عمل سے وجود میں آنے والے افعال و اعمال و قدرتوں کے ماتحت وجود میں آتے ہیں جن میں سے اول خود انسان کی قدرت کا سہ ہے جس کے مطابق اس عمل کے

(۱) المطففين، 14۔

اسباب و آلات کو اللہ کی دی ہوئی طاقت و اختیار کے ساتھ وجود میں لانے کے لیے انسانی عمل کا رگڑ ہوتا ہے۔ جس کو کسب کہتے ہیں، جو پہلے نہیں تھا اب وجود میں آ رہا ہے، مسبوق بالعدم ہے اور محتاج آلات و اسباب ہے جس کا فاعل صرف اور صرف بندہ ہے جو فاعل مختار ہونے کی بنا پر اپنی رضا و اختیار سے اس کا ارتکاب کر رہا ہے۔

جبکہ دوسری قدرت خالقہ ہے جو اسباب و آلات سے ماوراء ہے، ازلی وابدی، حدوث و امکان سے پاک اور قدیم ہے جس کو تکوین و تخلیق کہتے ہیں۔ یہ صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کا فعل ہے جیسے کسب میں اللہ تعالیٰ کا بندہ کے ساتھ شریک ہونا اور کسب کو اللہ کی طرف منسوب کرنا خلاف حقیقت، جھوٹ اور شان خداوندی کے منافی ہے اسی طرح بندے کی طرف سے کسب کا وجود میں آنے کے بعد اس کے لوازمات و نتائج کی تکوین کرنے اور مالہ الکسب کو وجود میں لا کر خالق کہلانا بھی صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کا فعل ہے۔ گویا اللہ کی دی ہوئی طاقت و آلات اور اسباب کو اختیار کر کے کسب کرنا انسان کا خاصہ ہے جبکہ اس کسب کا وجود میں آنے کے بعد اس کے نتائج و لوازمات کو تخلیق کرنا صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کا خاصہ ہے۔

چوتھا مسئلہ:- انسان کے کسب اور اس کے اختیاری افعال و اعمال کے بعد اس کے نتائج و لوازمات کا اُس پر مرتب ہونا فی نفسہ ممکن ہونے کے باوجود عادتاً واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کریمانہ عادت جاری ہے کہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا ہر ایک کے کسب پر اس کے مقاصد مرتب فرمانے کے ساتھ اس کے جملہ لوازمات و عواقب بھی مرتب فرماتا ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا:

”كَلَّا نُمَدِّدُ هُوْلًا ۖ وَهَوْلًا ۖ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا“ (۱)

دونوں فریقوں کو ہم تیرے پروردگار کا دین دے دیتے ہیں اور تیرے پروردگار کا دین کسی سے بھی روکا نہیں جاتا۔

(۱) بنی اسرائیل، 20۔

رہ کریم ہو کے اس کلام میں عطا جس کی اصل عطو ہے ایک دوسرے سے لینے اور مناوہ کے معنی پر دلالت کرنے کی وجہ سے بتا رہا ہے کہ انسان کا ہر اختیاری فعل و کسب صحیفہ کائنات میں درج ہونے کی شکل میں نظام قدرت کے سپرد ہوتا ہے۔ جس کے نتائج و لوازمات جزا و سزا کی شکل میں یا مسبب کا سبب پر مرتب ہونے کی شکل میں کسب کرنے والے کو دیئے جاتے ہیں گویا ایک ہاتھ سے دینا اور دوسرے سے لینا ہے۔ مثال کے طور پر جب انسان پانی پینے کے لیے ہاتھ پیر ہلا کر اور اس کے لیے مقررہ اسباب و آلات کو اختیار کر کے مناسب کسب و عمل کرتا ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی کریمانہ عادت کے مطابق اس کا نتیجہ پیاس بجھانے کی شکل میں اس پر مرتب فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ اگر نہ چاہے تو دس (۱۰) بالیاں پی جائے تب بھی پیاس نہ بجھے۔ جیسے سرسام کی بیماری میں ہوتا ہے۔

اسی طرح آگ جلا کر ابراہیم خلیل اللہ کو اس میں ڈالنا ضرورتاً اختیار کر کے کسب تھا جس کے بعد جلنے کی شکل میں نتیجہ کا اس پر مرتب ہونا مقدور تحت قدرت اللہ تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا تو مرتب نہ ہوا بلکہ مقصد کسب کے برعکس ہو کر ترتیب نتیجہ کے وجود و عدم کے ہر دونوں جانبوں کے ممکن بالذات ہونے پر لازوال دلیل بنا، تاہم اس قسم معجزات و کرامات انسانوں کے لاکھوں، کروڑوں کسب ہائے عمل میں بھی کہیں نظر نہیں آتے جب تک ابراہیم خلیل اللہ جیسے مظہر موجود نہ ہو۔ ایسے میں انسان کا اپنے کسی کسب پر مثال کے طور کسب ایمان یا کسب کفر، کسب اطاعت یا کسب معصیت پر اُس کے نتیجہ مرتب نہ ہونے کی توقع کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے خودکشی کرنے کے بعد موت واقع نہ ہونے کی توقع کرنا یا زہر کھانے کے بعد موت سے بچنے کی توقع کرنا۔

پانچواں مسئلہ:- معاشرتی حالات و ماحول سے متاثر ہونا انسان کی فطرت میں شامل ہے، اچھوں کے ماحول میں رہنے والوں کے عقیدہ و عمل کا اچھا ہونا اور بروں کے ماحول میں رہنے والوں کا برا ہونا بجائے خود ممکن بالذات ہونے باوجود امر عادی ہے، روز اول سے اب تک کا مشاہدہ ہے اور ناقابل انکار حقیقت ہے جس کے مطابق بڑے بڑے بزرگوں اور معصوموں کے خانوادے ناکارہ خلائق بن کر

قصر ذلت میں گرے جبکہ بعض کج کلاہان عالم کی اولاد کو صلحاء کا ساتھ میسر ہونے کی بدولت سعادت مندیاں نصیب ہوئیں۔ فطرت کے اس اصول کے مطابق ان حضرات کو صاحب کرامت کہا جاتا ہے جو اہل معصیت کے معاشرہ و سماج میں رہتے ہوئے بھی استقامت فی الدین کی شاہراہ پر چل رہے ہوتے ہیں "لَا سُبْقَامَةَ فَوْقَ الْكُورَةِ" جو لوگ اہل معصیت کے ماحول و معاشرہ میں رہتے ہیں اور ان کے رنگ میں رنگین ہوتے ہیں اور ان کے عقیدہ و عمل، عادات و اطوار، مذہبی رسوم و رواج کے عادی ہوتے ہیں ان کے لیے وہ ماحول بمنزلہ حصار و چار دیواری ہوتا ہے جس سے نکلنا ایسا ہی مشکل ہوتا ہے جیسے زندان کی چار دیواری سے نکلنا مشکل ہے۔ بطور تمہید ان حقائق کو سمجھنے کے بعد اصل مسئلہ کو سمجھنا آپ ہی آسان ہو جاتا ہے کیوں کہ جن کفار و شرکین کی بابت "لَا يُؤْمِنُونَ" کی خبر صادق آئی ہوئی ہے۔ اس کے اعتبار سے تو ان کا ایمان لانا محال و ناممکن ہے۔ لہذا اس حوالہ سے تو وہ مکلف ہی نہیں ہیں کہ ایمان لانے کا ان سے مطالبہ کیا جائے جبکہ اس سے قطع نظر فاعل مختار ہونے کے اعتبار سے ان کا ایمان لانا ممکن بالذات ہے تو ایمان لانے کے ساتھ انہیں مکلف کرنا بھی فقط اسی اعتبار سے ہے جس میں تکلیف بالاحمال نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح ایمان کی ضد یا نقیض یعنی "لَا يُؤْمِنُونَ" کے مضمون کا واجب ہونا بھی اس کے امکان کے منافی نہیں ہے کیوں کہ اس کا وجوب بغیرہ ہے جو ممکن بنفسہ کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ ایسے میں کفار و شرکین کے اس طبقہ کا ایمان لانے اور نہ لانے کے ہر دونوں جانب ممکن خاص اور ممکن بالذات قرار پائیگی بنا پر ان میں سے کوئی ایک بھی اس طبقہ کی قدرت و استطاعت سے بعید نہیں ہے یعنی "يُؤْمِنُونَ" محال ہے نہ اس کی ضد یا نقیض یعنی "لَا يُؤْمِنُونَ" کا مضمون واجب ہے۔

اسی طرح تمہید نمبر (4) کی روشنی میں سوال نمبر (2) بھی حل ہو گیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بصارت و بصیرت کی راہوں کا مسدود کرنا اور آگے پیچھے دیواریں لگا کر کفر و شرک کے ماحول میں محبوس کرنے کا جو مسئلہ ہے یہ ان ہی کے اپنے اعمال و کسب کا فطری نتیجہ ہے جو عادات الہی کے عین مطابق

ان کے عمل و کسب پر مرتب ہو رہا ہے ورنہ یہ اگر اللہ کی دی ہوئی قوت فکری و عملی کی امانتوں کو بے مصرف استعمال نہ کرتے، کفر و شرک اور معصیت کاری کی راہ پر نہ چلتے تو یہ نتائج کبھی پیدا نہ ہوتے اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جہل مرکب میں مبتلا یہ طبقہ کفار، توحید و ایمان کے مد مقابل ماحول میں رہتے ہیں، ایمان کی ضد و نقیض جیسے عقائد و اعمال کے حامل ہونے میں اس معاشرہ کے دوسرے افراد کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں تو اس معاشرہ کا رنگ، اس کے مراسم و رواج اور عادات و اطوار سے جنم پانے والے اجتماعی تاثر ان کے لیے بمنزلہ حصار و چار دیواری کے ہو جاتا ہے جس سے نکل کر ایمان کی روشنی کی طرف آنا انہیں ایسا مشکل لگتا ہے جیسے چار دیواری کے اندر محبوس شخص کا نکلنا۔ آگے پیچھے دیوار اوپر سے چھت کی بندش بننے کا یہ عمل بھی ان کے اپنے اختیار کی کسب و عمل کا فطری نتیجہ ہے، غیر فطری عقائد و عمل والوں کے رنگ میں رنگین ہونے اور ان کے ہم مشرب و ہم کردار ہونے کے اس قسم نتائج و لوازمات کو قرآن شریف کے اندر اللہ تعالیٰ نے کبھی اپنی طرف منسوب کر کے "وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا وَأَغْشَيْنَاهُمْ" (یس، 9) فرمایا، کبھی "خَسَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ" (البقرہ، 7) فرمایا، کبھی "مَنْ يَشَاءِ اللَّهُ يُضِلِّهِ" (الانعام، 39) فرمایا، اور کبھی "فَأَخِطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ" (الاحزاب، 19) جیسی مختلف شکلیں بیان فرمائیں جو سب کے سب ایمان کی ضد و نقیض کا ارتکاب کرنے والوں کے سوء اختیار اور ان کے اپنے کسب و عمل کے فطری نتائج و لوازم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بھی بندے کی بصارت و بصیرت کی راہ محدود کرنا نہیں چاہتا، کفر کے اندھیرے کو روشنی تصور کرنے کے جہل مرکب میں دیکھنا پسند نہیں کرتا اور کسی بھی انسان کے اچھے اعمال کو ضائع کرنا گوارا نہیں فرماتا۔ جیسے فرمایا:

"مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا" (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم ایمان لاؤ اور شکر گزار بنو تو تمہیں عذاب دے کر اللہ نے کیا

کرنا ہے جبکہ وہ شکر گزاروں کا قدردان، حق شناس ہے۔

یہ سب کچھ ان کے اپنے کسب بد اور سُوء اختیار کے فطری نتائج ہونے کی بنا پر ان کے خالق ہونے کے ناطے سے اپنی طرف منسوب کرنے کی طرح کبھی ان کے سبب و بنیاد بننے والے سُوء اختیار و کسب کی طرف بھی منسوب فرماتا ہے۔ جیسے فرمایا:

”كَالَّذِينَ زَانُوا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ (۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی بد انجامی کی یہ شکلیں باہر سے ہرگز نہیں آئیں بلکہ ان کا سُوء اختیار و کسب بدن کے دلوں پر رنگ بن گیا ہے۔

خلاصۃ الکلام:- جب تک انسان اپنی قوت فکری و عملی کی امانتوں کو منشاء مولیٰ جل جلالہ کے خلاف استعمال نہیں کرتا، اللہ کی دی ہوئی طاقت و جوہر اختیار کو بے مصرف استعمال کر کے اپنی بصارت و بصیرت کو ضائع کرنے کی راہ پر نہیں چلتا اور سُوء اختیار و کسب بد کو ان بد انجامیوں کے مرتب ہونے کے لیے بنیاد نہیں بناتا اس وقت تک یہ وجود میں نہیں آتے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سُوء اختیار و کسب بد کے بغیر پہلے سے ان رکاوٹوں کو اس کے لیے سد راہ بنانے کے بعد ایمان لانے اور عمل صالح کرنے کے ساتھ اسے مکلف کرے، اس تصور کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے، قرآن وحدیث میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس کی گنجائش ہو سکے۔ بلکہ اس قسم اشتباہات جتنے بھی ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بیگانگی اور قرآن فہمی سے محرومی کے نتائج ہیں۔ (اعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ)

تیسرے سوال کے جواب کو سمجھنا مسئلہ تقدیر کو سمجھنے پر موقوف ہے جو اس طرح ہے کہ مرتبہ ازل میں جبکہ ذات الہی کے سوا اور کچھ نہیں تھا اللہ تعالیٰ کو جملہ خلائق سے متعلق ایسا ہی علم تھا جیسے اب ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ازلی علم کے متعلقات و معلومات میں چاہے جتنی ہی تبدیلیاں آجائیں اس سے اُس وحدہ لا شریک کے علم میں فرق نہیں آتا بلکہ ازل وابد ایک جیسا باقی و دائم، ظاہر و باطن، اول و آخر اور سب کو

(۱) المطففين، 14۔

مبیط و لاتناہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ازلی و قدیم اور غیر متناہی علم کے متعلقات و معلومات کا ایک حصہ انسانوں کے جملہ حالات بھی ہیں یعنی اپنے اپنے ادوار تاریخ کے مطابق وجود میں آنے کے بعد جس نے جیسے ہونا تھا جو کچھ کرنا تھا اور اپنی قوت فکری و عملی کو جس مصرف میں بھی لگانا تھا وہ سب کے سب اللہ کے سامنے تھا وہ اُسے ایسا ہی مشاہدہ کر رہا تھا جیسے عملی زندگی میں آنے کے بعد اب کر رہا ہے۔ مرتبہ ازل میں جس کو جیسا جانا ویسے ارادہ و مشیت فرمائی اور جیسے ارادہ فرمایا ویسے ہی قضاء و قدر فرمائی اور جیسے قضاء و قدر ہو چکی ہے ویسے ہی عملی زندگی میں ہو رہا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ عملی زندگی تقدیر الہی کے خلاف نہیں ہو سکتی اور قضاء و قدر یعنی تقدیر الہی ارادہ الہی سے خلاف نہیں ہو سکتی اور ارادہ الہی علم الہی سے مختلف نہیں ہو سکتا، اور علم الہی اپنے معلوم سے مختلف نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ مرتبہ ازل میں اللہ تعالیٰ کو خلائق کے احوال کا علم نہ ہو ورنہ جہل ہوگا کیوں کہ علم و جہل آپس میں ضدین ہونے کی وجہ سے ایک کا عدم آپ ہی دوسرے کا ثبوت ہے جس کے بعد اُس کے ثبوت پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ جہل اللہ تعالیٰ پر مرتبہ ازل میں بھی ایسا ہی محال ہے جیسا اب محال ہے نتیجتاً عملی زندگی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب کچھ مرتبہ ازل کے حضور علمی کا ظہور ہے اگر وہ نہ ہوتا یہ بھی نہ ہوتا اسی طرح اگر یہ نہ ہوتا تو وہ کہاں سے ہوتا۔ وہ حضور علمی کے رتبہ ازل کے وجود میں اس کے وجود پر موقوف ہے جبکہ یہ عملی زندگی کے ظہور میں اُس کے وجود پر موقوف ہے۔ اسی طرح اگر وہ نہ ہوتا تو ان سے متعلق علم الہی ہمارے لیے قابل فہم نہ ہوتا کیوں کہ علم ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتا ہے جب متبوع نہیں تو پھر تابع کہاں سے آئے گا۔ اور علم الہی کے بغیر ارادہ الہی بھی ہمارے لیے قابل فہم نہ ہوتا کیوں کہ ارادہ علم کے تابع ہے جب متبوع نہیں تو پھر تابع کہاں سے آئے گا۔ اور ارادہ الہی کے بغیر تقدیر الہی کی فہم بھی ہمارے لیے ناممکن ہوتی کیوں کہ قضاء و قدر اور تقدیر الہی اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ کے قبیل سے ہیں اور فعل چاہے جس چیز کا بھی ہو اُس سے متعلق ارادہ کے تابع ہوتا ہے، مسبوق بالا ارادہ اور اُس کی فرع ہوتا ہے

جب اصل اور متبوع ہی نہیں ہے تو پھر اس کے فرع اور تابع کا وجود کیونکر قابل فہم ہو سکتا ہے جبکہ قرآن سنت کی زبان میں تقدیر الہی کے بغیر عملی زندگی کا تصور ہی نہیں ہے۔ جیسے فرمایا:

”إِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ“ (۱)

بالیقین ہم نے ہر چیز کو تقدیر کے مطابق پیدا کیا ہے۔

نیز فرمایا: ”وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ“ (۲)

یعنی انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سب تقدیر کی کتابوں میں موجود ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”کل شئی بقدر حتی العجز والکیس“ (۳)

یعنی ہر شے تقدیر الہی کے مطابق وجود میں آتی ہے یہاں تک کہ ناتواں کی ناتوانی اور توانا کی توانائی بھی۔

جہاں تک ان پانچوں کی ترتیب ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

خلائق کا حضور علمی کے طور پر مرتبہ ازل میں اللہ تعالیٰ کے حضور موجود ہونا۔

اللہ تعالیٰ کے علمی ازلی کا ان کے مطابق ہونا۔

ارادۃ الہی کا علم الہی کے مطابق ہونا۔

تقدیر الہی کا ارادۃ الہی کے مطابق ہونا۔

خلائق کی عملی زندگی کا تقدیر الہی کے تابع اور اس کے مطابق ہونا کہ ہر موخر الذکر اپنے سے

سابق کے بغیر ناقابل فہم ہے۔ یہ مقتضائے عقل ہونے کے ساتھ درایت و روایتاً ثابت ہے نہ صرف

اتنا بلکہ قرآن و سنت میں جہاں کہیں بھی تقدیر الہی سے متعلق کچھ آیا ہے اُن تمام مقامات پر

(۱) القمر، 49۔ (۲) القمر، 52 تا 53۔

(۳) مشکوٰۃ شریف، بروایت عبد اللہ ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) بحوالہ صحیح مسلم شریف۔

فطرت کے یہی اصول کار فرما ہیں جس کے لیے قرآن شریف میں متعدد آیات مقدمہ موجود ہیں۔ مثلاً:

”وَمَا تَشَاءُ وُنْ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا“ (۱)

یعنی تم کیا چاہو مگر یہ کہ اللہ چاہے بے شک وہ علم و حکمت والا ہے۔

وہ کون سا اہل علم ہو سکتا ہے جو اس راز کو نہیں جانتا کہ یہاں پر آیت کریمہ کے ابتدائی حصہ ”وَمَا تَشَاءُ وُنْ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ میں انسانوں کی عملی زندگی کے جملہ کاموں اور اُن کے تمام ارادوں کو

مشیت الہی کے تابع بتایا گیا ہے کہ اُس کے بغیر عملی زندگی کا کوئی عمل وجود میں آ سکتا ہے نہ کوئی ارادہ۔

جبکہ آخری حصہ یعنی ”إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا“ میں اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کو ان سب کے لیے

اصل الاصول بتایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم جیسے اب ہے ویسے ہی مرتبہ ازل میں بھی تھا۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

”وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ“ (۲)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے عمل، تمہاری زندگی اور تمہارے ارادوں سے غافل نہیں ہے۔ جیسے اب

غافل نہیں ہے ویسے ہی مرتبہ ازل میں بھی غافل نہیں تھا۔

نیز فرمایا: ”وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرٌ إِلَّا سَمِعَهُمْ“ (۳)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان میں خیر و ایمان دیکھتا تو ضرور انہیں سماع قبول کی توفیق

دیتا لیکن جب وہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔

نیز فرمایا: ”وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا“ (۴)

یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان کے مشرک ہونے کا ارادہ نہ کرتا تو یہ مشرک نہ ہوتے لیکن وہ نہیں تو یہ بھی

(۱) الدھر، 30۔ (۲) البقرہ، 140۔

(۳) الانفال، 23۔ (۴) الانعام، 107۔

نہیں۔

تقدیر الہی کے حوالہ سے مذکورہ امور خمسہ کی یہ ترتیب ناقابل انکار حقیقت ہونے کی وجہ سے کل مکاتب فکر مفسرین سے لے کر متکلمین اسلام تک سب نے بیک آواز اس کے ساتھ تصریح کی ہیں۔ مشتبہ نمونہ از خروارے تفسیر روح المعانی میں ہے:

”فان فعل الله تعالى تابع لمشيئته النابعة لعلمه التابع للمعلوم والمعلوم من حيث ثبوته الازلي غير مجعول فتعلق العلم به على ما هو عليه في ثبوته الغير المجعول مما يقتضيه استعداد الازلي ثم الارادة تعلق بتخصيص ما سبق العلم به من مقتضا استعداد الازلي فأبرزته القدرة على الراداة“ (۱)

بیشک اللہ تعالیٰ کی صفت فعلی اُس کے ارادہ کے تابع ہے اُس کا ارادہ اُس کے علم کے تابع ہے اُس کا علم معلوم کے تابع ہے اور معلوم اپنے ثبوت ازلی کی حیثیت سے مجعول نہیں ہے تو علم الہی اُس کے ساتھ اُس کی ازلی استعداد کے مطابق اُس وقت متعلق ہوا کہ ابھی وہ مجعول نہیں ہوا تھا۔ علم الہی اُس کے ساتھ متعلق ہو جانے کے بعد ارادہ الہی نے اُس کی ازلی استعداد کے مطابق اُس کے ساتھ متعلق ہو کر اُس کی جانب وجود کو خاص کیا جس کے بعد قدرت الہی نے ارادہ الہی کے مطابق قضا و قدر کی شکل میں ظاہر کیا جس کے مطابق دنیا کی عملی زندگی جاری و ساری ہے۔

عقائد منشی مع شرح العقائد میں ہے:

”وَأَفْعَالُ الْعِبَادِ كُلُّهَا بِإِرَادَتِهِ وَمَشِيئَتِهِ تَعَالَى وَتَقْدِيرِهِ وَحُكْمِهِ وَقَضِيَّتِهِ“ (۲)

دُنیا کی عملی زندگی میں انسانوں سے جو افعال بھی صادر ہوتے ہیں یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے ارادہ

(۱) روح المعانی، ج 1، ص 131، مطبوعہ بیروت۔

(۲) شرح عقائد، ص 57، مطبوعہ سعید اینڈ سنز قرآن محل کراچی۔

ومشیت اور اُس کے حکم تکوینی اور اُس کی تقدیر کے مطابق وجود میں آرہے ہیں۔

تقدیر الہی، ارادہ الہی، علم الہی اور معلوم الہی کی مذکورہ ترتیب و تناسب کو سمجھنے کے بعد، نیز انسانوں کا اپنے تمام اختیاری اعمال کا کاسب ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر فطری نتائج مرتب ہونے جیسے عوائل پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے مذکورہ سوال کی کوئی حقیقت نہیں رہتی کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ آگے پیچھے حصاروں میں محصور ہونا اور ایمان کی راہ کا اُن پر مسدود ہونے کی اصل وجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی خبر ”لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا“ نہیں بلکہ اُن کا سوغ عمل ہے، کسب بد ہے اور بدا اختیار ہے جس کے بعد یہ تمام عوائل فطری نتائج قرار پاتے ہیں۔ (وَاللَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى أَعْلَمُ وَعِلْمُهُ اَتَمُّ)

وَأَنَا الْعَبْدُ الضَّعِيفُ

پیر محمد، الحجت الی مولدا ولبشاورى مسکنا والمسلم مذهباً والجشتى مشرباً

والحنفى مسلکاً

1/10/2007

☆☆☆☆☆

تقیہ کی شرعی حیثیت

سوال یہ ہے کہ سورۃ آل عمران، آیت 28 ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ سے شیعہ مذہب میں تقیہ کے واجب ہونے پر جو استدلال کیا جاتا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ شیعہ مذہب کے مطابق کسی دنیوی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے عقیدہ کو چھپا کر جھوٹ بولنے کو دین کا پھتورواں حصہ جو کہا جاتا ہے اور شیعہ علماء تقیہ کے ضروری ہونے پر قرآن شریف کی اس آیت کے علاوہ امام جعفر صادق کی روایت سے ایک حدیث کا بھی حوالہ دیتے ہیں ”لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ“ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص تقیہ نہیں کرتا اُس کا ایمان بھی درست نہیں ہے تو کیا ایسی کوئی حدیث ہے؟ اور کیا جھوٹ جیسے کبیرہ گناہ کو تقیہ کے نام سے ثواب جاننے والا کافر نہیں ہوگا؟

مہربانی کر کے اس آیت کریمہ کی تفسیروں کے مطابق تشریح شائع کر کے ثواب دارین حاصل کریں، کیا شیعہ کا نظریہ درست ہے؟

جواب کا منتظر..... قاری محمد انور بیگ خطیب سنہری مسجد صدر پشاور

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دنیا میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو مذکورہ آیت کریمہ سے کسی دنیوی مقصد کے حصول کی خاطر اپنا عقیدہ چھپا کر جھوٹ بولنے کو تقیہ کے طور پر ثواب سمجھتا ہو یا جھوٹ جیسے کبیرہ گناہ کو کسی دنیوی مقصد کی خاطر اختیار کرنے کو دین کا پھتورواں حصہ اور کارِ ثواب تصور کرتا ہو تو اُسے ہرگز سچا مسلمان نہیں سمجھا جاسکتا چاہے شیعہ ہو یا سنی، مقلد ہو یا اہل حدیث۔ جہاں تک دستیاب تفاسیر کی روشنی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر پیش کرنے کا سوال ہے تو اس کے متعلق بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کے ابتدائی حصہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ“ (۱)

یعنی اہل ایمان محلِ محبت (مسلمانوں) کو چھوڑ کر غیر مسلموں کے ساتھ محبت نہ کریں اور جس نے بھی اس حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ اللہ کی محبت کا قطعاً اہل نہیں رہا۔

آیت کریمہ کے اس حصہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلموں کے ساتھ قلبی محبت کرنے کی قطعی حرمت معلوم ہوئی جس کے بعد والے حصے میں یعنی ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ میں مخصوص حالات کے تحت غیر مسلموں کے ساتھ محض ظاہری طور پر اظہارِ محبت کرنے کی اجازت دی گئی ہے جسے خصوصیت مسلک سے قطع نظر جملہ اہل اسلام کے مفسرین کرام نے تقیہ کے نام سے موسوم کیا ہے کیوں کہ تقاۃً وتقیہ یہ دونوں الفاظ کسی نقصان کے خوف سے بچنے کے معنی میں مصدر ہیں اور قرآن شریف کی اس آیت کریمہ میں دو طرح کی قرائتیں موجود ہیں بعض قراء نے تقاۃً پڑھا ہے جبکہ بعض نے تقیۃً پڑھا ہے جیسے جملہ مکاتب فکر کی کتب تفاسیر کے اس مقام پر ان دونوں کا حوالہ لکھا ہوا موجود ہے اور شرعی تقیہ کے جواز و اصطلاح کے لیے بھی مفسرین کرام نے یکساں طور پر اسی آیت کریمہ کو بنیاد بنایا ہے جس کی تائید سورۃ نحل، آیت نمبر 106 سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ“

یعنی ظالم کے ہاتھوں مجبور مسلمان کو ایمان کے ساتھ قلبی اطمینان کے ہوتے ہوئے ایمان کے منافی کسی کردار کی ادائیگی کی اجازت ہے۔

اسلامی تقیہ کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ کسی مذہبی یا جانی و مالی بڑے نقصان کے یقینی خوف کے وقت اپنے عقیدہ و ضمیر کے خلاف کسی قول و عمل کو اختیار کیا جائے۔ تقیہ کی اس تعریف اور اس آیت کریمہ سے اس کے شرعی جواز اور اس کے اسلامی حکم ہونے میں قطعاً کسی کو بھی اختلاف نہیں

(۱) آل عمران، 28۔

ہے۔ جیسے تفسیر روح المعانی میں اس آیت کریمہ کے تحت لکھا ہے؛

”وَفِي الْآيَةِ دَلِيلٌ عَلَى مَشْرُوعِيَّةِ التَّقِيَّةِ وَعَرَفُوهَا بِمُحَافَظَةِ النَّفْسِ أَوْ الْعَرَضِ أَوِ الْمَالِ مِنْ شَرِّ الْأَعْدَاءِ وَالْعَدُوِّ قِسْمَانِ الْأَوَّلُ مَنْ كَانَتْ عِدَاوَتُهُ مُبَيَّنَةً عَلَى اخْتِلَافِ الَّذِينَ كَالْكَافِرِ وَالْمُسْلِمِ وَالثَّانِي مَنْ كَانَتْ عِدَاوَتُهُ مُبَيَّنَةً عَلَى أَغْرَاضٍ ذُنُوبِيَّةٍ كَالْمَالِ وَالْمَتَاعِ وَالْمُلْكِ وَالْأَمَارَةِ وَمِنْ هُنَا صَارَتْ التَّقِيَّةُ قِسْمَيْنِ“ (۱)

یعنی اس آیت کریمہ میں تقیہ کے جائز ہونے اور اس کے اسلامی حکم ہونے پر دلیل ہے اور اہل شرع نے اس کی تعریف کی ہے کہ اپنی جان و مال، عزت و آبرو و دشمنوں کے شر سے بچانے کا عمل کرنا ہے اور جس دشمن کے شر سے بچنے کے لیے یہ عمل کیا جاتا ہے وہ دو قسم کے ہیں؛

اول جس کی دشمنی مذہبی اختلاف کی بنا پر ہو جیسے مسلم و غیر مسلم کے مابین ہوتا ہے۔

دوسری جس کی دشمنی دنیوی اغراض کی بنا پر ہو جیسے مال و متاع اور بادشاہی و اقتدار کے لالچ میں ہوتا ہے اور یہاں سے تقیہ کی بھی دو قسمیں ہوئیں۔

صاحب روح المعانی سید محمود بغدادی الوسی الحنفی کی طرح ایک اور حنفی المذہب مفسر ابوالبرکات النسی الحنفی نے اپنی تفسیر ”مدارک التنزیل“ میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”إِلَّا أَنْ تَخَافُوا مِنْ جَهَنَّمَ أَمْرًا يَجِبُ اتِّقَائُهُ، أَيْ إِلَّا أَنْ يَكُونَ لِلْكَافِرِ عَلَيْكَ سُلْطَانٌ فَتَخَافُهُ عَلَى نَفْسِكَ وَمَالِكَ فَحِينَئِذٍ يَجُوزُ لَكَ إِظْهَارُ الْمَوَالَاةِ وَ

إِبْطَانِ الْمَعَادَاةِ“ (۲)

یعنی تقیہ اُس وقت جائز ہے جب تم اُن کی طرف سے کسی ایسی بات کا خوف کرو جس سے بچنا

(۱) تفسیر روح المعانی، ج ۳، ص ۱۲۱، مطبوعہ بیروت۔

(۲) تفسیر مدارک التنزیل، ج ۱، ص ۲۰۸، مطبوعہ مکتبہ علمیہ لاہور۔

واجب ہو مثال کے طور پر کسی کافر کو تیرے خلاف طاقت ہو جس کی وجہ سے تو اپنی جان و مال کے خلاف اُس کا خوف کرتا ہے تو ایسے حالات میں دل میں دشمنی رکھتے ہوئے بظاہر اُس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرنا جائز ہے۔

شیخ زادہ علی البیہاوی نے لکھا ہے؛

”وَهَذَا رُخْصَةٌ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى حَتَّى لَوْ ثَبَتَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا وَقُتِلَ كَانَ أَجْرُهُ عَظِيمًا“ (۱)

یعنی تقیہ کا جواز رخصت کے درجہ میں ہے کہ تقیہ کرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا ورنہ ظالم کے ہاتھوں مجبور شخص اگر ظاہر و باطن میں یکساں ہو کر ظالم کے ہاتھ سے قتل ہو جائے تو اُسے عند اللہ بڑا اجر ملتا ہے۔

امام ابوبکر الحصاص الحنفی نے لکھا ہے؛

”وَإِعْطَاءُ التَّقِيَّةِ فِي مِثْلِ ذَلِكَ إِنَّمَا هُوَ رُخْصَةٌ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى وَلَيْسَ بِوَاجِبٍ“ (۲)

یعنی کسی مذہبی یا دنیوی دشمن کے ضرر سے بچنے کے لیے تقیہ پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے، واجب نہیں ہے۔

مفسرین مالکیہ میں امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں تقیہ کا جواز بتانے کے بعد حضرت امام حسن بصری کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَقَالَ الْحَسَنُ: التَّقِيَّةُ جَائِزَةٌ لِلْمُؤْمِنِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ إِلَّا أَنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَيْسَ يَجْعَلُ فِي الْقَتْلِ تَقِيَّةً“

یعنی حضرت حسن بصری نے فرمایا ہے کہ مومن مسلمان کے لیے تقیہ کے حکم پر عمل کرنا قیامت

(۱) تفسیر صاوی علی الجلالین، ج ۱، ص ۱۳۲، مطبوعہ فیصل آباد۔

(۲) تفسیر احکام القرآن لابن بکر الحصاص، ج ۱، ص ۲۹۰، مطبوعہ بیروت۔

تک جائز ہے مگر یہ کہ کسی بے گناہ قتل کرنے جیسے امور کا تقیہ کے ذریعے ارتکاب کرنے کو اللہ تعالیٰ نے جائز نہیں رکھا ہے۔

الصاوی علی الجلالین میں امام شیخ احمد الصاوی المالکی نے اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَلَا لِعَرَضٍ مِنَ الْأَعْرَاضِ إِلَّا لِلتَّقِيَّةِ ظَاهِرًا بِحَيْثُ يَكُونُ مَوْلَاهُ فِي الظَّاهِرِ وَ مُعَادِيَّةٍ فِي الْبَاطِنِ“ (۱)

یعنی اپنے عقیدہ و نظریہ کے خلاف قول و عمل کو اختیار کرنا کسی بھی غرض کے لیے جائز نہیں ہے مگر تقیہ کی غرض سے جائز ہے کہ ظاہری طور پر اس کا دوست بنے درحقیقت دل میں دشمن۔

شیخ سلیمان الجمل الشافعی نے اپنی تفسیر ”الفتوحات الالہیہ“ میں مذکورہ آیت کریمہ کے تحت تقیہ کے جواز اور اس کے شرعی حکم ہونے پر آیت کریمہ سے استدلال کرنے کے بعد لکھا ہے:

”ثُمَّ هَذِهِ التَّقِيَّةُ رُخْصَةٌ فَلَوْ صَبَرَ عَلَى إِظْهَارِ إِيمَانِهِ حَتَّى قُتِلَ كَانَ لَهُ بِذَلِكَ أَجْرٌ عَظِيمٌ“ (۲)

یعنی تقیہ کا اسلامی حکم ہونا معلوم ہونے کے بعد یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اس کا جواز رخصت کے درجہ میں ہے لہذا اگر کسی غیر مسلم کے ہاتھوں کفر پر مجبور کیے جانے والا مسلمان تقیہ کے حکم پر عمل کیے بغیر اپنے ایمان کے اظہار پر ہی ڈٹ کر قتل ہو جائے تو اس کے لیے اجر عظیم ہوگا۔

حضرت امام نووی الشافعی رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے اپنی ”تفسیر مراح لبید“ میں اس آیت کریمہ سے تقیہ کے جواز اور اس کا شرعی حکم ہونے پر استدلال بیان کرنے کے بعد حضرت امام الحسن البصری رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”رَوَى عَنِ الْحَسَنِ أَنَّهُ قَالَ ”التَّقِيَّةُ جَائِزَةٌ لِلْمُؤْمِنِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لِأَنَّهُ دَفَعَ

(۱) شیخ زادہ علی البیضاوی، ج ۱، ص 617، مطبوعہ بیروت۔

(۲) تفسیر الفتوحات الالہیہ، ج 2، ص 258، مطبوعہ بیروت۔

الضَّرَرِ عَنِ النَّفْسِ وَاجِبٌ بِقَدْرِ الْإِمْكَانِ قَالَ الْحَسَنُ أَخَذَ مُسْلِمَةُ الْكَذَّابُ رَجُلَيْنِ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِأَحَدِهِمَا أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ قَالَ نَعَمْ نَعَمْ نَعَمْ، فَقَالَ أَتَشْهَدُ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ قَالَ نَعَمْ فَتَرَكَهُ وَدَعَا الْآخَرَ فَقَالَ أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ قَالَ نَعَمْ، فَقَالَ أَتَشْهَدُ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ فَقَالَ إِنِّي أَصَمُّ ثَلَاثًا فَقَدَّمَهُ وَقَتْلَهُ فَبَلَغَ ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَمَّا هَذَا الْمَقْتُولُ فَمَضَى عَلَى يَقِينِهِ وَصَدَّقَهُ فَهَيِّئْ لَهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَقَبِلَ رُخْصَةَ اللَّهِ فَلَا تَبِعَةَ عَلَيْهِ“ (۱)

یعنی حضرت امام حسن بصری سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ اہل ایمان کے لیے قیامت تک تقیہ کے حکم پر عمل کرنا جائز ہے کیوں کہ اپنی جان سے ظالم کا ضرر دفع کرنا حتی المقدور واجب ہے۔ حسن بصری نے کہا کہ میلہ الکذاب نے رسول اللہ کے دو صحابہ کو پکڑ کر ایک سے پوچھا کہ کیا تو محمد (ﷺ) کی رسالت پر شہادت دیتا ہے تو اس نے جواب میں تین بار ”ہاں“ کہا، پھر اس نے اپنے متعلق پوچھا کہ کیا تو میری رسالت کی شہادت دیتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں، تو اسے زندہ چھوڑ کر دوسرے سے بھی اسی طرح پوچھا لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دینے کے ساتھ میلہ الکذاب کی رسالت کی شہادت دینا درکنار اس کے متعلق سننے سے بھی اپنے آپ کو بہرہ بتایا تو اس ظالم نے اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کی جب نبی اکرم رحمت عالم کو خبر ہوئی، آپ نے فرمایا کہ جس نے موت کو ظاہری کفر پر ترجیح دی وہ اپنے ایمان و یقین کے ساتھ شہید ہو کر خوشگوار مقام پا گیا اور جس نے ایمان کے ساتھ قلبی اطمینان کے ہوتے ہوئے تقیہ پر عمل کیا اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ رخصت پر عمل کیا اس لیے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

(۱) تفسیر مراح لبید، ج 1، ص 94، مطبوعہ بیروت۔

امام واحدی الشافعی نے بھی اپنی تفسیر (الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز) میں مذکورہ آیت کریمہ سے تقیہ کے جواز پر استدلال کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

”قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يُؤَيِّدُ مُدَاوَاةَ ظَاهِرَةٍ“ (۱)

یعنی تقیہ کا مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے ہاتھوں مجبور ہونے والا شخص اپنے عقیدہ و ضمیر کے خلاف اُن کے ساتھ ظاہری مدارا کرے۔

شیخ ابوالحسن الکیا الہرامی الشافعی نے اس آیت کریمہ سے تقیہ کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

”يُذَلُّ عَلَى أَنْ يُظَاهَرَ الْمُؤَافَقَةَ فِي الْإِعْتِقَادِ وَغَيْرِهِ جَائِزٌ لِلتَّقِيَّةِ“ (۲)

یعنی یہ آیت کریمہ مخصوص حالات میں مخالفین کے ساتھ اُن کے عقیدہ وغیرہ مذہبی شعائر میں تقیہ کے طور پر موافقت کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

محدث ابن جوزی الحنبلی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ سے تقیہ کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَإِذَا ثَبَتَ جَوَازُ التَّقِيَّةِ فَلَا فَضْلَ إِلَّا يَفْعَلْ نَصٌّ عَلَيْهِ أَحْمَدُ“ (۳)

یعنی جب اس آیت کریمہ سے تقیہ کا جواز ثابت ہوتا ہے تو پھر بھی بہتر ہے کہ اس رخصت پر عمل نہ کیا جائے، امام احمد بن حنبل نے اسی طرح کہا ہے۔

اہل حدیث مفسر امام شوکانی نے اپنی تفسیر (فتح القدیر) میں لکھا ہے:

”وَيُذَلُّ عَلَى جَوَازِ التَّقِيَّةِ قَوْلُهُ تَعَالَى إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ“ (۴)

(۱) الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز علیٰ ہامش مراجع لبید، ج ۱، ص ۹۴۔

(۲) احکام القرآن للکیا الہرامی الشافعی، ج ۱، ص ۲۸۵، مطبوعہ بیروت۔

(۳) تفسیر زاد المسیر، ج ۴، ص ۳۶۲، مطبوعہ بیروت۔

(۴) تفسیر فتح القدیر، ج ۱، ص ۳۳۲، مطبوعہ بیروت۔

یعنی تقیہ کے جواز پر اللہ تعالیٰ کا فرمان جو ”سورۃ النحل، آیت ۱۰۶“ میں ہے، دلالت کر رہا ہے۔

حضرت امام نظام الدین النیشاپوری نے اپنی تفسیر ”غرائب القرآن و رغائب الفرقان“ میں اس آیت کریمہ سے تقیہ کے جواز اور مخصوص حالات کے لیے اُس کے شرعی حکم ہونے پر استدلال کرنے کے بعد (وَلِلتَّقِيَّةِ عِنْدَ الْعُلَمَاءِ أَحْكَامٌ) کے عنوان کے تحت متعدد احکام بیان کیے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تقیہ کبھی مذہبی مسائل میں کیا جاتا ہے اور کبھی کفار کے ساتھ اظہارِ محبت کرنے کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے لیکن کسی اور کو ضرر پہنچانے کے لیے تقیہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں:

”وَقَدْ يَجُوزُ أَنْ تَكُونَ إِضَافِيَةً تَعْلُقُ بِإِظْهَارِ الدِّينِ فَأَمَّا الَّذِي يَرْجِعُ ضَرَرُهُ إِلَى

الْغَيْبِ كَالْقَتْلِ وَالزِّنَاوِ غَضَبِ الْأَمْوَالِ وَشَهَادَةِ الزُّورِ وَقَذْفِ الْمُحْصَنَاتِ

وَإِطْلَاعِ الْكُفَّارِ عَلَى عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِينَ فَذَلِكَ غَيْرُ جَائِزٍ الْبَتَّةُ“

یعنی تقیہ کبھی دینی مسائل کے اظہار کے متعلق کرنا جائز ہوتا ہے اور جس تقیہ سے کسی اور کو ضرر پہنچتا ہو جیسے کسی کو قتل کرنا اور زنا کرنا، لوگوں کے اموال کو غصب کرنا، جھوٹی گواہی دینا، پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا اور کافروں کو مسلمانوں کے رازوں پر مطلع کرنے جیسے کاموں میں بالیقین ناجائز ہے۔

اس کے بعد تقیہ کے مزید احکام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَمِنْهَا أَنْ الشَّافِعِيُّ جَوَّزَ التَّقِيَّةَ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ“

یعنی حضرت امام شافعی کا مسلمانوں کے مابین تقیہ کو جائز قرار دینا بھی فی الجملہ تقیہ کے احکام میں شمار ہے۔

اس کے بعد تقیہ کے مزید احکام کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

”وَمِنْهَا أَنَّهَا جَائِزَةٌ لِّصَوْنِ الْمَالِ عَلَى الْأَصَحِّ“

یعنی زیادہ صحیح مذہب کے مطابق مال کو ظالموں سے بچانے کی خاطر تقیہ کا جائز ہونا بھی اُس کے احکام میں سے ہے۔

یہاں پر ”عَلَى الْأَصَحِّ“ کہہ کر اہل سنت فقہاء کے اُس اختلاف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو مسلم حکومت کے خزانے کو یا اپنے کسی ذاتی مال کو ظالم کی طرف سے خطرہ لاحق ہونے کی صورت میں اُسے بچانے کے لیے تقیہ کی شرعی رخصت پر عمل کرنے کے جواز و عدم جواز کی بابت متعدد کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد آخر میں حضرت حسن بصری کا قول نقل کر کے آئمہ اہل سنت کے نزدیک اسی کے مطابق عمل ہونے کے ساتھ تصریح کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَرَوَى عَوْفُ عَنِ الْحَسَنِ أَنَّهُ قَالَ: التَّقِيَّةُ جَائِزَةٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ وَهَذَا أَرْجَحُ عِنْدَ الْأَئِمَّةِ“

یعنی حضرت عوف نے حسن بصری سے روایت کی ہے کہ انہوں نے قیامت تک تقیہ کے جواز اور بطور حکم شرعی اُس کے قائم رہنے کا قول کیا ہے اور آئمہ اہلسنت کے نزدیک زیادہ راجح بھی یہی ہے۔

بطور مشتمل نمونہ از خروارے، ودانے از انبارے اہل سنت آئمہ و مفسرین کے ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد فقہ جعفریہ کے آئمہ تفسیر کو بھی ملاحظہ کیا جائے۔ الفیض الکاشانی نے ”کتاب الصافی فی تفسیر القرآن“ میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”مَنْعٌ مِنْ مَوَالِيهِمْ ظَاهِرٌ أَوْ بَاطِنٌ فِي الْأَوْقَاتِ كُلِّهَا الْأَوْقَاتِ الْمُخَافَةِ فَإِنَّ أَظْهَارَ الْمَوَالِي جَائِزٌ بِالْمُخَافَةِ“ (۱)

یعنی اس آیت کریمہ میں غیر مسلموں کے ساتھ ظاہر و باطن ہر طرح کی موالیات کرنے سے ہر

(۱) کتاب الصافی فی تفسیر القرآن، الفیض الکاشانی، ج ۱، ص ۲۵۳، مطبوعہ طہران۔

وقت منع کیا گیا ہے مگر ان کی طرف سے خوف لاحق ہونے کے وقت ایسا نہیں ہے بلکہ بوقت خوف دل میں مخالفت رکھتے ہوئے محض ظاہری طور پر موالاة کا اظہار کرنا جائز ہے۔

سید محمد حسین الطباطبائی نے المیزان فی تفسیر القرآن میں ائمہ اہل سنت کے عین مطابق اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَفِي الْآيَةِ دَلَالَةٌ ظَاهِرَةٌ عَلَى الرُّخْصَةِ فِي التَّقِيَّةِ عَلَى مَا رَوَى عَنْ أَيْمَةِ أَهْلِ الْبَيْتِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ كَمَا تَدُلُّ عَلَيْهِ الْآيَةُ النَّازِلَةُ فِي قِصَّةِ عَمَّارٍ وَأَبُوهِ يَاسِرٍ وَ سُمِّيَةِ وَهِيَ قَوْلُهُ تَعَالَى ”مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ (النحل، ۱۰۶) وَبِالْجُمْلَةِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ مُتَطَابِقَانِ فِي جَوَازِ هَذِهِ الْجُمْلَةِ“ (۱)

یعنی آئمہ اہل بیت نبوت کی روایات کے مطابق اس آیت کریمہ میں تقیہ کا جواز اور اُس کے رخصت فی الاسلام ہونے پر واضح دلالت ہے جیسے اُس کے جواز پر حضرت عمار اور اُن کے والدین (حضرت یاسر و سُمیہ) کے واقعہ میں نازل ہونے والی آیت کریمہ جو سورۃ النحل کی آیت ۱۰۶ ہے دلالت کر رہی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ کتاب و سنت تقیہ کا فی الجملہ جائز ہونے پر دلالت کرنے میں ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔

کل مکاتب فکر مفسرین کی ان تصریحات و تقاسیر کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن شریف کی مذکورہ آیت کریمہ سے تقیہ کے جواز پر استدلال کرنا اور مخصوص حالات میں بطور رخصت فی الاسلام اُس پر عمل کرنا خصوصیت مسلک سے قطع نظر جملہ مکاتب فکر اہل اسلام کا مشترکہ عقیدہ ہے جس میں شیعہ سنی کا قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ لہذا تقیہ کا جواز شیعہ کے ساتھ خاص سمجھنا حقیقت سے خلاف ہے۔ جو غلط مشہور ہوا ہے اور افہام و تفہیم کی غرض سے باہم مذاکرات نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

(۱) المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۳، ص ۱۵۳، مطبوعہ طہران۔

اس کے علاوہ ان تصریحات کی روشنی میں تقیہ کے حوالہ سے کل مکاتب فکر اہل اسلام کے مابین کچھ اجماعی اور کچھ اختلافی مسائل کی بھی نشان دہی ہو رہی ہے۔ جن مسائل پر اجماع معلوم ہو رہا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

مخصوص حالات میں تقیہ کا جواز جملہ اہل اسلام کے مابین حقیقہ ہے یعنی اس حوالہ سے سنی شیعہ کا کوئی فرق ہے نہ حنفی وشافعی کا، جنبلی و مالکی کا کوئی جھگڑا ہے نہ اہل حدیث و اہل تقلید کا کوئی تنازعہ بلکہ اس کے جواز پر سب کے سب متفق ہیں اگر مدعیان اسلام میں کوئی اسے ناجائز سمجھنے والے ہیں تو وہ صرف اور صرف فرقہ خوارج ہیں جو اپنے مخصوص عقائد کے سوا تمام امت کو کافر کہتے ہیں۔ (اعاذنا اللہ منہم)

سب کے سب اسے رخصت سمجھتے ہیں عزیمت نہیں یعنی سنی مذہب میں اسے عزیمت سمجھا جاتا ہے نہ شیعہ میں بلکہ سب کا اس کے بطور رخصت جائز ہونے پر اتفاق ہے مگر یہ کہ استعمار نے تفریق کے حجم کو وسیع کیا کسی جگہ شیعہ استعمار نے ظلم کیا تو کسی تاریخ میں سنی استعمار نے کام دکھایا انجام کار اصل مسئلہ متروک تحقیق رہ گیا جبکہ طرفین سے مذہبی استعمار کے منفی پروپیگنڈا نے ضرورت مذہبی کا حصار قائم کیا اس کے زندان سے کون نکلے اللہ تعالیٰ سب کو حقائق کی روشنی میں مسائل کو سمجھنے کی توفیق دے (آمین)۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یوم النشور اللہ تعالیٰ کے حضور مناظر اہل سنت کے نام سے تعصب پھیلانے والوں کو کچھ ہاتھ آئیگا نہ مناظر اہل بیت کے نام سے جھوٹ پھیلانے والوں کو۔ وہیں پر حسب الارشاد ”الامن اتی اللہ بقلب سلیم“ کے اخلاص کے سوا اور کچھ کام نہیں آئے گا جس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ شرعی مسائل کو فرقہ داریت کے تعصب سے بالاتر رہ کر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے اور حق نہ چھپایا جائے۔

کسی اور کو نقصان پہنچانے کے لیے تقیہ کرنے کے ناجائز ہونے پر سب کا اجماع ہے یعنی

مسلمانوں میں کوئی ایسا فرقہ موجود نہیں ہے جو کسی اور کی جان و مال یا عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے کے لیے تقیہ کرنے کو جائز سمجھتا ہو۔

مالی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے تقیہ کرنے کو ناجائز سمجھنا بھی تمام مکاتب اہل اسلام کے مابین اجماعی مسئلہ ہے یعنی کسی سنی مذہب میں دنیوی مفادات کے حصول کی خاطر تقیہ کرنے کو جائز سمجھا جاتا ہے نہ شیعہ مذہب میں بلکہ دونوں فریق اس کی حرمت و ناجائز ہونے پر متفق ہیں۔ قرآن شریف کی سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28..... سورۃ النحل، آیت نمبر 106 سے تقیہ کے جواز پر استدلال کرنے کی طرح حضرت عثمان ابن یاسر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے واقعہ اور سبیلۃ الکذاب کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے دو صحابہ کرام کے واقعہ جیسی احادیث طیبہ سے بھی اس کے جواز پر استدلال کرنا شیعہ سنی ائمہ حدیث و مفسرین کرام کے مابین امر مشترک ہے یعنی دونوں فرقوں کی ذمہ دار شخصیات نے مذکورہ آیات سے جواز تقیہ پر جس طرح استدلال کیا ہے۔

اسی طرح احادیث نبوی ﷺ سے بھی اس کے جواز پر استدلال کیا ہے کل مکاتب فکر مفسرین کرام کی ان تصریحات سے جہاں ان مشترکات و حقیقتات کا پتہ چلتا ہے وہاں کچھ اختلافات کا بھی علم ہو رہا ہے جن میں:

اول: تقیہ کا جواز در رخصت کافروں کے ہاتھوں مجبور ہونے کی صورتوں کے ساتھ خاص ہے یا مسلم ظالموں کے ہاتھوں مجبور ہونے والوں کو بھی شامل ہے۔

دوم: آیا صرف جان و آبرو کو بچانے کی صورتوں کے ساتھ خاص ہے یا مال کے تحفظ کے لیے بھی جائز ہے۔

سوم: آیا جان و مال جیسے دنیوی خطرہ سے بچنے کی صورتوں کے ساتھ خاص ہے یا مذہبی نقصان سے بچنے کی صورتوں کو بھی شامل ہے۔

واضح رہے کہ یہ تینوں اختلافات صرف اہل سنت ائمہ کے مابین پائے جاتے ہیں جبکہ شیعہ مذہب میں اس حوالہ سے قطعاً کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ مفسرین کرام کی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں اہل اسلام کے مابین تقیہ کے حوالہ سے اجماعیات اور اختلافیات کے خانے ایک دوسرے سے جدا جدا معلوم ہو جانے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقیہ کے حوالہ سے اہل سنت اور شیعہ کے مابین جتنا اتفاق ہے اتنا اختلاف نہیں ہے لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہونے والے اس حکم کو آج کل فقہ جعفریہ کے ساتھ خاص کہہ کر اہل سنت کہلانے والے ہمارے حضرات اپنے ہی اسلاف کی تصریحات کے خلاف کر رہے ہیں، اسلام کے اس مشفقہ حکم سے انکار کر رہے ہیں اور تقیہ کی حقیقت پر خود عمل پیرا ہونے کے باوجود انجانے میں یا شیعہ کی مخالفت میں تقیہ کے لفظ سے الہجہ ہو رہے ہیں۔ میں حیران ہوں اسے کیا کہوں؟ جہالت، خود ساختہ مذہب یا عصبیت کی اندھیر نگری؟

کل مکاتب فکر مفسرین کرام کی ان تصریحات سے ”تقیہ کی شرعی حیثیت“ کہ مخصوص حالات میں رخصت ہونا بلا تخصیص مسلک کل اہل اسلام کے مابین مشترکہ عقیدہ اور سب کے نزدیک معمول بہ ہے، معلوم ہونے کے بعد سوالنامہ میں مذکور باقی سوالات کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جاتی ہے کیوں کہ مذکورہ آیات سے تقیہ کا واجب ہونے پر استدلال کرنے کو شیعہ مفسرین کی طرف نسبت کرنا جب خلاف حقیقت ہے، اُن کی تصریحات کے خلاف ہے اور بہتان محض ہے تو پھر اُس پر متفرع ہونے والی مذکورہ روایات کو وجہ کفر بنانے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی بھی مذہب کی کتب احادیث میں موجود ہر روایت کا درست ہونا بھی ضروری نہیں ہے جیسے اہل سنت کتب احادیث میں سینکڑوں روایات حدیث ایسی موجود ہیں جن پر کسی نے عمل کیا نہ اُن کے مطابق عقیدہ کیا ہے۔ اسی طرح شیعہ کتب میں بھی بیشمار روایات ایسی پائی جاسکتی ہیں جن پر عمل کرنا یا انہیں مذہب بنانا فقہ جعفریہ کے لیے بھی ضروری نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی فریق کے اسلاف نے اس قسم کی روایات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کی کبھی تکفیر نہیں کی ہے۔ شیعہ سنی کے مابین یا فقہ اہل سنت اور فقہ جعفریہ کے مابین

سینکڑوں مسائل میں فقہی اختلافات موجود ہوتے ہوئے بھی مذکورہ فی السوال روایات کو فقہ حنفی میں کسی نے وجہ کفر بتایا ہے نہ فقہ شافعی میں، فقہ مالکی میں نہ فقہ حنبلی میں، کسی اہل حدیث نے انہیں وجہ کفر کہا ہے نہ کسی اہل تقلید نے۔ ایسے میں اپنے مذہبی مخالف کی تکفیر کے لیے اس قسم کی روایات کا سہارا لینا حق پرستی کے منافی اور حق گوئی کے ساتھ متصادم بھونڈی حرکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ اسلامی روایات کے مطابق بلا تفریق مسلک کسی بھی مسلمان کہلانے والے کو کافر قرار دینے کے لیے کسی ضرورت دینی کا صریح انکار یا اُس کے صراحاً منافی قول و عمل کا پایا جانا شرعی معیار ہے، جس کو جملہ مکاتب فکر اہل اسلام کے نزدیک التزام کفر کہا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل فتاویٰ رضویہ، جلد 6، صفحہ 266، مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی میں موجود ہے۔

فَوَاتِحُ الرَّحْمَتِ شَرْحُ مُسْلِمِ الثَّبُوتِ مِثْلُ هُوَ؛

”وَالْتِزَامُ الْكُفْرِ كُفْرٌ ذُو نُلُوعٍ“ (۱)

یعنی صراحاً کسی ضرورت دینی کا انکار کرنا کفر ہے جس کے بغیر کسی ایسے کردار سے کوئی کافر نہیں ہوتا جو مفسی الی الکفر ہو یا کثیر احتمالات کفر کے باوجود درست محمل پر حمل کیے جانے کا کوئی احتمال موجود ہو۔

اس اصول مسلمہ کی روشنی میں مذکورہ فی السوال دونوں روایتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک بھی وجہ کفر نہیں بن سکتی جسے بنیاد بنا کر تقیہ کرنے والوں کو کافر قرار دیا جاسکے۔ پہلی روایت یعنی (لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا نَفْيَةَ لَهُ) کا مذہبی تعصب سے اپنے ذہن کو پاک رکھ کر تجزیہ کر نیوالا ہر منصف مزاج یہ معنی لے سکتا ہے کہ جو شخص مخصوص حالات میں تقیہ کا جائز اور رخصت ہونے پر یقین نہیں رکھتا تو وہ صحیح معنی میں مومن نہیں ہو سکتا کیوں کہ شریعت کی زبان میں ایمان کا معنی ہے (هُوَ التَّصَدُّيقُ بِجَمِيعِ مَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ) یعنی رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے جملہ احکام کی

(۱) فَوَاتِحُ الرَّحْمَتِ شَرْحُ مُسْلِمِ الثَّبُوتِ، ج 2، ص 244، مطبوعہ بیروت۔

حقانیت پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے تو ظاہر ہے کہ سورۃ آل عمران آیت 28 اور سورۃ نحل آیت 106، کی کل مکاتب فکر مفسرین کی مذکورہ تصریحات کے مطابق تقیہ کا رخصت فی الاسلام ہونا بھی جملہ احکام میں شامل ہے جس کے اسلامی حکم ہونے پر یقین کیے بغیر فقہاء کے نزدیک ایمان نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حالت سفر میں ماہ صیام کا روزہ نہ رکھنے کی اسلام میں رخصت ہے۔ اگر کوئی شخص اس اسلامی حکم کی حقانیت سے انکار کرے تو فقہاء اہل سنت اُسے مؤمن نہیں کہتے۔ اسی طرح اگر والدین اپنے دودھ پینے والے بچہ کو اپنے ہاں رکھ کر خود دودھ پلانے کی بجائے کسی اور عورت کے حوالہ کریں تو یہ بھی رخصت کے درجہ میں ایک اسلامی حکم ہے اور سورۃ بقرہ آیت نمبر 233 کے مطابق ”مَسْجَاةً بِهٖ النَّبِيُّ ﷺ“ کا حصہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے جواز پر عقیدہ نہیں رکھے گا فقہاء کرام اُسے بھی مؤمن نہیں کہتے کیوں کہ یہ اسلام کے قطعی حکم سے انکار ہے جبکہ ہمارے اہل سنت فقہاء کرام اسلام کے کسی بھی قطعی حکم سے انکار کرنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں جیسا اس قسم کے جائز مجمل کے ہوتے ہوئے مذکورہ روایت کو وجہ کفر بنا کر مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنا۔ ہماری فہم کے مطابق سورۃ نور آیت 19 میں مذکور بد باطنی اور نادانستہ اسلام دشمنی کے مترادف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“

یعنی جو لوگ مسلمانوں کے متعلق نامناسب باتیں مشہور ہونے کو پسند کرتے ہیں اُن کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب مقرر ہے۔

مزید برآں یہ بھی ہے کہ (لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ) کا یہ معنی مشہور کرنا کہ عملی طور پر تقیہ کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہے جس کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، خوفِ خدا سے خالی اور اپنے مذہبی مخالف کو معاشرہ میں بدنام کرنے کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

میں نے سوال نامہ ہذا کا جواب شروع کرنے سے پہلے مقامی شیعہ علماء سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے اس قسم کے معنی مراد لینے سے بیزاری کا اظہار کیا اور مذکورہ روایات کی اپنی کتابوں میں موجودگی کی تصدیق کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی صحت کی صورت میں ہم اُن سے صرف اور صرف تقیہ کے نفس جواز اور مجبوری کے مخصوص حالات میں اُس کے رخصت فی الاسلام ہونے کے سوا کوئی اور عقیدہ نہیں رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے علماء کرام اپنے نظریاتی مخالفوں کے مذہبی اعتقادات کے حوالہ سے جب بھی لب کشائی کرتے ہیں تو عدل و انصاف کا خون کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے صریح فرمان کی خلاف ورزی ہے۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ، آیت نمبر 8 میں ارشاد فرمایا:

”کسی قوم کی مخالفت تمہیں عدل و انصاف سے پہلو تہی کرنے پر نہ ابھارے۔“

ایک اہم سوال و جواب:-

ہمارے اس جواب سے ہر قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب تقیہ کے جواز اور اُس کا رخصت فی الاسلام ہونے کے حوالہ سے سنی و شیعہ کا کوئی فرق نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ شیعہ ہی تقیہ کے ساتھ مشہور ہوئے، اہل سنت نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تقیہ پر عمل کرنے کی مخصوص مجبوریوں کے ساتھ جتنا شیعہ دوچار ہوئے اتنا اہل سنت مجبور نہیں ہوئے۔ خاص کر بنو امیہ و بنو عباسیہ کے تاجداروں کے دور اقتدار میں تو آئمہ اہل بیت نبوت کے ساتھ حسن عقیدت کا اظہار کرنا یا ظالم مقتدرہ کے خلاف آواز حق بلند کرنا، موت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ صدیوں تک محراب و منبر کو حضرت علی ص واولاد علی کی بابت سب دشنام اور تہرلی و تیغ کے لیے استعمال کرنے والے ارباب اقتدار اور اُن کے حاشیہ برداروں کے ہاتھوں اہل حق کی بے تحاشا ہلاکتوں، اذیتوں، مال و جائیداد کی ضبطگیوں، جیسے ہزاروں مصائب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد تقیہ کے نام سے سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 کی رخصت پر عمل کرنا مدعیانِ حب علی کی مجبوری

نہیں تو اور کیا تھا؟

اپنے ناجائز اقتدار کے خلاف اٹھنے والی آواز حق کو ختم کرنے کے لیے محمد بن ابی بکر الصديق کو ناحق قتل کر کے گدھے کے چمڑے میں ڈال کر جلانے والے، حسین ابن علی کو ساتھیوں سمیت دشت کربلا میں قتل کرنے والے، امام ابو حنیفہ کو سیاسی رشوت قبول کر کے اپنی حکومت کے مظالم کو ان کے ذریعہ شرعی جواز فراہم کرنے سے انکار کرنے پر زندان میں ڈالنے والے، امام احمد بن حنبل کو ناجائز کوڑے مارنے والے اور امام شافعی کو محض حب اہل بیت کے شبہ میں گرفتار کر کے ذلت آمیز انداز میں یمن سے بغداد لے جا کر جواب طلبی کرنے والے، اور شکار پر کتے چھوڑنے کی طرح علی و اولاد علی کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ان پر سرکاری جاسوسوں کے جتھے مسلط کرنے جیسے مظالم کا ارتکاب کرنے والے تاجداروں کے تقریباً چھ سو (600) سالہ دور اقتدار میں جتنے مظالم شیعان علی پر ڈھائے گئے اُس کے عشرِ شیر بھی اگر غیر شیعان علی پر ڈھائے جاتے تو وہ بھی تقیہ کی شرعی رخصت پر عمل کرنے میں ایسے ہی مشہور ہوتے جیسے شیعہ مشہور ہو چکے ہیں۔ اہل سنت اگر اُس کثرت و شدت کے ساتھ عمل بالتقیہ کی ضرورت میں پڑتے جس طرح شیعہ اُس میں مبتلا رہے ہیں تو بالیقین اہل سنت کی کتب فقہ میں بھی تقیہ کو مستقل باب کی شکل میں بیان کر کے اُس کے مواقع استعمال اور تفصیلی احکام کا ذکر اسی طرح کیا گیا ہوتا جس طرح فقہ حنفیہ میں کیا گیا ہے۔

اہل سنت کی کتب فقہ میں کسی حکم کا مستقل ذکر نہ ہونا اُس کے عدم جواز کی دلیل نہیں بن سکتا ورنہ ”توریہ“ بھی ناجائز ہونا چاہئے کیوں کہ اُس کا بھی مستقل عنوان کے ساتھ تفصیلی بیان اور مواقع استعمال کا ذکر فقہ اہل سنت میں کہیں نہیں ہے جبکہ اُس کے جواز پر بلا تفریق مسلک سب متفق ہیں۔ اور عہد صحابہ سے لے کر آج تک جملہ اہل اسلام کا معمول یہ ہے۔ ایسے میں فقہ اہلسنت میں مستقل عنوان سے تقیہ کے احکام مذکور نہ ہونے کا یہ مطلب سمجھنا کہ اہل سنت کے مذہب میں تقیہ جائز ہی نہیں ہے انصاف کے منافی ہونے کے ساتھ سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28..... سورۃ نحل آیت، نمبر 106 کے

تحت کل مکاتب فکر مفسرین کرام کی مذکورہ تصریحات سے بھی خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اہل سنت کہلانے والے کل مکاتب فکر علماء کو مندرجہ ذیل حقائق پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے؛

اگر کوئی اسلامی مبلغ ایسے معاشرہ میں بغرض تبلیغ قیام کر رہا ہو جہاں اپنے ضمیر کے مطابق اظہار عمل کرنے میں اُن کے بدک جانے کا خوف ہونے کے ساتھ معاشرتی و اخلاقی اور سیاسی زندگی میں اپنے کردار سے انہیں متاثر کرنے کے بعد اسلام کی تبلیغ کے لیے ماحول کے سازگار ہونے کی غالب اُمید ہو، ایسے میں کیا سنی علماء اسلام کے عظیم مفاد میں تقیہ پر عمل کرنے کو ناگزیر نہیں سمجھیں گے؟ جبکہ بناء کعبہ کے متعلق بخاری شریف کی مرفوع حدیث سے بھی بطور اشارۃ النص اس کا ناگزیر ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ (بخاری شریف، ج 1، ص 215، کتاب المناسک)

مسلمانوں کے کسی ایسے معاشرہ میں جہاں پر عوام و خواص کی غالب اکثریت بدعات میں مبتلا ہو، کچھ اسلامی احکام کو ناجائز اور اُن کی جگہ اپنی خواہشات و خیالات کو بطور مذہب مشہور کر کے بدعت کے مرتکب ہو رہی ہو اور اہل حق مبلغ کو اظہار حق کی صورت میں جان و مال، عزت و آبرو کا خطرہ ہو یا مسلمانوں کے باہمی تصادم و بد امنی کی صورت میں کسی بڑے ملکی و ملی نقصان کا قوی اندیشہ ہو جبکہ تقیہ پر عمل کرنے میں اس بڑے نقصان سے تحفظ پانے کے ساتھ آئندہ چل کر اظہار حق کے لیے مناسب موقع ہاتھ آنے کی اُمید بھی ہو، کیا ایسے میں تقیہ پر عمل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ کار ہو سکتا ہے؟

اگر ہمارے اہلسنت علماء کرام مذہبی تعصب سے قطع نظر کر کے اپنے عملی کردار پر غور کریں گے تو انہیں یقین ہوگا کہ خصوصیت مسلک کے بغیر تمام مکاتب فکر تقیہ پر عمل پیرا ہیں بلکہ اُن میں سے بعض کے پھلتے پھولنے اور عوام میں پھیل کر اُن کی سیاسیات و مذہبیات پر مسلط ہونے کے متعدد اسباب میں سے سب سے بڑا عنصر ہی اُن کا تقیہ کرنا ہے، ورنہ وہ اگر اپنا مذہب و عقیدہ ظاہر کرتے یا عوامی نظریات کے خلاف تبلیغ کرتے تو انہیں اس طرح کی عوامی پذیرائی ملنے کی

بجائے تقیہ کچھ اور ہی ہوتا۔ اس سلسلہ میں اہل سنت ہونے کے مدعی دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کہلانے والے تینوں مسالک کے اہل علم حضرات کے تقیہ کرنے کی مثالیں پیش کر کے اُن سب کو دعوت فکر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تقیہ کے عمل میں شیعہ منفرد نہیں ہے بلکہ اس حوالہ سے شیعہ سنی دونوں کا عمل یکساں ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ہمارے حُسن ظن کے مطابق شیعہ اسے مخصوص ضرورت کے تحت شرعی حکم سمجھ کر عمل کرتا ہوگا کیوں کہ اُن کی تفسیروں میں ہم نے یہی پڑھا ہے جبکہ اہل سنت کے تینوں طبقے شرعی حکم تسلیم کیے بغیر اُس پر عمل کر رہے ہیں گویا عمل سب کا ایک ہے، تقیہ پر عمل کرنا سب کی ضرورت ہے اور تقیہ سے خالی ایک بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تقیہ کو ناجائز سمجھ کر اہل سنت کے لیے شجرہ منوعہ اور اہل تشیع کا خاصہ مذہبی قرار دینے کو میں اپنی تحقیق کے مطابق نہ صرف بعید از قیاس سمجھتا ہوں بلکہ خلاف حقیقت، خلاف انصاف اور مسلمانوں کے معروضی حالات کے برعکس سمجھتا ہوں۔

ہمارے اہل سنت کہلانے والے دھڑوں میں جاری تقیہ کی تفصیل:-

اہل سنت و جماعت فقہ حنفی کے پابند بریلوی کہلانے والے علماء کرام کے عملی تقیہ کی سینکڑوں مثالوں میں سے شتہ نمونہ از خوارے مندوجہ ذیل چند مثالوں پر غور کیا جائے:

پہلی مثال:- سچے اولیاء اللہ کے مزارات کے ساتھ جاہل عوام کے ہاتھوں جو غیر شرعی حرکات ہو رہی ہیں انہیں دیکھنے، خلاف شرع سمجھنے اور اُن کے خلاف تبلیغ کرنے کو اسلامی فریضہ سمجھنے کے باوجود محض دنیوی یا جماعتی مفادات کے خوف سے خاموش رہ کر ان باطل کاروں کی تقویت و ترویج کا حصہ بننا تقیہ نہیں تو اور کیا ہے جس میں نہ صرف نام نہاد علماء اور نمبر دو مشائخ ہی مبتلا ہیں بلکہ ایچھے خاصے اہل علم اور اصحاب محراب و منبر کے ذمہ دار حضرات سمیت سچے مشائخ بھی ملوث ہیں۔

دوسری مثال:- کاروبار کی غرض سے جعلی بنائے گئے کچھ مزارات اور اُن کے چلانے والے نمبر دو مشائخ کی بے اعتدالیوں، خلاف شریعت حرکات اور طریقت کے منافی اعمال کو اسلام و اہل اسلام کے

لیے نقصان سمجھنے کے باوجود دنیوی یا جماعتی مفادات کا خوف کھا کر اُن کے خلاف فریضہ تبلیغ انجام دینے سے خاموشی اختیار کرنا یا اُن کی ہاں میں ہاں ملانے کا جو معمول بنا ہوا ہے یہ انداز عمل تقیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

تیسری مثال:- منہ پر تعریف کرنے والے خوشامدی قسم کے لوگوں پر رد کرنا جو شرعی حکم ہے جسکے متعلق صریح نص میں اللہ کے حبیب ﷺ نے ”فَاخْشُوا فِی وُجُوهِہُمْ التُّرَابَ“ فرمایا ہے یعنی منہ پر تعریف کرنے والے خوشامدیوں کے منہ میں مٹی ڈال کر انہیں خاموش کرو۔

کتنے بیوقوفوں پر، بزرگانِ دین کے عرسوں پر اور مختلف اجتماعات میں کچھ علماء سوا اہل ثروت و دنیا داروں کی خلاف حقیقت تعریفیں منہ پر کرتے ہیں اسی طرح کچھ علماء سوا مجلس میں موجود پیروں کے منہ پر خلاف حقیقت ایسی تعریفیں کرتے ہیں جو اُن میں نہیں ہوتی۔ مزید براں یہ کہ کچھ علماء سوا لاؤڈ سپیکر پر گلے پھاڑ پھاڑ کر کچھ سچے مشائخ کی اور کچھ نمبر دو مشائخ کے لیے غوث الاغواث، قطب الاقطاب، مجدد العصر، عالم ظاہر و باطن جیسے القابات کا اعلان تعریفی کلمات کے ساتھ کرتے ہیں جن کو دیکھ کر مجلس میں موجود سچے مشائخ و علماء حق اُن کے منہ میں مٹی ڈالنے کے شرعی حکم سے کتراتے ہیں جبکہ اللہ کی رسول ﷺ کا واضح حکم ہے ”اِذَا رَئِیْتُمُ الْمَدَاحِیْنَ فَاخْشُوا فِی وُجُوهِہُمْ التُّرَابَ“ (مشکوٰۃ شریف، ج 412، باب حفظ اللسان) اور محض اس وجہ سے انہیں روکنے یا اٹھ کر اُس کے خلاف شرع حرکت ہونے کی تبلیغ کرنے یا نہی عن المنکر کرنے سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ اپنے ضمیر کے مطابق نہی عن المنکر کرنا فریضہ انجام دینے کی صورت میں انہیں ماحول کے بدرجہ ہونے، اختلاف پیدا ہونے، پیر پرست جہلا کے باغی ہونے یا دنیوی مصلحتوں کی فوٹنگی جیسی باتوں کا خوف لاحق ہوتا ہے، گویا وہ کسی خوف سے بچنے کے لیے اپنے ضمیر و عقیدہ کے خلاف یہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں جو سورۃ آل عمران آیت نمبر 28 ”اِلَّا اَنْ تَقُوْا مِنْہُمْ تَقَاۃً“ کے مطابق عین تقیہ ہے جس میں اہل سنت کہلانے والے جملہ مکاتب فکر کے علماء بلا تخصیص مسلک مبتلا ہیں۔ کیا اس کا نام مدامت فی الدین یا ایمان کی کمزوری یا معاشرتی مجبوری

رکھنے سے اس کی حقیقت بدل سکتی ہے؟ جبکہ حقائق ہمیشہ حقائق ہی رہتے ہیں ناموں کے بدلنے سے وہ نہیں بدلا کرتے۔

چوتھی مثال:- اہل سنت و جماعت بریلوی کہلانے والے کافی علماء حق سے میں نے خود متعدد مواقع پر پوچھا ہے کہ حضرت داتا گنج بخش، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت غوث بہاء الحق جیسے بیسیوں سچے اولیاء اللہ کے مزارات پر جن خلاف شرع حرکات کا ارتکاب کیا جا رہا ہے اور تو ہم پرست جہلا کے ہاتھوں اُن مقدس ہستیوں کی ارواح مقدسہ کی اذیت کے باعث جو خلاف شرع کام ہو رہے ہیں اُن کے خلاف محراب و منبر کو کیوں استعمال نہیں کیا جا رہا ہے؟ یا اعراض بزرگان دین کے مواقع پر اُن برگزیدہ ہستیوں کے عقائد و کردار کے خلاف جن منکرات کا ارتکاب کیا جا رہا ہے یا نمبر دو پیروں، کذابوں، فرائیوں کی روحانیت و تصوف کے نام پر جلسازیوں کی وجہ سے سادہ لوح مسلمانوں کا دین و دنیا تباہ و برباد ہونے کے ساتھ سچے اولیاء اللہ کی بابت اُن کی وجہ سے جو شکوک و شبہات پیدا ہو کر بدنامی کا سامان ہو رہا ہے اس کے اسناد کے لیے اور شریعت و طریقت کو بدنامی سے بچانے کے لیے نبی عن المنکر کے تبلیغی فرائض انجام کیوں نہیں دیئے جاتے ہیں؟

میرے اس سوال کا سب سے زیادہ جواب مجھے ملتا رہا۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف مزارات اولیاء اللہ کے منکرین ہیں اگر ہم ان منکرات کے خلاف تبلیغ کریں تو اُن کے موقف کی تائید ہوتی ہے جو ہمیں گوارا نہیں ہے جبکہ دوسری طرف ان چیزوں کو شعائر اہل سنت تصور کرنے والوں کی اکثریت ہے جن کی مخالفت کرنے میں دیوار کے ساتھ لگنے کا خوف ہوتا ہے۔ بس انہی دو مصیبتوں سے بچنے کے لیے ہمیں گونگا شیطان بننا پڑتا ہے ورنہ اگر مذکورہ باتوں کا خوف نہ ہوتا تو ہم اس کے خلاف نبی عن المنکر کر کے ضرور حق تبلیغ انجام دیتے۔

تقیہ کو شیعہ مذہب کے ساتھ خاص سمجھ کر اہل سنت کے لیے شجرہ ممنوعہ ہونے کی تبلیغ کرنے والے علماء کرام سے خصوصیت مسلک سے قطع نظر گزارش کروں گا کہ اپنے معاشرہ کے حوالہ سے ان

معروضی بد یہی اور ناقابل انکار حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ کیا کسی بات کے خوف سے بچنے کے لیے اپنے ضمیر و عقیدہ کے خلاف کام کرنا، خاموش رہنا اور رضا بالعلم کا تاثر دینا آیت کریمہ ”إِلَّا أَنْ تَقُوا مِنْهُمْ تَقَاةً“ کی مفسرین کرام کی مذکورہ تصریحات کے مطابق عین تقیہ نہیں ہے؟ یا کیا شیعہ کو ایسا کرنے پر تقیہ باز اور سنی کو ایسا کرنے پر راست باز قرار دینے کی تفریق کا کوئی شرعی یا اخلاقی جواز ہو سکتا ہے؟

سُوْظَن کا ازالہ:- ممکن ہے کہ میری یہ تحقیق پڑھ کر جعلی پیروں کے آلہ کار مجھے شیعہ ہونے کا الزام دیں کیوں کہ شیطانوں نے انہیں اس تاک میں بٹھایا ہوا ہے حالانکہ میں حضرات شیخین کریمین پر تیزی کرنے والوں سے ایسی ہی نفرت کرتا ہوں جیسے ان گمراہوں سے کراہت کرتا ہوں صحابہ رسول کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو ایسا ہی گمراہ سمجھتا ہوں جیسا ان دجل کاروں کو گمراہ سمجھتا ہوں۔ میرا پختہ عقیدہ و ایمان ہے کہ صحابہ رسول پر تیزی کرنے والوں کی صحبت ایمان کے لیے ایسا ہی نقصان ہے جیسا اہل بیت نبوت کے ساتھ عداوت رکھنے والوں کی صحبت نقصان ہے۔ میرا پختہ ایمان ہے کہ کسی بھی صحابی رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والا صحیح معنی میں مومن مسلمان نہیں ہو سکتا۔

تقیہ کے حوالہ سے پیش نظر سوال نامہ کے جواب میں اس تحریر سے میرا مقصد مسئلہ کی تحقیق کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کے مطابق اپنا ایمان و مذہب، جان و مال اور عزت و آبرو بچانے کے لیے تقیہ کو رخصت فی الاسلام سمجھتا ہوں مخصوص حالات کی مجبوری سمجھتا ہوں اور قرآنی حکم ہونے کا عقیدہ رکھتا ہوں جو اہل سنت کے چاروں مذاہب کے اسلاف کا متفقہ عقیدہ ہے۔ اس کے ساتھ خود کو اہل سنت کہنے والے اُن حضرات پر افسوس کر رہا ہوں جو عملی زندگی میں تقیہ کا مجسمہ ہونے کے باوجود اُسے حرام کہتے ہیں، اپنے مذہبی مخالف کا شعار اور اُن کے ساتھ مختص کہتے ہیں انجام کار اسلامی حکم سے انکار کرتے ہیں، اپنے ہی اکابرین کی تصریحات اور جملہ مفسرین سے انحراف کر رہے ہیں۔ یہ دو غلاظین دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ حضرات تقیہ کے ثبوت میں موجود مذکورہ آیات

قرآنی اور احادیث نبوی کی کیا من گھڑت تاویل کرنے ہوں گے اور اُن کی تشریح میں موجود اکابرین اُمت کی مذکورہ تصریحات کا کیا جواب دیتے ہوں گے۔ بزرگان دین نے سچ فرمایا ہے:

”الْتَّعَصُّبُ إِذَا تَمَلَّكَ أَهْلَكَ“

یعنی تعصب جس پر غالب ہو جائے اُسے ہلاک کر دیتا ہے۔

خدارا! تعصب کو چھوڑ کر حقائق شناسی کی طرف آنے کی زحمت فرمائیں تاکہ تقیہ کے نام سے رخصت کے درجہ میں ایک اسلامی حکم سے لاشعوری میں منحرف ہونے کے گناہ سے بچ سکیں۔ گزشتہ صفحات میں تقیہ کی جو مثالیں ہم نے بیان کیں وہ اہل سنت و جماعت حنفی بریلوی کہلانے والے حضرات کے عملی تقیہ کی شتہ نمونہ از خروارے تھیں جبکہ دیوبندی کہلانے والے علماء کی غالب اکثریت کی عملی زندگی ہی تقیہ سے عبارت ہے۔ اس سلسلہ دراز کی چند مثالوں کو مندرجہ ذیل تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

1977ء کے الیکشن جیتنے کے لیے مفتی محمود کا اپنے عقیدہ کے برخلاف داتا دربار میں حاضری دینے کے بعد لاہوری عوام کی طرف سے لائی گئی نذر و نیاز کی مٹھائی زائرین میں علی رؤس الاشہاد تقسیم کرنے کا ہر اخبار پڑھنے والے کو علم ہے بالخصوص الیکشن جیتنے جیسے بڑے مقصد کے حصول کے لیے اپنے عقیدہ کے برعکس اس چھوٹے سے تقیہ کو ناجائز قرار دینے کی جسارت کون سادیا دار کر سکتا ہے؟ جبکہ اسلام میں کسی دنیوی مفاد کے حصول کی خاطر تقیہ کرنے کی اجازت ہر گز نہیں ہے چاہے سیاسی مفاد ہو یا معاشی، انفرادی ہو یا اجتماعی دیوبندی مکتب فکر کے سرکردہ عالم دین کا یہ کردار تقیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

اندرون ملک سینکڑوں مساجد ایسی ہیں جن میں امام دیوبندی مکتب فکر سے متعلق ہونے کی بنا پر ختم غوثیہ، دُعا بعد السنن، دُعا بعد الجنازہ، فاتحہ سوم، فاتحہ چہلم جیسے بریلوی مسلمانوں کے معمولات پر ماحولیاتی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر محض دنیوی مفادات سے بچنے کے لیے اپنے عقیدہ و نظریہ کے خلاف اُس وقت تک خاموشی کیساتھ یہ سب کچھ کرتے ہیں جب تک علاقہ کی نئی نسل میں اپنی تعلیمات

کو راسخ کر کے انہیں اپنا دست و بازو نہیں بنا لیتے، بڑے مقاصد کے حصول کی خاطر فروعی مسائل و عقیدہ کو قربان کرنے اور اپنے نظریاتی مخالفین کے مذہبی رنگ میں اپنے آپ کو رنگین کرنے کے یہ معروضی حالات تقیہ نہیں تو اور کیا ہیں؟ کیا انہیں مصلحت پسندی یا صلح کلی کا نام دینے سے یا حکمت عملی اور رچالاک کی کے الفاظ میں تعبیر کرنے سے ان کی حقیقت تقیہ کے شرعی مفہوم سے نکل سکتی ہے؟

کیا ان معروضی حالات کو روز و شب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود تقیہ کو شیعہ کا خصوصی عمل اور اہل سنت کہلانے والوں کے لیے شجرہ ممنوعہ کہنے کی تفریق کا کوئی شرعی و اخلاقی جواز باقی رہتا ہے؟ خدارا سوچیں انصاف کریں۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب دیوبندی کہلانے والے علماء کا بریلوی اکثریت کے ماحول میں کوئی مطلب ہو تو اُس وقت وہ ان دونوں کو یکساں اہل سنت و جماعت حنفی المذہب کہہ کر ان کے مابین فروعی اختلاف ظاہر کر لیتے ہیں حالانکہ اندون خانہ دیوبندی کہلانے والے حضرات اپنے مخصوص ماحول میں بریلویوں کو مشرک سے کم کا فر نہیں سمجھتے ہیں جس وجہ سے اُن کے ناپختہ اصاغر اپنے اکابر کی نسبت بریلویوں کی بابت زیادہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور تقریباً یہی حال بریلویوں کا بھی ہے کہ وہ دیوبندی اکابر مثلاً قاسم نانوتوی، اشرف علی تھانوی، خلیل احمد انٹھوی وغیرہ کی چند متنازعہ کتب و عبارات کی بنیاد پر دیوبندی عقائد کے حامل حضرات کو قطعی کافر و مرتد سمجھتے ہیں اور اُن کے کفر میں شک کرنے والوں کو بھی کافر کہتے ہیں۔ لیکن دنیوی، سیاسی اور جماعتی مفادات کی خاطر ایک دوسرے سے متعلقہ اپنے عقیدہ و نظریہ کے برخلاف اس اختلاف کو فروعی کہہ کر مطلب نکالتے ہیں۔ حنفی المذہب کہلانے والے ان دونوں جماعتوں سے وابستہ حضرات کا یہ کردار تقیہ نہیں تو اور کیا ہے؟۔ یہ ہوا اہل سنت و جماعت حنفی المذہب کہلانے والی جماعتوں کا حال۔

اہل حدیث کہلانے والے حضرات کا حال بھی تقیہ کے حوالہ سے ان دونوں سے مختلف نہیں ہے اس سلسلہ کی سینکڑوں مثالوں میں سے بطور شتہ نمونہ از خروارے مندرجہ ذیل چند تحریری دستاویزات پر

اکتفا کرتا ہوں۔

اہل حدیث مسلک کا مذہبی ترجمان ہفت روزہ الاعتصام لاہور مئی 1990ء میں کسی مصلحت کے تحت نماز میں رفع یدین کو ترک کرنے پر گناہ ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے؛

”ہمارے بعض اسلاف تبلیغی مصلحت کے لیے ترک رفع یدین پر عامل تھے۔“

اہل انصاف جانتے ہیں کہ جس تبلیغی مصلحت کی خاطر اپنے عقیدہ کے مطابق رفع الیدین کی سنت مؤکدہ کو ہمارے یہ اہل حدیث بھائی ترک کرنے پر عامل تھے اور ہیں وہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر خفی المذہب اکثریت کے ماحول میں اپنے مذہب کے مطابق رفع الیدین پر عمل کیا جائے تو لوگوں کے بدک جانے کا خوف ہوتا ہے جس سے بچنے کے لیے یہ حضرات تقیہ کی رخصت پر عمل کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔

اہل حدیث مسلک کے عظیم مبلغ مولانا خوجہ عطاء الرحمن صاحب نے مولانا نور حسین گرجاگھی کی جو سوانح مرتب لکھی ہے اس کے صفحہ 12 پر مولانا نور حسین صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ دن کی نمازوں میں لوگوں کے بدک جانے کے خوف سے بچنے کے لیے رفع یدین کی سنت مؤکدہ پر عمل ترک کیا کرتے تھے جبکہ نماز تہجد کی تنہائی میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔

سوانح مولانا نور حسین گرجاگھی کے صفحہ نمبر 13 پر مولانا نور حسین کے استاذ حضرت مولانا غلام رسول صاحب قلعوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی دن کی نمازوں میں اپنی اقتداء میں نماز پڑھنے والے خفی المذہب مقلدین کے بدک جانے کے خوف سے بچنے کے لیے ترک رفع یدین کیا کرتے تھے جبکہ تنہائی میں نماز پڑھنے کی صورت میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔ مولانا حسین صاحب کے پوچھنے پر فرمایا کہ؛

”بیٹا یہ سنت رسول ﷺ ہے ہم لوگ صرف اس لیے نہیں کرتے کہ لوگ بدک نہ جائیں اور

ہماری تبلیغ میں رکاوٹ نہ ہو۔“

تقیہ کو شیعہ کے ساتھ خاص سمجھ کر اہل سنت حضرات بالخصوص اہل حدیث کہلانے والوں کے لیے شجرہ ممنوعہ ہونے کا تاثر دینے والے جملہ حضرات کو ٹھنڈے دل سے اپنے اکابرین کے اس کردار پر غور کرنا چاہیے کہ آیا ان حضرات کا لوگوں کے بدک جانے کے خوف سے بچنے کے لیے اپنے عقیدہ کو چھپا کر بظاہر ان کے مذہب کے مطابق عمل کرنا تقیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

تقیہ کے حوالہ سے اہل سنت کہلانے والے مذکورہ تینوں طبقوں کے معروضی کردار کو دیکھنے کے بعد یقین سے کہنا پڑتا ہے کہ تقیہ کے حکم شرعی پر رخصت کے درجہ میں عمل کرنے میں سنی و شیعہ کا قطعاً کوئی فرق نہیں ہے اگر کچھ فرق ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی کچھ ہے کہ شیعہ اُسے رخصت فی الاسلام کے درجہ میں شرعی حکم سمجھ کر بوقت ضرورت اُس پر عمل کر رہا ہوگا جیسا اُن کی مذکورہ تفسیروں سے معلوم ہو رہا ہے جبکہ اہل سنت کہلانے والوں کے تینوں طائفے اُسے ناجائز سمجھنے کے باوجود لاشعوری میں اُس پر عمل کر رہے ہیں جو نادانستہ گناہ کے زمرہ میں آتا ہے جس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی جوازی صورت پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ جس کام سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے جو سب کی ضرورت ہے اور جس پر بوقت ضرورت سب کا یکساں عمل چلا آ رہا ہے اُسے اپنے مخالف نظر یہ والوں کا گناہ قرار دے کر اپنے لیے شجرہ ممنوعہ مشہور کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

تقیہ کے حوالہ سے تاریخ کا سب سے زیادہ شرمناک واقعہ:-

اس حوالہ سے میرے جس مطالعہ نے مجھے حیرت کی وادی لامتناہی سے نکلنے نہیں دیا وہ مولوی اشرف علی تھانوی کے ایام شباب میں اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی وہ تاریخ ہے جس میں انہوں نے بریلوی مکتب فکر مسلمانوں کی اسلامی درسگاہ جامع العلوم کانیپور میں مدرس کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”کانپور میں مجلس میلاد قائم ہوتی ہے اور لوگ کھڑے ہو کر سلام پڑھتے ہیں میرا جی جلتا ہے مگر بہر حال وہاں بدون شرکت قیام کرنا قریب بحال دیکھا اور منظور تھا وہاں رہنا کیوں کہ دنیوی

منفعت بھی ہے کہ مدرسہ سے تنخواہ ملتی ہے۔“ (۱)

تھانوی کا حصول تنخواہ کی خاطر اپنے عقیدہ کے برخلاف کسی معقول شرعی مجبوری کے بغیر تقیہ کر کے اپنے نظریاتی مخالفین کے پاس ملازم رہنا اور کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے والوں کے اس عمل سے دل کی جلن کی حد تک کراہت و نفرت کے باوجود تقیہ کر کے اس میں شرکت کرنا تقیہ کی وہ شرمناک قسم ہے جس کے جواز کا قائل جملہ اہل اسلام میں کوئی نہیں ہے کیوں کہ دُنیوی منفعت کے حصول کے لیے تقیہ کی راہ اختیار کرنے کے عدم جواز پر جملہ اہل اسلام کا اتفاق ہے، اہل سنت کے کسی مذہب میں اس کے جواز کی گنجائش ہے نہ شیعہ مذہب میں، گزشتہ صفحات میں سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 اور سورۃ نحل، آیت 106 کے تحت شیعہ و سنی مفسرین کرام کی جن تصریحات کو ان کے مکمل حوالہ جات کے ساتھ ہم نے بیان کیا ہے ان کی روشنی میں کسی بھی صاحب بصیرت انسان کو بلا تخصیص مسلک شیعہ و سنی مکاتب فکر میں دُنیوی مفاد کے لیے تقیہ کرنے کا ناجائز ہونے پر اتفاق ہونے میں شک نہیں ہو سکتا۔

شرم کا مقام نہیں تو اور کیا ہے کہ جملہ اہل اسلام کے اس متفقہ اور غیر متنازع حکم کے برعکس اشرف علی تھانوی نے دُنیوی حقیر مفاد کی خاطر تقیہ کر کے اپنے عقیدہ کے خلاف عمل کا ارتکاب کیا ہے اور شرم بالائے شرم کا مقام یہ کہ جوانی کی عمر میں سرزد شدہ اس گناہ پر مٹی ڈال کر آئندہ کے لیے توبہ النصوح کرنے کی بجائے کھلے بندوں اُس کی تحریری تبلیغ کر رہے ہیں گویا نادانستہ طور پر اپنے قارئین و مریدین کو بھی اس گناہ پر عمل کرنے کی دعوت دے رہے ہیں ایسے میں تقیہ کو شیعہ مذہب کا خاصہ قرار دے کر اپنے لیے شجرہ ممنوعہ کہنے والے یہ حضرات میرے خیال کے مطابق الٰہی گناہ میں نہا رہے ہیں کیوں کہ قرآن شریف کی سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 کے علاوہ متعدد احادیث طیبہ جن کے حوالہ جات گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ شیعہ و سنی تشریحات کے مطابق تقیہ کا مفہوم اور اُس کی جائز اقسام کی روشنی میں جن صورتوں کو جائز قرار دیا گیا ہے وہ بلا تفریق مسلک شیعہ و سنی دونوں کے

(۱) اشرف علی تھانوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ”سیف یمانی“، ص 23۔

نزدیک جائز ہیں اور جن شکوک کو ناجائز سمجھا گیا ہے ان کے ناجائز ہونے پر بھی فریقین کا بلا نزاع اتفاق ہے اور ظاہر ہے کہ دُنیوی مفاد کی خاطر تقیہ کر کے اپنے عقیدہ کے خلاف عمل اختیار کرنا یا اپنے نظریہ کے خلاف لوگوں کے کسی عمل سے دل میں جلن و کراہت محسوس کرتے ہوئے بھی اُس میں محض دُنیوی مطلب کے لیے شریک ہونا کسی اہل سنت مذہب میں جائز ہے نہ شیعہ میں مگر اشرف علی تھانوی نے نہ صرف اس غیر مشروع فی الاسلام تقیہ پر خود عمل کیا بلکہ تحریری تبلیغ کی شکل میں اپنے عقیدت مندوں اور قاریوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ (فَاللّٰهُ الْمُسْتَكْبِي)

تقیہ کے حوالہ سے اشرف علی تھانوی کا یہ واقعہ کسی غیر ذمہ دار اہل قلم کی اُن کی طرف دی گئی نسبت نہیں ہے جس سے بے احتیاطی کہہ کر صرف نظر کیا جاسکتا ہے۔ نیز تذکرۃ الرشید یا ارواح ثلاثہ کے مصنفین کی طرح کسی اندھی تقلید کے اسیر کی تحریر بھی نہیں ہے جس کو اکابرین کے حق میں اصاغر کا غلو و اندھا پن کہہ کر اہمیت نہ دی جائے اور یہ کسی جاہل مرید کی اپنے پیرو یا کسی تقلید جلد کے حصار میں محصور شاگرد کی اپنے استاذ کے متعلق بے محل خوش اعتقادی و خیالی کرامات اور شیطانی خوابوں کو بطور کرامت تدوین کردہ کتاب کی بات بھی نہیں ہے جس میں خصوصیت مسلک سے قطع نظر سب ہی مبتلا ہیں بلکہ یہ دیوبندی کہلانے والے علماء کرام کے سرخیل اور شہرۂ آفاق اشرف علی تھانوی چشتی نظامی کا اپنے مذہبی کردار سے متعلق بقلم خود لکھا ہوا مستند واقعہ ہے جس سے انکار کرنے کی کوئی مجال ہی نہیں ہے۔

حسب سوغت عقل ذحیرت ابن جہ بوالعجبی ست

تقیہ کے حوالہ سے اس شرمناک واقعہ کے بعد اُس کی مندرجہ ذیل اقسام اُبھر کر سامنے آ رہی ہیں؛ پہلی قسم:- تقیہ کی وہ تمام جائز صورتیں ہیں جن پر بلا تخصیص مسلک شیعہ و سنی، شافعی و حنفی اور مالکی و حنبلی وغیرہ بالا اتفاق عمل کرتے آئے ہیں مثال کے طور پر کسی ظالم کے خوف سے اپنی جان اور عزت و آبرو کو بچانے کی خاطر اپنے عقیدہ کے برعکس کردار اختیار کرنا جیسے سورۃ آل عمران، آیت 28 کے تحت جملہ مکاتب فکر مفسرین کے حوالہ جات سے ظاہر ہو رہا ہے جن کو گزشتہ صفحات میں بقید جلد و صفحات ہم بیان

کرائے ہیں ان کے علاوہ حضرت عمار بن یاسر اور ان کے والدین (حضرت یاسر و سنیہ زوجہ اللہ تعالیٰ عنہم) کا واقعہ جس کے لیے سورہ نحل، آیت 106 نازل ہوئی ہے جس کو جملہ مفسرین کرام نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں بیان کیا ہے۔ اس نوعیت کے تقیہ کے جواز پر نبی اکرم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے صریح نص موجود ہونے کی بنا پر محل اجتہاد ہی نہیں ہے تاکہ اختلاف کی گنجائش ہو سکے، جس وجہ سے شارحین حدیث نے بھی کسی قسم تاویل کے بغیر اسے جوں کے توں بحال رکھا ہے۔

اس کے علاوہ مسئلہ الکذاب نے جن دو صحابہ کرام کو پکڑ کر ان میں سے ایک کو اپنی رسالت کی شہادت نہ دینے پر شہید کیا جبکہ دوسرے نے تقیہ پر عمل کر کے جان بچائی جب یہ واقعہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے حضور پیش ہوا تو آپ ﷺ نے ”أَمَّا هَذَا الْمَقْتُولُ فَمَضَى عَلَى يَقِينِهِ وَصَدَقَهُ فَهَبْ لَهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَقَبِلَ رُخْصَةَ اللَّهِ فَلَا تَبِعَهُ عَلَيْهِ“ (امام نووی کی تفسیر مراح لیب، ج 1، ص 94، مطبوعہ بیروت) کہہ کر تقیہ پر عمل کر کے جان بچانے والے اس صحابی کو رخصت فی الاسلام پر عمل کر نیوالا قرار دیکر بے گناہ ٹھہرایا۔

تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی صریح اور واضح نصوص کی موجودگی میں تقیہ کے جواز میں اختلاف کی کیا مجال ہو سکتی ہے۔ تقیہ کی متفقہ طور پر جائز صورتوں میں کسی بڑے دینی و ملی نقصان کے خوف سے بچنے کی خاطر اپنے عقیدہ کے خلاف کسی چھوٹے نقصان کو اختیار کرنا اور اپنی مذہبی پسند کے برعکس کردار اپنانا یا خاموشی اختیار کرنے کی صورتیں بھی شامل ہیں جیسے بخاری شریف کی کتاب الناسک کی اس مرفوع حدیث سے ثابت ہو رہا ہے جس میں بنا کعبہ سے متعلق حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ زوجہ اللہ تعالیٰ عنہا کے پوچھنے پر ”يَا رَسُولَ اللَّهِ لَا تَرُدُّهَا عَلَيَّ فَوَاعِدِ ابْرَاهِيمَ“ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ بیت اللہ شریف کو از سر نو حضرت ابراہیم کی باتھ رکھی گئی بنیادوں پر نہیں بناؤ گے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لَوْلَا جِدَّتَانِ قَوْمِي بِالْكَفْرِ لَفَعَلْتُ“

اور دوسری روایت میں آیا ہے

”قَالَتْ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا حَدَاثَةُ قَوْمِي بِالْكَفْرِ لَفَعَلْتُ الْيُبْتُ ثُمَّ لَبَيْتُهُ عَلَى أَسَاسِ ابْرَاهِيمَ“ (۱)

اگر تیری قوم قریب العہد بالجالبیت نہ ہوتی یعنی ان کی طرف سے بیت اللہ کو گرانے کے منفی پراپیگنڈا میں ان کے گناہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو بالیقین میں ایسا ہی کرتا۔

دوسری قسم:- وہ تمام صورتیں شامل ہیں جن کے جواز و عدم جواز میں ائمہ اہل سنت کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے جیسے امام نظام الدین نساپوری نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے:

”مِنْهُمْ أَنَّ الشَّافِعِيَّ حَوَّزَ التَّقِيَّةِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ وَمِنْهَا أَنَّهَا جَائِزَةٌ لِصَوْنِ الْمَالِ عَلَى الْأَصَحِّ“ (۲)

یعنی تقیہ کے کچھ اختلافی احکام میں سے یہ بھی ہیں کہ امام شافعی نے مسلمانوں کے مابین بھی تقیہ کرنے کو جائز سمجھا ہے اور یہ بھی ہے کہ زیادہ صحیح روایت کے مطابق اپنے مال کو ظالموں سے بچانے کی خاطر بھی جائز ہے۔

تیسری قسم:- وہ تمام صورتیں جس کے ناجائز و نامشروع ہونے پر شیعہ سنی کی تفریق کے بغیر جملہ اہل اسلام متفق ہیں یعنی کسی سنی مذہب میں اسے جائز سمجھا گیا ہے نہ شیعہ مذہب میں جس کی مثالوں میں کسی دوسرے شخص یا اشخاص کی جان و مال اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے یا دین اسلام میں بگاڑ و فساد پیدا کرنے یا التباس الحق بالباطل کرنے یا کسی دنیوی فائدہ کے حصول کی خاطر تقیہ کرنے کی تمام ممکنہ صورتیں شامل ہیں جیسے تفسیر نساپوری میں تقیہ کا شرعی حکم ہونے کی حیثیت سے اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”فَأَمَّا الَّذِي يَرْجِعُ صُرُّهُ إِلَى الْغَيْرِ كَالْقَتْلِ وَالزَّانَا وَغَضَبِ الْأَمْوَالِ وَشَهَادَةِ

(۱) بخاری شریف کتاب المناسک، ج 1، ص 215۔

(۲) تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان، ج 3، ص 179، مطبوعہ بیروت۔

الزُّورِ وَقَذِفِ الْمُحْصَنَاتِ وَإِطْلَاعِ الْكَافِرَاتِ عَلَى عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِينَ فَذَلِكَ
عَنْ جَانِبِ الْبَيِّنَةِ“ (۱)

جس تقیہ کا ضرر کسی دوسرے کو پہنچتا ہو جیسے ناحق قتل کرنا، زنا کرنا، لوگوں کے مالوں کو غصب کرنا، جھوٹی شہادت دینا، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا اور غیر مسلموں کو اہل اسلام کے پوشیدہ حالات پر مطلع کرنے جیسے کاموں کے لیے تقیہ کرنا بالیقین ناجائز ہیں۔

فقہ جمعہ فریہ کے معتبر ترین مفسر جواد مغنیہ نے التفسیر الکاشف میں سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَلَا تَجُوزُ لِجَلْبِ الْمَنْفَعَةِ وَلَا لِادْخَالِ الضَّرَرِ عَلَى الْغَيْرِ“ (۲)

یعنی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے تقیہ کرنا جائز نہیں ہے اور کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے بھی جائز نہیں ہو سکتی۔

اور جلد 3 صفحہ 423 پر لکھا ہے؛

”أَمَّا تَحْرِيفُ الدِّينِ بِالْكَذِبِ عَلَى اللَّهِ فَلَا مَبْرَرَ لَهُ عَلَى الْإِطْلَاقِ مَهْمَا تَكُنِ
النتائج“

یعنی ایسا تقیہ جس میں اللہ پر جھوٹ بول کر دین اسلام میں تحریف و نقصان پیدا کیا جا رہا ہو تو وہ قطعاً ناجائز ہے چاہے نتائج جو بھی ہو۔

یہاں تک ہم نے تقیہ کی جن تین (3) قسموں کو بیان کیا یہ سرسری نظر میں ہیں۔ یعنی اجمال کے درجہ میں ورنہ بنظر غائر اگر دیکھا جائے تو اسلاف کی تصریحات کے مطابق اس کی چھ (6) قسموں کا اشارہ ملتا ہے جو عین حقیقت ہے کیوں کہ ان تین قسموں کو بنظر تفصیل دیکھنے سے ان میں سے ہر ایک کی

(۱) تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان، ج 3، ص 179۔

(۲) التفسیر الکاشف، ج 2، ص 44، مطبوعہ بیروت۔

دو قسمیں ہوتی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں تقیہ کے شرعی مفہوم کے پائے جانے کے لیے ظالم، مخالف اور دشمن میں سے کسی ایک کے ہاتھوں، ماحول یا حرکت و عمل کے سامنے مجبور ہونا ضروری ہے یعنی بغیر مجبوری کے تقیہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اور جس کی طرف سے مجبور کیے جانے یا نقصان پہنچانے جانے کا خوف ہو، اُس کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں یعنی مجبور دنیوی اور مجبور مذہبی بالفاظ دیگر دنیوی دشمن یا مذہبی مخالف جس کی تعبیر مفسرین کرام نے عُدُو دین و عُدُو دُنْیَا کے الفاظ میں کیا ہے یعنی دنیوی مخالف یا مذہبی مخالف جیسے تفسیر روح المعانی کے مصنف سید محمود بغدادی الوسی نے سورۃ آل عمران، آیت 28 کے تحت تقیہ کے مشروع فی الاسلام ہونے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے؛

”وَفِي آيَةِ دَلِيلٍ عَلَى مَشْرُوعِيَةِ التَّقِيَةِ وَعَرَفُوهَا بِمُحَافَظَةِ النَّفْسِ أَوْ الْعَرَضِ
أَوْ الْمَالِ مِنْ شَرِّ الْأَعْدَاءِ وَالْعَدُوِّ قِسْمَانِ الْأَوَّلُ مَنْ كَانَتْ عِدَاوَتُهُ مَبْنِيَّةً عَلَى
اِخْتِلَافِ الدِّينِ كَالْكَافِرِ وَالْمُسْلِمِ، وَالثَّانِي مَنْ كَانَتْ عِدَاوَتُهُ مَبْنِيَّةً عَلَى
أَعْرَاضٍ دُنْيَوِيَّةٍ كَالْمَالِ وَالْمَتَاعِ وَالْمُلْكِ وَالْإِمَارَةِ وَمِنْ هُنَا صَارَتِ التَّقِيَةُ
قِسْمَيْنِ“ (۱)

اس آیت کریمہ میں تقیہ کے مشروع فی الدین ہونے پر دلیل ہے اور اسلاف نے اس کی تعریف دشمنوں کے شر سے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو بچانے کے ساتھ کی ہے اور دشمن دو قسم پر ہے؛

اول:- وہ جس کی عداوت و مخالفت مذہبی اختلاف پر مبنی ہے جیسے مسلم و غیر مسلم کے مابین ہوتی ہے۔

دوسرا:- وہ دشمن ہے جس کی مخالفت دنیوی اغراض و مقاصد پر مبنی ہوتی ہے جیسے مال و متاع،

(۱) تفسیر روح المعانی، ج 3، ص 121، مطبوعہ بیروت۔

بادشاہی و سلطنت کے حوالہ سے ہوتی ہے اور یہاں سے تقیہ کی دو قسمیں وجود میں آتی ہیں۔ اسلاف کی ان تصریحات کے مطابق تفصیل کے درجہ میں تقیہ کی مندرجہ ذیل چھ (6) قسموں کی نشان دہی ہو رہی ہے؛

تقیہ کی مذکورہ مخفیہ طور پر جوازی صورتوں میں سے کوئی بھی صورت کسی مذہبی دشمن کی طرف سے پیش ہو۔

اُن میں سے کوئی بھی صورت کسی دنیوی دشمن کی طرف سے پیش ہو۔

تقیہ کی مذکورہ اختلائی صورتوں میں سے کوئی بھی صورت کسی مذہبی دشمن کی طرف سے پیش ہو۔

اُن میں سے کوئی بھی صورت کسی دنیوی دشمن کی طرف سے پیش ہو۔

تقیہ کی مذکورہ مخفیہ طور پر غیر جوازی صورتوں میں سے کوئی بھی صورت کسی مذہبی دشمن کی طرف سے پیش ہو۔

اُن میں سے کوئی بھی صورت کسی دنیوی دشمن کی طرف سے پیش ہو۔

تقیہ کی یہ چھ (6) قسمیں وہ ناقابل انکار حقائق ہیں جن کے ساتھ سنی کا بھی واسطہ پڑتا ہے شیعہ کا بھی اور پہلی چاروں قسموں کو جائز سمجھنے میں شیعہ سنی کی تفریق نہ ہونے کی طرح آخری دو قسموں کو ناجائز سمجھنے میں بھی کوئی دورائے نہیں ہیں ایسے میں تقیہ کو شیعہ کے ساتھ خاص کہہ کر اہل سنت کے لیے شجرہ ممنوعہ مشہور کرنا حقائق سے منہ چھپانے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟

تقیہ کے حوالہ سے بلا تفریق مسلک شیعہ و سنی کے ان معروضی حالات کے علاوہ واجب، مستحب، مباح اور حرام جیسے احکام شرعیہ کی روشنی میں اس کی فقہی تفصیل بتانے سے شیعہ مفسرین و فقہاء کی طرح اسلاف اہلسنت بھی خاموش نہیں ہیں یہ الگ بات ہے کہ شیعہ اسلاف کو مسلمانوں کی سیاست پر مسلط شخصی تاجداروں کی مختلف ادوار حکومت میں تقیہ پر عمل کرنے کی زیادہ ضرورت و مجبوری اور حالات اضطرار کے ساتھ زیادہ دوچار ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی کتابوں میں مستقل باب کے تحت تقیہ

کے مواقع و جوب و استحباب اور مباح و حرام ہونے کو بالتفصیل ذکر کیا ہے، گزشتہ سطور میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ دولت شام و عراق کے چھ سو (600) سالوں پر محیط طویل دورانیہ اقتدار میں جس کثرت کے ساتھ شیعہ اسلاف کو مظالم کا نشانہ بنایا گیا ہے اگر اتنے مظالم اسلاف اہل سنت پر ڈھائے گئے ہوتے تو وہ بھی اپنی جان و مال اور عزت و آبرو اُن ظالموں سے بچانے کے لیے کثرت کے ساتھ تقیہ پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے اور اُن کی کتابوں میں بھی تقیہ کے یہ تمام تراکام و جوب سے لے کر مستحب تک اور مباح سے لے کر حرام تک کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہوتا۔ نیز تقیہ بطور شرعی حکم اہل سنت کے ہاں بھی ایسا ہی ناقابل انکار حقیقت مشہور ہوتی جیسے اہل تشیع کے ہاں مشہور ہے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے اہل سنت اسلاف کو کہ انہوں نے اس تفصیل سے بھی یکسر بے اعتنائی و بے التفاتی نہیں فرمائی بلکہ اُسی انداز سے تقیہ کے ان احکام شرعیہ کو بیان فرمایا ہے جس انداز سے فقہ جعفریہ میں موجود ہے۔ جیسے امام نظام الدین نساپوری نے اپنی تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان کی جلد 7، صفحہ 123، علی هامش جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری، مطبوعہ بیروت میں سورۃ نحل کی آیت نمبر 106 کی تفسیر کرنے کے بعد لکھا ہے؛

”وَمِنْهَا أَنْ يَجِبَ الْفِعْلُ الْمَكْرُوهَ عَلَيْهِ كَمَا لَوْ أُكْرِهَ عَلَى شُرْبِ الْخَمْرِ وَ أَكْلِ السَّمِيتَةِ لِمَا فِيهِ مِنْ صَوْنِ النَّفْسِ مَعَ عَدَمِ اضْطِرَارٍ بِالْغَيْرِ وَلَا إِهَانَةٍ لِحَقِّ اللَّهِ وَ مِنْهَا أَنْ يَصِيرَ الْفِعْلُ مَبَاحًا لَا وَاجِبًا كَمَا لَوْ أُكْرِهَ عَلَى التَّلَفُّظِ بِكَلِمَةِ الْكُفْرِ“

یعنی تقیہ کے مختلف احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کبھی وہ واجب ہوتا ہے جیسے کسی ظالم کی طرف سے شراب پینے اور مردار کھانے جیسے کسی ناجائز عمل پر مجبور کیے جانے کی صورت میں کیوں کہ ایسی صورتوں میں کسی اور کو نقصان پہنچانے یا اللہ تعالیٰ کے کسی حق کی توہین و ضیاع کے بغیر اپنی جان کو بچانا ہوتا ہے جو شریعت کی رو سے واجب ہے اور اُن میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ کبھی تقیہ کر کے اُس کام کو کرنا واجب نہیں بلکہ مباح ہوتا ہے جیسے دل میں ایمان کے

ساتھ اطمینان ہوتے ہوئے محض زبان سے کلمہ کفر کہہ کر اپنی جان بچانا جو شریعت کی رو سے مباح ہے۔

ان دونوں احکام کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

”وَمِنْهَا أَنَّهُ لَا يَجِبُ وَلَا يُبَاحُ بَلْ يَحْرُمُ كَمَا إِذَا أَكْرَهَ عَلَى قَتْلِ إِنْسَانٍ أَوْ عَلَى قَطْعِ عَضْوٍ مِنْ أَعْضَائِهِ“

یعنی تقیہ کے احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ نہ کبھی مباح ہوتا ہے نہ واجب بلکہ حرام ہوتا ہے جیسے کسی بے گناہ انسان کو قتل کرنے یا اس کے اعضاء میں سے کسی عضو کو کاٹنے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان و مال یا عزت و آبرو کو بچانے کے لیے تقیہ پر عمل کر کے ایسا کرنا شریعت کی رو سے حرام ہے۔

ہمارے اسلاف اہل سنت قدس سرہم القدسیہ کی طرف سے بیان شدہ ان تینوں احکام کی تفصیلی اور فقہی دلائل کی وضاحت بالترتیب اس طرح ہے۔

مدعا: شراب پینے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے تقیہ کرنا واجب ہے۔

صغریٰ: کیوں کہ اس میں کسی اور کو ضرر اور حق اللہ کی اہانت و ضیاع کے بغیر اپنی جان بچانا ہوتا ہے۔

کبریٰ: اور کسی کو ضرر اور حق اللہ کی اہانت و ضیاع کے بغیر اپنی جان بچانا ہمیشہ واجب ہوتا ہے۔ نتیجہ شرعی حکم: لہذا شراب پینے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے تقیہ کرنا واجب ہے۔

مدعا: کلمہ کفر بولنے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے تقیہ کرنا مباح ہے۔

صغریٰ: کیوں کہ اس میں ثواب ہے نہ عذاب۔

کبریٰ: ہر وہ عمل جس میں نہ ثواب ہو نہ عذاب وہ مباح ہوتا ہے۔

شرعی حکم و نتیجہ: لہذا کلمہ کفر بولنے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے تقیہ کرنا مباح ہے۔

مدعا: کسی بے گناہ انسان کو قتل کرنے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے تقیہ کرنا حرام ہے۔

صغریٰ: کیوں کہ یہ اپنے تحفظ کے لیے دوسرے بے گناہ کو نقصان پہنچانا ہے۔

کبریٰ: اور اپنے تحفظ کے لیے کسی اور بے گناہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

نتیجہ شرعی حکم: لہذا کسی بے گناہ انسان کو قتل کرنے پر مجبور کیے جانے کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے تقیہ کرنا حرام ہے۔

مدعا: تقیہ دنیوی مفاد کے لیے حرام ہے۔

صغریٰ: کیوں کہ وہ بغیر مجبوری کے ہے۔

کبریٰ: اور مجبوری کے بغیر تقیہ کی ہر شکل حرام ہے۔

شرعی حکم و نتیجہ: لہذا تقیہ دنیوی مفاد کے لیے حرام ہے۔

تقیہ کر کے دوسرے مسلک کے مسلمانوں کی مسجد کا امام بننا حرام ہے۔

کیوں کہ یہ دوسروں کی حق تلفی اور غدر ہے۔

جبکہ دوسروں کی حق تلفی و غدر والے تقیہ کی ہر شکل حرام ہے۔

لہذا تقیہ کر کے دوسروں کی مسجد کا امام بننا بھی حرام ہے۔

تقیہ کر کے سیاسی مفاد کے لیے اپنے عقیدہ سے خلاف کام کرنا حرام ہے۔

کیوں کہ یہ بغیر مجبوری کے ہے۔

جبکہ تقيہ کی ہر شکل بغیر مجبوری کے حرام ہے۔

لہذا تقيہ کر کے سیاسی مفاد کے لیے اپنے عقیدہ سے خلاف کام کرنا بھی حرام ہے۔

اسلاف کے کلام سے پیدا ہونے والے مغالطہ کا ازالہ:-

تقيہ کا شرعی حکم ہونے اور بلا تفریق ہر مسلمان کی ضرورت اور معمول بہ ہونے کے حوالہ سے ہماری اس تحقیق کے پیش نظر قارئین کے ذہنوں میں بعض اسلاف کی طرف سے تقيہ کی مذمت اور اُسے اہل نفاق کی علامت قرار دیئے جانے کی تصریحات کو دیکھ کر خلجان و تردد یا مغالطہ و اشتباہ کا پیدا ہونا ایک فطری بات ہے، بالخصوص اکابر پرستی کی تقلید جامد میں مبتلا تحقیق دشمن حضرات سے تو ہم یہ توقع ہی نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ بزرگان دین کی کتابوں میں تقيہ کو اہل نفاق کا شعار قرار دیئے جانے کی تصریحات کو پڑھنے اور دیکھنے کے بعد اُس کے جوازی پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے یا ان پاکیزہ ہستیوں کے کلام کا قابل فہم محل و مصداق معلوم کرنے کی کوشش کریں گے یا کم از کم اپنے گرد و پیش کے معروضی حالات کے ساتھ اُس کا موازنہ کرنے کی ضرورت محسوس فرمائیں گے۔

میں اپنے تجربہ کے مطابق اکابر پرستی کی تقلید جامد کے حصار میں محصور اور تحقیق مخالف حضرات سے یہ توقع ہرگز نہیں رکھتا بلکہ اس تحریر میں میرے مخاطب صرف اور صرف وہی حضرات ہیں جو مذہبی عصبيت کے پرستار ہونے اور ہر سمت سے اُڑنے والی ہواؤں کے تابع خس و خاشاک ہونے کی بجائے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہر بات کو حقائق کی روشنی میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ انصاف کو عصبيت پر ترجیح دیتے ہیں اور اسلاف کے اقوال کو نص شارح کی طرح قطعی و یقینی تصور کرنے کی بجائے حقائق کی روشنی میں دیکھ کر اُن کا صحیح محمل معلوم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرات ہماری اس تحقیق کو دیکھنے اور پڑھنے کے ساتھ ہمارے قابل قدر محسن مہربان اسلاف کی درجنوں کتابوں میں لکھی ہوئی اُن تصریحات کو جب بھی پیش نظر رکھیں گے جن میں تقيہ کو مسلمانوں کے لیے شجرہ ممنوعہ و حرام ہونا لکھا ہوا ہے تو فطری طور پر اُن کے دلوں میں تردد و دو جہتو کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے

بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نور اللہ مرقدہ الشریف کی مندرجہ ذیل عبارت ”نفسہ خصائص ادبائ نفاق است ولو اذمر اصحاب مکرو و خداع“ یعنی تقيہ کرنا منافقین کی صفت خاصہ اور مکرو فریب کرنے والوں کی صفت لازمہ ہے۔ (مکتوبات امام ربانی حصہ نور الخلائق مکتوب نمبر 36، دفتر 2، ص 83، مطبوعہ مکتبہ سعید لاہور) جیسی تصریحات پر نظر رکھنے والے متلاشیان حق کے دلوں میں خلجان محسوس ہونا عین تقاضا فطرت ہے کہ آغاز اسلام سے لے کر اب تک جو چیز سب کا یکساں معمول ہے، سب کی ضرورت ہے اور مجبوری کے مخصوص حالات میں جس کے بغیر کسی سنی کو معمول کی زندگی گزارنا ممکن ہے نہ شیعہ کو اُسے منافقین کی صفت خاصہ قرار دینے یا مکرو فریب کرنے والے اہل شقاق کا لازمہ کہہ کر مسلمانوں کے لیے شجرہ ممنوعہ بتانے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

ہماری رسائی فہم کے مطابق اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سمیت جملہ اہل سنت اسلاف قدس است اسرارہم القدسیہ کی کتابوں میں موجود اس قسم کی عبارات سے اُن کی واحد مراد تقيہ کی اُس قسم سے انکار کرنا ہے جو بلا تخصیص مسلک جملہ اہل اسلام کے نزدیک حرام ہے یعنی دنیوی مفاد کے حصول کے لیے اپنے عقیدہ و ضمیر کے خلاف کوئی کردار انجام دینا یا جان و مال، عزت و آبرو کے خوف و خطرہ سے بچنے کے لیے اسلام کے نقصان کا باعث بننے والے کسی کردار کا اپنے عقیدہ و ضمیر کے خلاف ارتکاب کرنا۔

اس توجیہ کی دلیل ہمارے نزدیک یہ بھی ہے کہ ان حضرات نے جہاں پر تقيہ کو ممنوع فی الاسلام قرار دیا ہے یا جہاں پر بھی تقيہ کرنے والوں کی مذمت کر کے انہیں معصیت کا ٹھہرایا ہے وہیں پر تقيہ کی اس ناجائز قسم کا اشارہ بھی دیا ہے۔ بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ الشریف کی مذکورہ عبارت (نفسہ از صفات ادبائ نفاق است) جیسی عبارات اس معنی پر صراحتاً دلالت کر رہی ہیں کیوں کہ اسلام کو نقصان سے بچانے کے مقابلہ میں اپنی جان و مال کو دشمن کے خطرہ سے بچانے والے یا دنیوی مفاد کے حصول کی خاطر اپنے عقیدہ کے خلاف عمل کرنے والے نفاق سے خالی نہیں

ہوتے چاہے کوئی انہیں منافق کہے یا نہ کہے، بہر تقدیر تقیہ کی یہ دونوں قسمیں منافقین کی صفت لازمہ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْقَهُونَ“ (۱)

یعنی امتحان کے مشکل وقت میں ذاتی مفادات کو اسلام پر ترجیح دینے والے یہ منافق تمہارے نہیں ہیں لیکن وہ دنیوی مفادات کی فوجی کا ہر وقت خوف محسوس کرتے ہیں۔

تقیہ کی ان دونوں حرام و ناجائز قسموں کا منافقین کا لازمہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے والے کسی بھی شخص کا تقیہ کی ان ناجائز قسموں میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرنا اور منافق ہونا ایک دوسرے کو ایسے ہی لازم و ملزوم ہیں جیسے صحیح مسلمان ہونا اور متقی پرہیز گار ہونا ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں، یعنی جیسے کسی بھی صحیح مومن مسلمان شخص سے تقویٰ کو پرہیز گاری جدا نہیں ہوتی اسی طرح منافق شخص سے بھی تقیہ کی یہ ناجائز قسمیں کبھی جدا نہیں ہوتیں۔

ان حقائق کی روشنی میں تقیہ کو مسلمانوں کے لیے ناجائز و حرام قرار دینے والے اسلاف کی مراد واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے صرف اور صرف تقیہ کی اُن اقسام کو ناجائز و ممنوع اور صفات اہل نفاق قرار دیا ہے جن کا ناجائز و حرام ہونا یقینی ہے، غیر متنازعہ اور کُل اہل اسلام کے مابین متفقہ ہے لیکن انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں میں اس حوالہ سے اجمال کی راہ اختیار کی ہے جس وجہ سے تقیہ کی تفصیلی اقسام و احکام سے ناواقف حال حضرات کو مغالطہ لگ جاتا ہے اور نفس تقیہ کو صفت اہل نفاق و ناجائز قرار دینے کا اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز اہل سنت اسلاف قدس سرار ہم اللہ سید کی کتابوں میں اس مسئلہ کو عام طور پر اہل تشیع حضرات کی طرف سے کچھ صحابہ کرام پر تقیہ کا الزام لگانے کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ جس تقیہ کو حضرت علیؓ عَزَّمُ اللہُ وَجْہُہُ الْکَرِیْمُ یا دوسرے صحابہ کرام و رضوان اللہ علیہم اجمعین یا اہل بیت نبوت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اسلام کے حق میں نقصان بلکہ متعدی

نقصان ہونے کی بنا پر ناجائز و حرام کے زمرہ میں شمار ہے، اہل شقاق و نفاق کا لازمہ ہے اور ممنوع فی الاسلام ہے جس کے ارتکاب کی توقع کسی بھی پروردہ نگاہ نبوت صحابی سے نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ واقف رموز اسرار شریعت، مزاج اسلام کے بنیاد اور پاسان قرآن و سنت اہل بیت نبوت اور حضرت علیؓ ص جیسی تبارک الدنیا فانی الاسلام شخصیت سے اس منافی اسلام گھٹیا حرکت کا تصور ہو سکے۔ جیسا کہ صاحب روح المعانی سید محمود بغدادی الوسی نے سورۃ آل عمران، آیت 28 کی تفسیر کرتے ہوئے اس مسئلہ کو چھیڑنے کے بعد بطور نتیجہ الکلام لکھا ہے:

”وَمِثْلُهُ لَا يَتَصَوَّرُ أَنْ يَأْتِيَ فَيُصَافِيهِ هَدْمُ الدِّينِ“ (۱)

یعنی حضرت علیؓ جیسی شخصیت کسی ایسے کام کا تصور بھی نہیں کر سکتی جس میں دین اسلام کا نقصان ہو۔

اہل انصاف جانتے ہیں کہ تقیہ کی جن جن صورتوں کو بلا تخصیص مسلک جملہ اہل اسلام نے جائز سمجھا ہے، معمول بد فی الاسلام جانا ہے اور ظالم کی طرف سے خوف و خطر کے وقت جان و مال، عزت و آبرو کو بچانے کے لیے یا اسلام کے کسی عظیم مفاد کی خاطر رخصت فی الاسلام ہونے کی تصریح کی ہیں اُن میں سے کوئی ایک صورت بھی ایسی نہیں ہے جس میں اسلام کا ذرہ برابر نقصان ہو، چہ جائیکہ اسلام کو ڈھانے کا تصور ہو سکے جبکہ ہمارے اہل سنت سلف صالحین کے یہ عظماء رحمہم اللہ صحابہ کرام کے دامن تقدس کو اُس تقیہ سے محفوظ بتا رہے ہیں جو اسلام کے حق میں نہ صرف نقصان بلکہ دین اسلام کو ڈھانے کے مترادف ہے۔ اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نَوَوِّ اللہُ مُؤَقَّدُہُ الشُّرُف کا مذکورہ حوالہ کلام بھی بے غبار ہے کیوں کہ انہوں نے بھی تقیہ کی اُن اقسام کی مذمت کی ہے جو صفت خاصہ منافقین ہیں، جو کسی سچے مومن مسلمان کا عمل نہیں ہو سکتی اور کسی شکل میں بھی مجوز و مَرْتَبُص فی الاسلام نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ حضرت مولیٰ علیؓ کا عمل ہو۔

حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات حصہ نور الخلائق، مکتوب نمبر 36 کے محولہ مذکورہ کلام کے سیاق و سباق کو دیکھنے والوں پر واضح ہوگا کہ انہوں نے جس تقیہ کی مذمت کر کے اُسے شانِ مسلم سے بعید قرار دیا ہے اُسے مندرجہ ذیل اوصافِ قبیحہ کے ساتھ یاد کیا ہے: صفتِ جہانت، مکر، خداع، نفاق، خاصہ اہل شقاق و نفاق (تو ظاہر ہے کہ یہ پانچوں اوصافِ قبیحہ تقیہ کی اُس قسم کے ساتھ خاص ہیں جو بلا تفریق مسلک جملہ اہل اسلام کے نزدیک ناجائز و حرام ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں کل مکاتب فکر مفسرین کرام کی عبارات کتب بقید جلد و صفحات ہمارے بیان کردہ حوالہ جات و تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے۔

خلاصہ جواب:- اہل سنت اسلاف کی کتابوں میں جس تقیہ کو مسلمانوں کے لیے ناجائز و حرام قرار دیا گیا ہے اُس کے جواز کا قائل اہل اسلام میں کوئی نہیں ہے اور تقیہ کے جن اقسام کو جملہ اہل اسلام کے اکابرین نے بلا اختلاف جائز سمجھا ہے یا قرآن و سنت سے ثابت ہیں انہیں اہل سنت کے کسی امام و مجتہد اور مفسر و محدث نے ناجائز و ممنوع نہیں کہا ہے، لہذا ہم اپنی فہم کے مطابق اسلاف اہل سنت کو تقیہ کی کسی بھی جائز صورت کے خلاف نہیں پاتے، نیز اہل تشیع علماء کی طرف سے حضرت علی ص سمیت دیگر اہل بیت اطہار و صحابہ کرام کی طرف منسوب تقیہ کے حوالہ سے اُن کے ساتھ اہل سنت کے اس اختلاف کو بھی نزاع لفظی کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے کیوں کہ تقیہ کی جن شکلوں کو ائمہ اہل سنت ناجائز و حرام سمجھتے ہیں شیعہ علماء بھی انہیں حرام سمجھتے ہیں ان کے ساتھ متفق ہیں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں شیعہ مفسرین کرام کی کتابوں میں بقید جلد و صفحات جن تصریحات کے حوالہ جات کو ہم بیان کر آئے ہیں اُن سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی طرح تقیہ کی جن شکلوں کو شیعہ علماء فقہی احکام کے مطابق جائز کہتے ہیں اہل سنت آئمہ بھی اُن کے ساتھ مکمل اتفاق رکھتے ہیں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ہمارے بیان کردہ حوالہ جات سے معلوم ہو رہا ہے۔ نیز تقیہ کی مذکورہ صدر جائز صورتوں کا خصوصیت مسلک سے قطع نظر سب کی ضرورت ہونے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی تقیہ پر عمل کیے بغیر کسی شیعہ کی عملی زندگی ممکن ہو سکتی

ہے نہ سنی کی، پھر یہ بھی ہے کہ تقیہ کے جواز اور رخصت فی الاسلام ہونے پر دلالت کرنے والی آیات و احادیث کی تفسیر و تفسیر میں بھی شیعہ سنی کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اس حوالہ سے بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ فریقین کے کچھ مسلمات و محققات کو اُن کی کتابوں سے نقل کر کے نذر قارئین کروں؛

سورۃ آل عمران، آیت 28 کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت قتادہ نے جان و مال، عزت و آبرو یا مذہبی نقصان کے خوف و خطر سے بچنے کے لیے ناموافق معاشرہ والوں کے ساتھ ظاہری رکھ رکھاؤ کرنے کے ساتھ کی ہے۔ ان حضرات کی اس تفسیر کو سنی و شیعہ مفسرین نے بلا اختلاف اپنی درجنوں کتابوں میں یکساں بیان کیا ہے۔ جیسے تفسیر البحر المحیط میں لکھا ہے؛

”قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ التَّقِيَةُ الْمَشَارُ إِلَيْهَا مُدَارَاةُ النَّاسِ ظَاهِرَةً“ (۱)

یعنی حضرت ابن عباس ص نے فرمایا ہے کہ آیت کریمہ (الْأَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُوا) میں جس تقیہ کی طرف اشارہ ہے اُس سے مراد مخالف لوگوں کے ساتھ ظاہری رکھ رکھاؤ کرنا ہے۔

اسی طرح حضرت قتادہ کا قول بھی اِن الفاظ میں نقل کیا؛

”وَقَالَ قَتَادَةُ إِذَا كَانَ الْكُفَّارُ غَالِبًا أَوْ يَكُونُ الْمُؤْمِنُونَ فِي قَوْمٍ كُفَّارٍ فَيَخَافُونَهُمْ فَلَهُمْ أَنْ يُحَالِفُوهُمْ وَيُدَارَوْهُمْ دَفْعًا لِلشَّرِّ وَقَلْبُهُمْ مُطْمَئِنُّ بِالْإِيمَانِ“ (۲)

یعنی جب غیر مسلموں کا مسلمانوں پر غلبہ ہو یا مسلمان کسی ایسی قوم میں رہتے ہوں جہاں پر اُن سے خائف و مغلوب ہوں تو دل میں ایمان قوی رکھتے ہوئے محض اُن کے شر سے بچنے کے لیے ان کے ساتھ دوستی اور ظاہری مدارات کرنا جائز ہوگا۔

حضرت ابن عباس و قتادہ کے اس قول کے مطابق تفسیر روح المعانی میں اُن تمام حدیثوں کو بھی بیان کیا

(۱) تفسیر البحر المحیط، ج 2، ص 423۔

(۲) تفسیر النہر الماد علی هامش البحر المحیط، ج 2، ص 425۔

گیا ہے جن سے تقیہ کا یہی معنی ثابت ہو رہا ہے۔ تفسیر روح المعانی کے بیان کردہ الفاظ ملاحظہ ہوں؛
وَعَدُّ قَوْمٍ مِنْ بَابِ التَّقِيَةِ مُدَارَاةُ الْكُفَّارِ وَالْفَسَقَةِ وَالظَّالِمَةِ وَالْأَنَّةُ الْكَلَامُ لَهُمْ وَ
التَّبَسُّمُ فِي وُجُوهِهِمْ وَالْانْبِسَاطُ مَعَهُمْ وَإِعْطَانُهُمْ لِكُفِّ أَذَاهُمْ وَقَطْعُ لِسَانِهِمْ وَ
صِيَانَةُ الْعِرْضِ مِنْهُمْ وَلَا يُعَدُّ ذَلِكَ مِنْ بَابِ الْمُوَالَاةِ الْمَنْهِي عَنْهَا بَلْ هِيَ
سُنَّةٌ وَأَمْرٌ مَشْرُوعٌ فَقَدْ رَوَى الدِّيلَمِيُّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى
أَمَرَنِي بِمُدَارَاةِ النَّاسِ كَمَا أَمَرَنِي بِإِقَامَةِ الْفَرَائِضِ وَفِي رِوَايَةٍ بُعِثْتُ بِالْمُدَارَاةِ
وَفِي الْجَمَاعِ سَيَاتِيكُمْ رَكْبٌ مُبْغَضُونَ فَإِذَا جَاؤَكُمْ فَارْحَبُوا بِهِمْ" وَرَوَى ابْنُ
أَبِي الدُّنْيَا: "رَأْسُ الْعَقْلِ بَعْدَ الْإِيمَانِ بِاللَّهِ تَعَالَى مُدَارَاةُ النَّاسِ" وَفِي رِوَايَةٍ
الْبَيْهَقِيُّ: "رَأْسُ الْعَقْلِ مُدَارَاةُ" وَآخِرُ جَرَجِ الطَّبْرَانِيِّ: "مُدَارَاةُ النَّاسِ صَدَقَةٌ" وَ
فِي رِوَايَةٍ لَهُ: "مَا وَقَى بِهِ الْمُؤْمِنُ عِرْضَهُ فَهُوَ صَدَقَةٌ" وَآخِرُ جَرَجِ ابْنِ عَدَى وَابْنِ
عَسَاكِرَ: "مَنْ عَاشَ مُدَارِيًّا مَاتَ شَهِيدًا قَوْا بِأَمْوَالِكُمْ أَعْرَاضَكُمْ وَلِيَصْنَعَ
أَخَذَكُمْ بِلِسَانِهِ عَنْ دِينِهِ" (۱)

ایک قوم نے کفار، فساق اور ظالموں کے خوف سے بچنے کے لیے ان کے ساتھ رکھ رکھاؤ
کرنے کو اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ کلام میں نرمی کرنے کو، اُن کے منہ پر مصنوعی
خوشی ظاہر کرنے کو، بے تکلفی کا برتاؤ کرنے کو، اُن کے ضرر سے بچنے، اُن کا منہ بند کرنے اور
اپنی عزت و آبرو کو اُن سے بچانے کے لیے انہیں کچھ دینے کو تقیہ کے باب میں شامل کیا ہے
اور اس کردار کو غیر مسلموں کے ساتھ موالاة و محبت میں نہیں شمارا جاسکتا ہے کیوں کہ کفار کے
ساتھ موالاة و محبت شریعت میں منہی و حرام ہے جبکہ یہ سب کچھ شریعت میں مامور بہ اور
مسنون ہیں اس لیے کہ محدث دہلوی نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ

(۱) تفسیر روح المعانی، ج ۳، ص ۱۲۲، مطبوعہ بیروت۔

ﷺ نے فرمایا ہے کہ "بیشک اللہ تعالیٰ نے جس طرح فرائض کو بجالانے کا مجھے امر کیا ہے اسی
طرح لوگوں کے ساتھ مداراة کرنے کا بھی مجھے امر کیا ہے۔" اور ایک روایت میں اس طرح
بھی آیا ہے کہ میں مداراة کرنے کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں یعنی مشکل حالات میں ظاہری
رکھ رکھاؤ کرنا میری شریعت کا ایک حکم ہے اور الجامع الصحیح (کتاب) میں یہ حدیث بھی مذکور
ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ:

"عنقریب تمہارے پاس ایک قابل نفرت قافلہ آئے گا جب وہ آجائے تو اُس کے ساتھ رکھ
رکھاؤ کر کے خوش آمدید کہو۔"

اور محدث ابن ابی الدنیا نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان
لانے کے بعد اصل عقلمندی لوگوں کے ساتھ مداراة کرنا ہے اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ
اصل عقلمندی لوگوں کے ساتھ مداراة کرنا ہے۔ اور محدث طبرانی نے یہ حدیث تخریج کی ہے کہ
لوگوں کے ساتھ رکھ رکھاؤ کرنا صدقہ کا ثواب رکھتا ہے اور طبرانی کی ایک روایت میں یہ
حدیث بھی ہے کہ مومن مسلمان جس طریقہ سے بھی اپنی عزت و آبرو کو بچالے وہ اُس کے لیے
صدقہ کا ثواب رکھتا ہے۔ اور محدث ابن عدی و محدث ابن عساکر نے اپنی اپنی کتابوں میں
اس حدیث کی بھی تخریج کی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان بھی نامساعد معاشرہ
میں رکھ رکھاؤ کرتے ہوئے مرا تو وہ شہید مرا۔ تم اپنے مالوں کے ذریعہ اپنی عزت و آبرو بچالیا
کر اور تم میں سے کوئی بھی خوف و خطرہ کے وقت زبان کے ظاہری مدارت کے ذریعے اپنا
دین بچالیا کرے۔

اس پوری عبارت پر غور کرنے والے حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ صاحب روح المعانی نے یہاں پر
حضرت ابن عباس وقادہ کے اس قول کو نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ "وَعَدُّ قَوْمٍ مِنْ بَابِ
التَّقِيَةِ" سے لے کر "وَصِيَانَةُ الْعِرْضِ مِنْهُمْ" تک اس کی کچھ تفصیلات بتانے کے بعد "وَلَا يُعَدُّ

ذلک من باب الموالاة المنہی عنہ“ سے لے کر آخر تک اسکے مامور بہ فی الشرع اور اسلامی احکام کے زمرہ میں ایک مسنون حکم ہونے کے ساتھ تصریح کر کے متعدد حدیثوں کو بھی اس کے ثبوت کے لیے بیان کیا۔

تقیہ کے مذکورہ معنی میں شروع فی الدین ہونے پر متعدد حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

”وَلَا تَنْبَغِي الْمُدَارَاةُ إِلَىٰ حَيْثُ يَخْدِشُ الدِّينَ وَيُوتِكَبُ الْمُنْكَرُ وَتَسْبِيُ الظُّنُونُ“ اُس جگہ میں مداراة کے معنی میں تقیہ جائز نہیں ہو سکتا جہاں پر دین اسلام کو نقصان پہنچے اور گناہ کا ارتکاب کیا جائے اور دین اسلام سے متعلق لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات اور بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

اہل سنت مفسرین و محدثین کی ان تصریحات کو دیکھنے کے ساتھ شیعہ محدثین و مفسرین کی تصریحات کو بھی دیکھا جائے تو تقیہ کی شرعی حیثیت کے تعین کی بابت فریقین میں ذرہ برابر فرق محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ سورۃ آل عمران، کی آیت نمبر 28 ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کی ابن عباس والی تفسیر کو شیعہ علماء بھی اُسی طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح علماء اہل سنت تسلیم کرتے ہیں اور اس تفسیر کے مطابق مداراة کی حقیقت و تشریح شیعہ کے نزدیک بھی وہی ہے جو اہل سنت کے نزدیک ہے اور شیعہ علماء بھی تقیہ بمعنی مداراة کی اُن ہی قسموں کو جائز سمجھتے ہیں جن کو علماء اہل سنت نے جائز سمجھا ہے اور جن قسموں کو وہ ناجائز و حرام کہتے ہیں انہیں یہ بھی حرام ہی کہتے ہیں، جیسے اثناء عشری شیعہ مفسر محمد جواد مغنیہ نے التفسیر الکاشف میں لکھا ہے:

”قَدْ يَسُوغُ لِلْإِنْسَانِ تَرْكُ الْعَمَلِ بِالْحَقِّ دَفْعًا لِلضَّرَرِ عَنْ نَفْسِهِ أَمَّا تَخْوِيفُ الدِّينِ بِالْكَذِبِ عَلَى اللَّهِ فَلَا مَبْرَرَ لَهُ عَلَى الْإِطْلَاقِ مَهْمَا تَكُنِ النَّاتِجُ“ (۱) اپنے سے ضرر کو دفع کرنے کے لیے کبھی انسان کو جائز ہوتا ہے کہ حق پر عمل کرنا ترک کر دے

(۱) التفسیر الکاشف، ج 3، ص 423، مطبوعہ بیروت۔

لیکن دشمن کے ضرر سے بچنے کے لیے جھوٹا کردار انجام دے کر دین کو نقصان پہنچانے کا جواز قطعاً نہیں ہے چاہے نتائج جو بھی نکلے۔

اسی طرح تقیہ کی تعریف و اقسام اور فقہی احکام کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

”وَحُلَاصَةُ مَا قَالُوهُ: إِنَّهَا تَجُوزُ لِرَفْعِ الضَّرَرِ عَنِ النَّفْسِ وَلَا تَجُوزُ لِحُلْبِ الْمُنْفَعَةِ وَلَا لِادْخَالِ الضَّرَرِ عَلَى الْغَيْرِ“ (۱)

یعنی تقیہ جعفریہ کے مفسرین و محدثین نے تقیہ کی شرعی حیثیت کے متعلق جتنا جو کچھ بھی کہا ہے اُن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ضرر کو دفع کرنے کے لیے تو جائز ہے لیکن دنیوی فائدہ کے حصول کے لیے اور کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے جائز نہیں ہے۔

علماء اہل تشیع کی ان تصریحات کا علماء اہل سنت کی مذکورہ صدر عبارات کے ساتھ موازنہ کرنے سے اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ تقیہ کی جو شکلیں ناجائز و حرام ہیں وہ فریقین کے نزدیک حرام ہیں اور جو صورتیں جائز ہیں وہ سب کے نزدیک جائز ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابن عباس و قتادہ سے تقیہ کی تفسیر بمعنی ”مداراة“ جو منقول ہے اُس کی بھی جوازی اور عدم جوازی دونوں احکام پر سب کا عمل یکساں ہے اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابن عباس و قتادہ سے سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کی جو تفسیر منقول ہے وہ سب کے نزدیک معتبر ہے، سب کی تصریحات کے مطابق ہے اور سب کی عملی زندگی کا حصہ ہے۔

ایک متوقع اشتباہ کا ازالہ :-

یہاں پر شاید قاریوں کو اس بات کا اشتباہ ہو سکے کہ حضرت ابن عباس نے سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کی تفسیر مداراة کے ساتھ کی ہے اور مداراة لوگوں کے ساتھ نرم گفتاری و نرم رویے کے ساتھ پیش آنے کا نام ہے جس میں خوف و خطر کا ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ تقیہ میں

(۱) التفسیر الکاشف، ج 2، ص 44، مطبوعہ بیروت۔

خوف و خطرہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے تو پھر فریقین کے نزدیک اس تفسیر کے مسئلہ ہونے سے تقیہ کا مسئلہ ہونا کہاں لازم آتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ قول و عمل میں مدارا کرنے میں خوف و خطرہ کا ہونا ضروری نہیں ہے تو نہ ہونا بھی ضروری نہیں ہے، لہذا اس کی بعض صورتوں میں خوف و خطرہ موجود ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں نہیں ہوتا۔ جن صورتوں میں ہوتا ہے اُن سب پر تقیہ کی تعریف بھی صادق آتی ہے، جیسا کہ روح المعانی، جلد 3، صفحہ 128 کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہو رہا ہے، ورنہ صاحب روح المعانی ”وَعَدَّ قَوْمٌ مِنْ بَابِ التَّقِيَّةِ مُدَارَاةَ الْكُفَّارِ وَالْفُسْقَةِ وَالظُّلْمَةِ وَالْاِنَّةَ الْكَلَامِ لَهُمْ وَالتَّبَسُّمَ فِي وُجُوهِهِمْ وَالْاِنْبِسَاطَ مَعَهُمْ“ (الی آخرہ) مدارا کے متعدد صورتوں کو بیان کرنے کے بعد اُن کا مندرجہ تحت تقیہ ہونے پر مذکورہ حدیثوں کو کبھی ذکر نہ کرتے۔

نیز مدارا کی بعض قسمیں تقیہ میں شمار نہ ہوتیں تو تفسیر (النہر الماد) والے حضرت ابن عباس و قتادہ کی تفسیر نقل کرتے ہوئے ”وَيُدَارُوهُمْ دَفْعًا لِلشَّرِّ وَقَلْبُهُمْ مُطْمَئِنِّ بِالْاِيْمَانِ“ نہ کہتے البتہ ان دونوں لفظوں کے لغوی معنوں کے مابین فرق ہے جس کی رو سے بعض صورتوں میں یکجا بھی ہو جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس و قتادہ کے مطابق تقیہ بمعنی مدارا کی یہی اجتماعی صورت مراد ہے۔ اسی وجہ سے ”فیض الباری شرح صحیح البخاری میں قاضی ابوبکر ابن عربی کے حوالہ سے مدارا و مداہنت کے مابین فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”الْمُدَارَاةُ هُوَ الْاِنْبِسَاطُ وَطَلَاقَةُ الْوُجُوهِ مَعَ تَحْفِظِ دِيْنِهِ وَالْمُدَاهَنَةُ هُوَ الْاِنْبِسَاطُ مَعَ ضِيَاعِ دِيْنِهِ“ (۱)

یعنی مدارا کا مطلب یہ ہے کہ اپنا دین و مذہب بچاتے ہوئے مخالف کے ساتھ خوش روئی کا معاملہ کیا جائے اور مداہنت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دین و مذہب کو مخالف کے رنگ میں

(۱) فیض الباری، ج 4، ص 395۔

ضائع کر کے اُس کے ساتھ خوش روئی کا معاملہ کیا جائے۔

مسلمانوں کی طرف سے کسی مخالف کے ساتھ مدارا کرنے کے مفہوم میں خوف و خطرہ سے بچنے کا عنصر موجود ہونے کی بنیاد پر فتح الباری شرح صحیح البخاری میں کہا گیا ہے:

”المداراة مندوب اليها والمداهنة مُحَرَّمَةٌ“ (۱)

یعنی مدارا کرنا مستحب و مأمور بہ ہے جبکہ مداہنت حرام و ممنوع ہے۔

گویا مداہنت تقیہ کی ناجائز و حرام صورتوں میں شمار ہے کیوں کہ اُس میں دین و مذہب کا نقصان ہے، ایمان کو خطرہ ہے اور وہ منافقت کی علامت و خاصہ ہے جبکہ مدارا تقیہ کی جائز و مستحسن صورتوں میں شمار ہے کیوں کہ اس میں دین و مذہب کا بچاؤ ہوتا ہے، امر شرعی پر عمل ہوتا ہے اور اسلام کا کوئی نقصان ہوتا ہے نہ اپنا، خالق کی کسی قسم کی حق تلفی ہوتی ہے نہ کسی مخلوق کی۔ ایسے میں مدارا کی تمام جائز صورتوں پر تقیہ کی تمام جائز صورتیں صادق آتی ہیں اور اُس کی ناجائز صورتوں پر تقیہ کی بھی تمام ناجائز صورتیں صادق آتی ہیں، لہذا جو جائز ہے وہ سب کے نزدیک جائز ہے اور جو ناجائز ہے وہ بھی سب کے نزدیک ناجائز ہے۔

تقیہ کے جواز اور مخصوص حالات میں اُس کے رخصت فی الاسلام ہونے پر دلالت کرنے والی دونوں آیات یعنی سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 اور سورۃ نحل آیت نمبر 106 کی ترکیب و تشریح کرنے میں بھی شیعہ و سنی مفسرین کی کوئی تفریق نہیں ہے جیسے اُن کی کتب تفسیر سے گزشتہ صفحات میں ہماری طرف سے بتقدیم جلدات و صفحات بیان کردہ حوالہ جات سے واضح ہو چکا ہے۔

مثال کے طور پر سورۃ آل عمران آیت نمبر 28 کی غیر متنازعہ تراکیب نحویہ میں سے ایک یہ ہے کہ ”اَلَا اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کا تعلق ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرِيْنَ اَوْلِيَاءَ“ کے ساتھ ہو، ”اَنْ تَتَّقُوا“ کا معنی خوف کرنا ہو، ”تُقَاةً“ مصدر من غیر لفظ فعلہ ہے اور منصوب بنا بر مفعولیت مفعول

(۱) فتح الباری، ج 10، ص 527۔

ہے جس کا حاصل معنی مایعوب اِتقاء ہے یعنی ہر وہ چیز جس سے بچنا واجب ہے اور مستثنیٰ مفرغ ہے یعنی مستثنیٰ منہ میں عموم اوقات ہے۔

اس ترکیب کے مطابق آیت کریمہ سے معنی مرادی اس طرح ہوگا کہ اہل ایمان کسی بھی وقت غیر مسلموں کے ساتھ موالاۃ نہ کریں مگر اُن کی طرف سے کسی ایسی چیز کا خوف لاحق ہوتے وقت جس سے بچنا واجب ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس معنی کے مطابق بلا تفریق مسلک جملہ مفسرین کرام کے نزدیک ”تقاء“ کا مظہر جان و مال، عزت و آبرو، اسلامی مفاد و عقیدہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ کسی جابر و ظالم کی جانب سے ان میں سے کسی کے ضیاع کا خوف لاحق ہونے کی صورت میں اُس کے ساتھ ظاہری موالاۃ کا اظہار کر کے ان کو بچانا جائز ہے جو حسب مواقع کبھی واجب کبھی مستحب اور کبھی مباح ہوتا ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں ہم بذرا قارئین کر آئے ہیں۔

اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ شریعت کی زبان میں تقیہ کی حقیقت بھی اس سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔ لہذا آیت کریمہ کی اس ترکیب نحوی کا شیعہ سنی کے مابین غیر متنازعہ ہونے کے باوجود تقیہ کو متنازعہ بنا کر شیعہ کے ساتھ خاص اور اہل سنت کے لیے شجرہ ممنوعہ مشہور کرنا قابل فہم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو تعصب سے بچنے اور حقائق کی روشنی میں مسائل کو سمجھنے کی توفیق دے۔

دوسری ترکیب:- اس میں پہلی ترکیب کے ساتھ جملہ تفصیلات مذکورہ میں اتحاد و اشتراک ہونے کے باوجود فرق صرف لفظ ”تقاء“ میں ہے کہ یہ منصوب بنا بر مفعول مطلق ہے اس ترکیب کے مطابق آیت کریمہ کے معنی اس طرح ہوں گے کہ اہل ایمان کسی بھی وقت غیر مسلموں کے ساتھ موالاۃ نہ کریں مگر اُن کی طرف سے سچ گچ خوف لاحق ہوتے وقت کہ ایسے وقت میں محض ظاہری موالاۃ کا اظہار کر کے اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہبی مفاد اور عقیدہ کو بچانا جائز ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس ترکیب اور اس کے مطابق معنی مرادی کے متفقہ ہونے کے بعد بھی تقیہ کے جواز کو شیعہ کا مذہبی خاصہ قرار دے کر اہل سنت کے لیے ممنوع ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ کاش اس معکوسی تبلیغ پر نظر ثانی کرنے کی توفیق

ہمارے حضرات کو نصیب ہو جائے۔ ایمان کا تقضیہ نہیں ہے کہ کرید کشید کر کے اختلاف پیدا کیا جائے بلکہ توحید کلمہ کی فرضیت کا تقضیہ ہے کہ حتی المقدور اختلاف سے بچنے کی کوشش ہو۔

تیسری ترکیب:- ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کا تعلق ”وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ“ کے ساتھ ہوا اس کے علاوہ تمام مذکورہ تفصیلات ترکیب اول کی طرح ہی ہیں اس کے مطابق آیت کریمہ کے معنی اس طرح ہوں گے کہ جس نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ موالاۃ کی تو وہ کسی وقت بھی اللہ کے قرب و محبت کا لائق نہیں ہو سکتا مگر غیر مسلموں کی طرف سے کسی ایسی چیز کا خوف لاحق ہوتے وقت جس سے بچنا واجب ہے۔

چوتھی ترکیب:- اس میں تیسری ترکیب کی مذکورہ جملہ تفصیلات کے ساتھ اتحاد و اشتراک ہونے کے باوجود فرق صرف ”تُقَاةً“ کی حقیقت اور اس کے منصوب ہونے کی نوعیت میں ہے کہ یہ مصدر اور مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس ترکیب کے مطابق آیت کریمہ کے معنی یہ ہوں گے کہ جس نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ موالاۃ کی تو وہ کسی وقت بھی اللہ کے قرب و محبت کا لائق نہیں ہو سکتا مگر غیر مسلموں کی طرف سے سچ گچ خوف لاحق ہوتے وقت کہ ایسے وقت میں محض ظاہری موالاۃ کا اظہار کر کے اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب و عقیدہ کو بچانا جائز ہے۔

پہلی دو ترکیبوں میں شیعہ سنی کی عدم تفریق تقیہ کے جواز میں بھی اُن کے عدم تفریق کو مستلزم ہونے کی طرح ان دونوں ترکیبوں کا فریقین کے مابین مسئلہ ہونا بھی تقیہ کے جواز میں عدم تفریق کو مستلزم ہے اس کے باوجود تقیہ کو شیعہ کا خاصہ قرار دے کر اہل سنت کے نزدیک ناجائز ہونے کے تاثر دینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ یہ تو آیت کریمہ کی بنیادی ترکیبوں کا حال ہے کہ خالصتاً لغت و بلاغت اور فصاحت و نحو کا مسئلہ ہونے کی وجہ سے ہر دو فریقوں کے لیے یکساں قابل تسلیم ہیں تو ظاہر ہے کہ کسی بھی کلام کا ترکیبی معنی ہی اُس کے متکلم کا معنی مرادی ہوتا ہے بالفاظ دیگر معنی مرادی متکلم معنی ترکیبی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتا۔ لہذا آیت کریمہ کی ان بنیادی ترکیبوں سے اللہ تعالیٰ کی جو مراد بطور

منطوق الکلام معلوم ہو رہی ہے اُس کا تقیہ کے جواز پر صریح دلیل ہونا ہمارے حضرات کو دعوتِ فکر دے رہا ہے کہ وہ اپنے موقف پر نظر ثانی کریں تاکہ ایک منصوبی حکم سے انکار کرنے کے گناہ سے بچ سکیں۔ اس کے علاوہ مجھے ان علماء کرام پر تعجب ہو رہا ہے جو سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 کے تحت تفسیر بیضاوی و جلالین جیسی شامل درس اور ہر مدرسہ میں پڑھائی جانے والی تفسیروں میں بھی بالترتیب لکھی ہوئی ان عبارات کے برعکس تبلیغ کیوں کر رہے ہیں؟

جیسے بیضاوی میں ہے:

”مُنْعٍ مِنْ مَوَالِيهِمْ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا فِي الْأَوْقَاتِ كُلِّهَا إِلَّا وَقْتُ الْمَخَافَةِ فَإِنْ أَظْهَرَ الْمَوَالِيَةَ حِينَئِذٍ جَائِزٌ كَمَا قَالَ عَيْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ كُنْ وَسَطًا وَامْشِ جَانِبًا“

غیر مسلموں کے ساتھ موالاة کرنے سے ظاہر و باطن میں ہر وقت منع کیا گیا ہے مگر اُن کی طرف سے خوف لاحق ہوتے وقت کیوں کہ ایسے وقت میں اُن کے ساتھ ظاہری طور پر موالاة کا اظہار کرنا جائز ہے جیسے حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ ناموافق معاشرہ میں بظاہر اُن کا ساتھ دیں اور حقیقت میں اُن کے کردار سے کنارہ کش رہو۔

جلالین میں ہے:

”أَيُّ تَخَافُوا مَخَافَةً فَلَكُمْ مَوَالِيَهُمْ بِاللِّسَانِ دُونَ الْقَلْبِ وَهَذَا قَبْلَ عِزَّةِ الْإِسْلَامِ وَيَجْرِي فِي بَلَدٍ لَيْسَ قَوِيًّا فِيهَا“

ظالموں کی طرف سے کچھ خوف لاحق ہونے کی صورت میں تمہارے لیے اُن کے ساتھ قلبی محبت کے بغیر محض زبانی موالاة کا اظہار کرنا جائز ہے اور تقیہ کی یہ صورت اسلام کا غلبہ پانے سے قبل معمول بہ تھی۔ اب بھی کسی خطہ میں اگر کوئی مسلمان اہل باطل کے مقابلہ میں ضعیف ہو تو اُس کے لیے بھی یہ حکم جاری رہتا ہے۔

تقیہ کا شرعی حکم ہونا اگرچہ ہمارے اہل سنت کے چاروں مذاہب کی تفسیروں میں لکھا ہوا ہے جیسے گزشتہ صفحات میں ہماری بیان کردہ تفصیل وحوالہ جات سے واضح ہو چکا ہے تاہم غیر درسی کتابوں تک ہر وقت ہر شخص کی رسائی نہیں ہوتی لیکن درسیات کا پڑھنا اور پڑھانا ہر عالم و متعلم کی ضرورت ہونے کی وجہ سے کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ ایسے میں تقیہ کے غیر متنازعہ حکم شرعی کو خواہ مخواہ متنازعہ بنانا اور اُسے مذہبِ شیعہ کہہ کر اہلسنت کے لیے شجرہ ممنوعہ قرار دینا مذہبی عنصیت کی آلودگی سے محفوظ حضرات کے لیے باعثِ تعجب نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ درسی تفسیروں کے علاوہ درس نظامی کے نصاب میں شامل اور ہر دینی مدرسہ میں پڑھی اور پڑھائی جانے والی کتبِ احادیث کی مندرجہ ذیل روایات کو پڑھنے اور پڑھانے والے حضرات پر بھی ہمیں تعجب ہو رہا ہے کہ تقیہ کے شرعی حکم ہونے پر دلالت کرنے والی ان واضح روایات اور صحابہ کرام کے اس ناقابلِ انکار عمل سے ہمارے یہ حضرات کیوں انکار کر رہے ہیں۔

بخاری شریف میں موجود حدیث نبوی ﷺ ”لَوْ لَا خِدَاةُ قَوْمِكَ بِالْكَفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ ثُمَّ لَبَيْتُهُ عَلَى أَسَاسِ إِبْرَاهِيمَ“ (بخاری شریف، ج 1، کتاب المناسک ص 215) کو پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے یہ حضرات کیا تصور کرتے ہوں گے؟ کیا مصلحت پسندی یا کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے حکمتِ کاری کہنے سے حقائق تبدیل ہو سکتے ہیں؟ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض حضرات دوسروں میں تقیہ والا ایسا کردار دیکھ کر اسے منافقت کہتے ہیں جب خود ایسا کرتے ہیں تو اسے مصلحت، برداشت اور گزراہ جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ تقیہ سے خالی نہیں ہے چاہے جائز ہو یا ناجائز۔ بہر حال اہل سنت کہلانے والے طبقوں میں اسے اصل نام سے یعنی تقیہ سے یاد کرنے سے جھجک محسوس کرتے ہیں اور شرماتے ہیں جیسا ہندو عورت خاوند کا نام لینے سے شرماتی ہے۔

اسی طرح بخاری شریف میں موجود حضرت ابو ہریرہؓ کے فرمان ”حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَعَائِنَ فَأَمَّا أَخَذَهُمَا فَبَيْتُهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَيْتُهُ قُطِعَ هَذَا الْبُلْعُومُ“ (بخاری شریف، ج 1، کتاب العلم ص 62) کو پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے کیا سوچتے ہوں گے؟ جبکہ اکثر شارحین

حدیث نے اس کے مضمون کو حضرت ابو ہریرہ ص کا عمل بالقیہ پر محمول ہونے کے ساتھ تصریح کی ہیں جیسے شارح قسطلانی، عینی، فتح الباری، کرمانی وغیرہ میں صراحتاً لکھا ہوا موجود ہے۔ مثلاً نمونہ از خروارے فتح الباری کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

”وَحَمَلَ الْعُلَمَاءُ الْوِعَاءَ الَّذِي لَمْ يَنْتَه عَلَى الْإِحَادِيثِ الَّتِي فِيهَا تَبَيَّنُ أَسَامِي أُمَرَاءِ السُّوءِ وَأَحْوَالُهُمْ وَزَمَنُهُمْ وَقَدْ كَانَ أَبُو هُرَيْرَةَ يُكْنَى عَنْ بَعْضِهِ وَلَا يُصْرَحُ بِهِ خَوْفًا عَلَى نَفْسِهِ مِنْهُمْ كَقَوْلِهِ أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ رَأْسِ السَّيِّئِ وَإِمَارَةِ الصَّبِيَّانِ يُشِيرُ إِلَى خِلَافَةِ يَزِيدَ بْنِ مَعَاوِيَةَ لِأَنَّهُمَا كَانَتَا سَنَتَيْنِ مِنَ الْمُهْجَرَةِ وَاسْتِجَابَ اللَّهُ دُعَاءَ أَبِي هُرَيْرَةَ فَمَاتَ قَبْلَهُمَا بِسَنَةٍ“ (۱)

حضرت ابو ہریرہ ص نے علم کے جس حصے کو لوگوں میں نہیں پھیلا یا علماء کرام نے اُسے اُن احادیث پر محمول سمجھا ہے جن میں گمراہ بادشاہوں اور اُن کے حالات و تاریخوں کا بیان تھا اور حضرت ابو ہریرہ ص کبھی کبھی اُن میں سے بعض کا کنایہ ذکر کیا کرتے تھے اور اُن ظالموں کی جانب سے اپنی جان پر خوف محسوس کر نیکی وجہ سے صراحتاً بیان نہیں کرتے تھے جیسے کہا کرتے تھے میں ساٹھویں سن ہجری کے آغاز سے اور بچوں کی حکمرانی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، اس سے وہ یزید ابن معاویہ کی حکمرانی کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے اس لیے کہ ساٹھویں سن ہجری کے آغاز سے اُس کی منحوس حکمرانی وجود میں آئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ابو ہریرہ ص کی اس دعا کو قبول فرما کر ساٹھویں سن ہجری سے ایک سال پہلے ہی اُنہیں وفات دی۔

یعنی شرح بخاری میں ہے:

”وَكَانَ أَبُو هُرَيْرَةَ يَقُولُ لَوْ شِئْتُ أَنْ أَسْمِيَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَخَشِئْتُ عَلَى نَفْسِي فَلَمْ يَصْرَحْ وَكَذَلِكَ يَنْبَغِي لِكُلِّ مَنْ أَمَرَ بِمَعْرُوفٍ إِذَا خَافَ عَلَى نَفْسِهِ فِي

(۱) فتح الباری، ج ۱، ص ۱۶، مطبوعہ بیروت۔

النَّصْرِ يُحِ أَنْ يُعْرَضَ“ (۱)

یعنی حضرت ابو ہریرہ ص کہا کرتے تھے کہ اگر ان لوگوں سے مجھے اپنی جان کا خوف نہ ہوتا تو میں اُن کا نام تمہیں بتا دیتا تو ابو ہریرہ ص خوف کی وجہ سے اُن کے ناموں کے ساتھ تصریح نہیں کی۔ اسی طرح ہر مبلغ کو چاہئے کہ جب ظالموں کی طرف سے اپنی جان کا خوف محسوس کریں تو تعریض و کنایات سے کام لے۔

فتح الباری شرح صحیح البخاری میں حضرت ابو ہریرہ ص کی مذکورہ روایت کی خود اُن ہی کی طرف سے بیان شدہ تشریح و تفسیر کو اور جن حالات کی وجہ سے صحابہ کرام تقیہ پر عمل کرنے پر مجبور تھے اُنہیں خود اُن ہی کے مندرجہ ذیل الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ إِمَارَةِ الصَّبِيَّانِ قَالُوا أَوْ مَا إِمَارَةُ الصَّبِيَّانِ؟ قَالَ إِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ هَلَكْتُمْ أَيْ فِي دِينِكُمْ وَإِنْ عَصَيْتُمُوهُمْ أَهْلَكُوكُمْ أَيْ فِي دُنْيَاكُمْ بِإِذْهَابِ النَّفْسِ أَوْ بِإِذْهَابِ الْمَالِ أَوْ بِهَمَا“ (۲)

حضرت ابو ہریرہ ص نے کہا بچوں کی حکمرانی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اُن کے سامعین نے پوچھا کہ بچوں کی حکمرانی کیا چیز ہے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ وہ ایسا غیر اسلامی کردار ہے کہ اگر تم اُن کا ساتھ دو گے تو تمہارا دین خراب ہوگا اور اگر تم اُن کا ساتھ نہ دو گے تو وہ تمہیں ستا کر ہلاک کریں گے یا تمہارے مال و جائیدادوں کی تباہی کریں گے یا جانی و مالی ہر دو مصیبتیں تم پر ڈھائیں گے۔

مذہبی تعصب سے پاک ذہن رکھنے والے حضرات بخاری شریف کی اس روایت اور اُس کے شارحین و محدثین کی ان تصریحات کو پڑھنے کے بعد ظالموں کی طرف سے جان و مال کو خطرہ لاحق

(۱) عینی شرح بخاری، ج ۲، ص ۱۸۵، مطبوعہ بیروت۔

(۲) فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج ۱۳، ص ۱۰۔

ہونے یا اعتقادی و مذہبی نقصان پہنچائے جانے کے خوف کے وقت حضرت ابو ہریرہ کا عمل بالتقیہ کرنے میں ذرہ برابر شک نہیں کر سکتے ہیں کہ انہوں نے صرف اور صرف کج کلام یا بنو امیہ کے خوف کی وجہ سے حدیث بیانی سے اجتناب اختیار کیا تھا۔ اسی طرح ایک اور صحابی حضرت ابو الدرداء ص کا تقیہ کرنا بخاری شریف میں مذکور ہے انہوں نے فرمایا:

”إِنَّا لَنَكْشِرُ فِي وُجُوهِ أَقْوَامٍ وَإِنَّ قُلُوبَنَا لَتَلْعَنُهُمْ“ (۱)

ہم کچھ ناپسندیدہ لوگوں کے منہ پر ہستے ہیں جبکہ ہمارے دل اُن پر لعنت کرتے ہیں۔

امام بخاری کا حضرت ابو الدرداء ص کے اس کردار کو لوگوں کے ساتھ مدارا کرنے کے باب میں بطور تعلیق بیان کرنا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اُن کی نگاہ میں بھی حضرت ابو الدرداء کا یہ عمل مدارا یعنی لوگوں کے ساتھ رکھ رکھاؤ کرنے کی اُن صورتوں میں شامل ہے جن پر تقیہ کی تعریف صادق آتی ہے۔ جیسے حضرت عبداللہ ابن عباس ص نے فرمایا ہے:

”التَّقِيَّةُ الْمَشَارِ إِلَيْهَا مَدَارَاةُ النَّاسِ ظَاهِرَةٌ“

یعنی سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 میں جس تقیہ کے جواز کا اشارہ دیا گیا ہے اُس سے مراد ناموافق لوگوں کے خوف سے بچنے کے لیے اُن کے ساتھ ظاہری مدارا کرنا ہے۔

حضرت ابو الدرداء ص جیسے جلیل القدر صحابہ کرام کے اس تقیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض اسلاف اہل سنت نے مدارا کی بعض صورتوں کا عین تقیہ ہونے کے ساتھ تصریح کی ہیں۔ جیسے تفسیر روح المعانی میں ہے:

”وَعَدُّ قَوْمٍ مِنْ بَابِ التَّقِيَّةِ مَدَارَاةُ الْكُفَّارِ وَالْفَاسِقَةِ وَالظَّالِمَةِ وَالْأَنَةِ الْكَلَامِ لَهُمْ وَالتَّبَسُّمُ فِي وُجُوهِهِمْ وَالْإِنْبِسَاطُ مَعَهُمْ وَإِعْطَانُهُمْ لِكُفِّ أَذَاهُمْ وَقَطْعُ لِسَانِهِمْ وَصِيَانَةُ الْعَرَضِ مِنْهُمْ وَلَا يُعَدُّ ذَلِكَ مِنْ بَابِ الْمَوَالَاةِ الْمَنْهَى عَنْهَا بَلْ هِيَ

(۱) بخاری شریف، ج 2، ص 905، مطبوعہ سعید کمپنی کراچی۔

سُنَّةٌ وَأَمْرٌ مَشْرُوعٌ“ (۱)

اہل سنت کے کچھ اسلاف نے کفار، فساق اور ظالموں کے خوف سے بچنے کے لیے اُن کے ساتھ ظاہری مدارا کرنے کو اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ کلام میں نرمی کرنے کو، اُن کے منہ پر مصنوعی خوشی و ہنسی ظاہر کرنے کو، بے تکلفی کا برتاؤ کرنے کو، اُن کے ضرر سے بچنے، اُن کا منہ بند کرنے اور اپنی عزت و آبرو کو اُن سے بچانے کے لیے انہیں کچھ دینے کو تقیہ کے باب میں شمار کیا ہے اور اس عمل کو غیر مسلموں کے ساتھ محبت و موالاۃ کرنے کی حرام کاری میں نہیں شمارا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ حرام ہے جبکہ یہ سب کچھ شریعت کے احکام و مامور بہ اور سنت کے مطابق اعمال ہیں۔

اس کے علاوہ تقیہ کو شرعی رخصت کے زمرہ سے نکال کر شیعہ کا گناہ اور اہل سنت کے حق میں شجرہ ممنوعہ مشہور کرنے کی روش اس وجہ سے بھی باعث تعجب ہے کہ اہل سنت کے نزدیک شرعی دلائل چار ہیں:

کتاب سنت اجماع اُمت قیاس

جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے کسی عمل کے جائز ہونے کے لیے ان میں سے کسی ایک سے اُس کا ثابت ہونا ضروری ہے جبکہ تقیہ قرآن شریف سے ثابت ہونے کے ساتھ احادیث نبویہ ﷺ سے اُس کی تائید اور اجماع امت و قول مجتہد سے اُس کی عملی تصدیق بھی ہو رہی ہے۔ ایسے میں ہمارے اہل سنت مبلغین کا اسے اسلامی حکم ہونے سے نکال کر گناہ کے زمرہ میں مشہور کرنا باعث تعجب نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

قرآن شریف کی سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28..... سورۃ نحل، آیت نمبر 106 سے تقیہ کے شرعی ثبوت اور ان آیات کریمہ کی تفسیر میں احادیث کثیرہ کے علاوہ چاروں مذاہب اہل سنت اسلاف کی تصریحات کے جو حوالہ جات گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر آئے ہیں اُن کی روشنی میں

(۱) تفسیر روح المعانی، ج 3، ص 122، مطبوعہ بیروت۔

چاروں دلائل شرعیہ سے اس کا ثبوت واضح ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ جمہور اُمت کا مستقل حوالہ بھی قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

حضرت امام ابو بکر بھٹاوی نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ یعنی ”ان تخافوا تلف النفس اوبعض الاعضاء فتتقوهم

باطظار المولات من غير اعتقاد لها وهذا هو ظاهر ما يقتضيه اللفظ وعليه

جمہور اہل العلم“

تو ظاہر ہے کہ جمہور اہل علم سے مراد فرقہ خوارج کے ماسوا باقی کل مکاتب اہل علم ہیں۔ جس میں شافعی کی کوئی تخصیص ہے نہ حنفی کی، مالکی کی نہ حنبلی کی، شیعہ کی نہ سنی کی۔ جیسے گزشتہ صفحات میں ان تمام مکاتب فکر کے ہمارے بیان کردہ حوالہ جات سے واضح ہو چکا ہے اور اس کے قیاس فقہی کے مطابق ہونے پر دلیل سلف صالحین سے منقول وہ تمام تصریحات ہیں جن میں اسے کسی ظالم کی طرف سے خوف لاحق ہونے کی بنا پر رخصت سمجھا گیا ہے۔ جیسے تفسیر المراغی میں سورۃ آل عمران، آیت نمبر 28 کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَهِيَ مِنَ الرَّخْصِ لِأَجْلِ الضَّرُورَاتِ الْعَارِضَةِ لَا مِنْ أَصُولِ الدِّينِ الْمُتَبَعَةِ دَائِمًا

یعنی تقیہ کا جواز پیش آنے والی مجبوریوں کی ضرورت کی وجہ سے رخصت کے قبیل سے ہے،

دین کے دائمی لازم الاتباع اصولوں میں سے نہیں ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جب اس کے جواز کا دار و مدار خوف جیسے عوارضات پر ہے تو ان عوارضات کے پیش نہ ہونے کی صورت میں اس کا جواز بھی ممکن نہیں ہوگا اور عوارضات کی مجبوری درپیش ہونے کی صورت

(۱) تفسیر احکام القرآن، ج 2، ص 289، مطبوعہ بیروت۔

(۲) تفسیر المراغی، ج 3، ص 137

میں اس کا جواز بھی ناگزیر ہوگا۔ جیسے ”الضرورات تبیح المحظورات“ کا قاعدہ کلیہ جملہ فقہاء کرام کے مابین متفقہ ہے۔ اسی بنیاد پر حضرت امام نووی نے اپنی تفسیر ”مراح لبید“ میں حضرت حسن بصری کا تقیہ کے قیامت تک جاری رہنے والا جائز حکم ہونے کا قول نقل کرنے کے بعد شریعت مقدسہ کے اس مسئلہ اصول کا اس کی بنیاد ہونے کی تصریح کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

”رَوَى عَنْ الْحَسَنِ أَنَّهُ قَالَ التَّقِيَةُ جَائِزَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لِأَنَّهُ دَفَعَ

الضرر عن النفس واجب بقدر الامكان“

حسن بصری سے روایت ہے کہ انہوں نے تقیہ کا اہل ایمان کے لیے قیامت تک جائز ہونے کا قول کیا ہے کیوں کہ ضرورت سے اپنے آپ کو بچانا حتی المقدور واجب ہے۔

اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ حسن بصری نے بھی دوسرے فقہاء کرام کی طرح ہی تقیہ کے جواز اور اس کے رخصت فی الاسلام ہونے کے لیے دفع ضرر کو علت قرار دیا ہے۔ جو تمام فقہاء اسلام کے نزدیک مسئلہ قاعدہ (الضرورات تبیح المحظورات) کے عین مطابق ہے۔

خلاصہ کلام بعد التحقیق:- تقیہ کو اہل تشیع کا مذہبی خاصہ کہہ کر اہل سنت کے لیے شجرہ

ممنوعہ قرار دینا بجائے خود ناجائز ہے، نا انصافی اور شیعہ کی مخالفت میں ایک اسلامی حکم سے انکار کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ اُس کی جتنی صورتیں جائز ہو سکتی ہیں وہ شیعہ سنی کی تفریق کے بغیر دونوں کے

اکابرین کے نزدیک یکساں جائز ہیں اور جتنی صورتیں ناجائز ہیں وہ بھی دونوں کے نزدیک متفقہ طور پر ناجائز ہیں۔ اور جواز کی صورتوں میں واجب، مستحب اور مباح کے مراتب کا جو فرق ہے اس میں بھی

فریقین کے اکابرین کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے ایسے میں مذکورہ سوال کے اندر تقیہ کے جائز سمجھنے والوں کو کافر کہنا یا گناہ کبیرہ کے مرتکب قرار دینا، بجائے خود معصیت اور شرعی حکم کے انکار سے خالی نہیں

ہے۔

یہاں پر مجھے اس غالی شیعہ کا کردار یاد آ رہا ہے جسے فقہ المسلمین فیما یزول بذکرہ الشجن میں حکایت کے

طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ ایک شیعہ سنی کے مابین دنیوی روابط تھے کسی کو پتہ چلا کہ میرے شیعہ دوست کے گھر گندم ختم ہونے کی وجہ سے اس کے ہاں خوراک کا مسئلہ پیدا ہوا ہے تو اس نے دوستی کا حق نبھاتے ہوئے اس کے پاس گندم کی بوری بھیجی جو گزشتہ سال کی پرانی تھی جسے اُس ماحول کی زبان میں عتیق کہا جاتا تھا جیسے رواں سال کی تازہ گندم کو جدید کہا جاتا ہے گندم دیکھ کر شیعہ نے محسوس کیا کہ وہ عتیق ہے اس کا ذہن حضرت ابو بکر صدیق ص کی طرف گیا کہ ان کا لقب بھی عتیق تھا محض اس اسی اشتراک کی وجہ سے اُس نے وہ گندم واپس کر دی جس پر اُس کے سنی دوست نے عتیق کی عوض جدید گندم کی بوری میں قدرے مٹی کی آمیزش کر کے بھیج دی جسے دیکھ کر اس کا ذہن حضرت علی ص کی کنیت (ابو تراب) کی طرف گیا تو خوشی سے پھولانہ سایا اور فرط مسرت میں درج ذیل شعر لکھ کر بعد شکر یہ کے ساتھ اپنے سنی دوست کے پاس بھیجے:

بَعِثْتُ لَنَا بَدَلَ الْبُرِّ بَرًّا
رَجَاءً لِلْجَزِيلِ مِنَ الثَّوَابِ
رَفَضْنَا عَنْ عَتِيقًا وَارْتَضَيْنَا
بِهِ اِذْ جَاءَ وَهُوَ ابُو تَرَابِ
(نخبة الیسین نیما یزدول بذکرہ الشیخ، ص 43، مطبوعہ مذہبی کتب خانہ قصہ خوانی پشاور)

تعصب جس پر غالب ہو جائے اسے جہل کی ہلاکت سے نکلنے نہیں دیتا۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق ص جیسے فنانی الرسول اور محسن ملت صحابی سے عداوت رکھنے والے ایسے بد نصیبوں کو مغلوب الشقاۃ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو شیعہ کہلانے والے ان گمراہوں کا حضرت صدیق اکبر ص کے نام سے نفرت کرنے میں اور سنی کہلانے والے ان حضرات کا تقیہ کے نام سے الرجک ہونے میں قدر مشترک تعصب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ درنہ شیعہ ماحول میں تعصب کے بجائے اگر آزاد ذہن سے اور حقائق کی روشنی میں صحابہ رسول کی اسلامی خدمات پر غور کیا جائے، ان کی طرف سے اسلام کی آبیاری کے لیے دی گئی قربانیوں کو پیش نظر رکھا جائے اور ان کی اسلامی زندگی کے باخلاص زاویہ ہائے حیات سے روشنی لی جائے تو نہ صرف ابو بکر صدیق ص کو عتیق من النار

کہا جائے عرفا روق کو حق کا معیار کہا جائے بلکہ سب کے لیے (رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ) کی خوشبو سے بھی اپنے سینوں کو منور کیا جائے اور ”الصحابۃ کلہم عدول وعتقاء من النار“ کا نعرہ بھی لگایا جائے لیکن شیعہ کے مذہبی استعمار نے اپنی عوام کو ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رکھا ہوا ہے کہ اس سے نکل کر روشنی کی طرف آنے کی سہیل ہی نہیں ہے اسی طرح اہل سنت و جماعت کہلانے والے یعنی سنت نبوی اور جماعۃ الصحابہ کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرنے والے تقیہ کے حوالہ سے تعصب کو چھوڑ کر اگر آیت کریمہ ”الْأَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةٌ“ (آل عمران، 28) اور آیت کریمہ ”الْأَمِّنُ أَكْرَهُ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ“ (النحل، 106) جیسے نصوص کو حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں یا کم از کم مفسرین کی روشنی میں ہی دیکھیں تو تقیہ کے نام سے الرجک نہ ہوتے، اسے اٹھا کر شیعہ کی جھولی میں ڈال کر اپنے لیے شجرہ ممنوعہ نہ کہتے اور خود سراپا اس میں مبتلا ہونے کے باوجود انکاری نہ ہوتے۔ (فالی اللہ الْمُشْتَكَى وَهُوَ وَلِي التَّوْفِيقِ وَالْهُدَى)

اللَّهُمَّ أَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا أَجْهَدُ الْمُقْلِ إِدَاءً لِحَقِّكَ وَحَقَّ كَلَامِكَ فَتَقَبَّلْهُ مِنِّي وَأَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى حَبِيبِهِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ
وَإِنَّا الْعَبْدُ الضَّعِيفُ

پیر محمد چشتی 19-4-2004

ختم النبوة کے منافی وساوس کا ازالہ

مسئلہ یہ درپیش ہے کہ رسوائے زمانہ کتاب ”تخذیر الناس“ کی عبارت ”اگر بعد زمانہ نبوی دوسرا نبی پیدا ہو جائے پھر بھی خاتمیت محمدی ﷺ میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔“ کو درست ثابت کرنے کے لیے کچھ لوگ وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا“

اگر ابراہیم ابن رسول اللہ ﷺ زندہ رہتے یقیناً نبی ہوتے۔

نیز بعض محدثین نے اس کی تشریح کرتے ہوئے اور حدیث ”أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَلَا رَسُولٌ“ سے مقصد بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو آپ ﷺ کی امت میں شمار نہ ہو بلکہ شریعت محمدی ﷺ کو منسوخ قرار دے۔ اس سلسلہ میں شرح فقہ اکبر میں ماعلی القاری کی یہ عبارت پیش کی جاتی ہے:

”إِذَا الْمَعْنَى أَنَّهُ لَا يَأْتِي نَبِيٌّ بَعْدَهُ يَنْسُخُ مِلَّتَهُ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِهِ“

اسی طرح کچھ دوسرے محدثین کی توجیہات سے بھی شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں جس سے سادہ لوح مسلمانوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔ نیز امام احمد رضا بریلوی کے فتاویٰ رضویہ میں لکھا ہے کہ:

”اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد دوسرا پیغمبر آتا پھر ان پیغمبر عبد القادر جیلانی پیغمبر ہوتے۔“

اس سے بھی تخذیر الناس والا عقیدہ اور قادیانی عقیدہ کو درست ثابت کرنے کی کوشش سے متعلق آواز آرہی ہے۔ مہربانی کر کے ان تینوں شبہات سے متعلق جو اسلامی احکام ہیں انہیں ظاہر کریں۔

(جَزَاكَ اللَّهُ خَيْرًا)

جواب:- مذکورہ سوالات کا بالترتیب جواب اس طرح ہے کہ روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا“ سے قادیانی والا یا تخذیر الناس والے صریح التزام کفر کے جواز پر استدلال کرنے کی کوشش ڈوبتے ہوئے شخص کو تنکے کا سہارا تلاش کرنے سے مختلف نہیں ہے جو نہایت نامعقول و بے ثبات ہے کیوں کہ اولاً یہ روایت حدیث نبوی ﷺ ہی نہیں ہے بلکہ من گھڑت و موضوع ہے۔

ثانیاً:- بالفرض والتقدیر حدیث نبوی ﷺ ہونے کی صورت میں اس میں مذکور نبیؑ سے مراد لغوی نبوت ہوگی جو ختم النبوة کے قطعی و یقینی عقیدہ کے منافی نہیں ہے اور ماعلی القاری وغیرہ محدثین سے ثابت مذکورہ توجیہ کہ ”لَا يَأْتِي نَبِيٌّ بَعْدَهُ يَنْسُخُ مِلَّتَهُ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِهِ“ سے مراد بھی یہی کچھ ہے کہ عقیدہ ختم النبوة کا تعلق نبوة کے شرعی مفہوم کے ساتھ ہے جبکہ اس روایت کا تعلق نبوة کے لغوی مفہوم کے ساتھ ہے جو آپس میں ضدین ہیں نہ نقیضین لہذا اشتباہ کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے یعنی ”وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔“

جواب کے اس اجمال میں اول اور دوم اشتباہ کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں اگر ”درخانہ کس است..... يك حرف بس است“ یعنی اہل علم کے لیے اتنا کافی ہے جبکہ تیسرے اشتباہ یعنی فتاویٰ رضویہ کے حوالہ سے اٹھائے جانے والے اشتباہ کا جواب اس اجمال کی تفصیل کے بعد پیش کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

عام قارئین کے لیے اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ مذکورہ روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا“ کو حدیث نبوی ﷺ سمجھنا غلط ہے کیوں کہ حدیث نبوی ﷺ کا کافی الواقع صادق ہونا ضروری ہے جبکہ یہ صادق نہیں بلکہ کذب ہے اس لیے کہ اس کا نقیض صادق ہے جو ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَمَا كَانَ نَبِيًّا“ ہے یعنی ابراہیم ابن رسول اللہ ﷺ اگر زندہ رہتے تب بھی نبی نہ ہوتے۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ نقیضین کا جمع ہونا ایسا ہی محال ہے جیسا رفع ہونا بلکہ ایک کا صدق لذاتہ دوسرے کے کذب کو مستلزم ہے جس کے بعد اُس کے کذب پر کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

باقی رہا یہ تصور کہ اس کا نقیض کیوں صادق ہے؟

اس لیے کہ وہ حقیقت پر مبنی ہے جو آیت کریمہ ”وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ“ (الاحزاب، 40) اور صحیح حدیث ”نُخْتِمَ بِنَبِيِّ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَلَا رَسُولَ“ کی روشنی میں قطعی و یقینی اور اجماعی عقیدہ ہے کہ نبی اکرم سید عالم ﷺ کے بعد کسی دوسرے نبی کی پیدائش ناممکن ہے جس پر نہ صرف یہ کہ شروع سے اب تک جملہ اہل اسلام کا اجماع ہے، مسلمہ اسلامی عقیدہ ہے اور ناقابل تردید قطعی و یقینی ہے بلکہ ضرورت دینی کے قبیل سے ہے۔

ایسے میں مذکورہ روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صِدْقًا نَبِيًّا“ کے جھوٹ و من گھڑت اور کذب محض ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے جبکہ اس کا نقیض ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَمَا كَانَ نَبِيًّا“ صادق ہے جو اس کا کلام نبوی نہ ہونے بلکہ کسی وضاع و گمراہ کا اختراع ہونے پر قطعی و یقینی دلیل ہے جس کی تفصیل قیاس استثنائی اتصالی کی مندرجہ ذیل شکوک میں کی جاسکتی ہے:

”لَوْ كَانَ كَلَامًا نَبَوِيًّا لَكَانَ صَادِقًا لَكِنَّهُ لَيْسَ بِصَادِقٍ فَلَيْسَ بِكَلَامِ نَبَوِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“

”لَوْ كَانَ كَلَامَ الرَّسُولِ ﷺ لَمَا كَانَ خِلَافَ الْقُرْآنِ لَكِنَّهُ خِلَافُ الْقُرْآنِ كَمَا هُوَ الظَّاهِرُ فَهُوَ لَيْسَ بِكَلَامِ الرَّسُولِ ﷺ“

”لَوْ كَانَ كَلَامَ الرَّسُولِ ﷺ لَمَا كَانَ صَادِقَ النِّقِیْضِ لَكِنَّهُ صَادِقَ النِّقِیْضِ كَمَا هُوَ الظَّاهِرُ فَهُوَ لَيْسَ بِكَلَامِ الرَّسُولِ ﷺ“

”لَوْ كَانَ كَلَامَ الرَّسُولِ ﷺ لَمَا خَالَفَ الثَّابِتَ مِنْهُ ﷺ عَلَى سَبِيلِ الضَّرُورَةِ الدِّينِيَّةِ وَهُوَ عَقِيدَةُ خَتَمِ النَّبُوَّةِ بِهِ ﷺ لَكِنَّهُ خِلَافَ الثَّابِتِ مِنْهُ ﷺ عَلَى سَبِيلِ الضَّرُورَةِ الدِّينِيَّةِ كَمَا هُوَ الظَّاهِرُ فَهُوَ لَيْسَ بِكَلَامِ الرَّسُولِ ﷺ“

اسی طرح اسکے موضوع ہونے پر بھی استدلال غیر مباشر کے انداز پر مندرجہ ذیل تفصیل کی جاسکتی ہے:

”هُوَ مُوَضَّوعٌ وَمُخْتَرَعٌ“

لَا أَنَّهُ تَوَجَّدَ فِيهِ الْعَلَامَةُ الْيَقِينِيَّةُ لِلْوَضْعِ وَالْإِخْتِرَاعِ.

وَهِيَ مُخَالَفَتُهُ لِلضَّرُورَةِ الدِّينِيَّةِ.

وَكُلُّ مَا تَوَجَّدَ فِيهِ عِلَامَةُ الْوَضْعِ وَالْإِخْتِرَاعِ مُوَضَّوعٌ.

فَهَذَا مُوَضَّوعٌ وَمُخْتَرَعٌ“

باقی رہا یہ تصور کہ اسلام کے کسی قطعی و یقینی عقیدہ سے خلاف ہونے کا وضع و اختراع کی علامت ہونے کی کیا حیثیت ہے تو وہ اس طرح ہے کہ جملہ مکاتب فکر اہل اسلام کے اکابرین کی تصریحات کے مطابق کسی روایت کے موضوع و مخترع ہونے کی پہچان کے لیے متعدد طریقے اور مختلف علامات ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

آیت قرآن کے کسی قطعی حکم سے خلاف ہو۔

نبی اکرم سید عالم ﷺ سے ثابت کسی ایسے اسلامی حکم سے خلاف ہو جو ضرورت دینی کی حد تک مشہور ہے۔

جملہ مکاتب فکر اہل اسلام کے اکابرین سے ثابت اجماع قطعی سے خلاف ہو۔

حدیث متواتر و مشہور سے خلاف ہو۔

مشاہدہ سے خلاف ہو۔

عقل سے خلاف ہو۔

موضوع روایت کی پہچان و علامات کے سلسلہ دراز میں ان کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں اسلاف کی کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں لیکن یہ چھ (6) وہ ہیں جن پر سب متفق ہیں اور اس موضوع سے متعلق لکھی گئی سب کتابوں میں موجود ہیں جو علماء اصول سے مخفی ہیں نہ علماء حدیث سے مثلاً نمونہ از خروارے ودانے از انبارے امام جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی شرح تقریب النوادی میں

کسی روایت کے موضوع ہونے کے لیے یقینی علامات کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”أَوْ يَكُونُ مَنَا فِي الدَّلَالَةِ الْكُتُبُ الْقِطْعِيَّةُ أَوْ السَّنَةُ الْمُتَوَاتِرَةُ أَوِ الْإِجْمَاعُ الْقِطْعِيُّ“ (۱)

اس کے بعد محدث ابن جوزی کے حوالہ سے لکھا ہے:

”مَا أَحْسَنَ قَوْلَ الْقَائِلِ إِذَا رُبِّتَ الْحَدِيثُ يُبَيِّنُ الْمَعْقُولُ أَوْ يَخَالِفُ الْمُنْقُولُ أَوْ يُنَاقِضُ الْأَصُولَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ مُضَوِّعٌ“ (۲)

الغرض کسی روایت کے موضوع و من گھڑت ہونے کی پہچان و علامات کے زمرہ میں یہ چھ (6) وہ ہیں جن میں دورائے کی گنجائش ہی نہیں ہے جس کے مطابق ان کی موجودگی آپ ہی متعلقہ روایت کے موضوع و من گھڑت ہونے کی دلیل قرار پاتی ہے جس کے بعد کوئی دوسری دلیل تلاش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔

حقائق کی اس روشنی میں پیش نظر روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا“ کو دیکھنے سے صاف نتیجہ آ رہا ہے کہ یہ عقل سے بھی خلاف ہے کیوں کہ اس کا نقیض صادق ہے یعنی ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَمَّا كَانَ نَبِيًّا“۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اجتماع نقیضین خلاف عقل ہے اور نبی اکرم سید عالم ﷺ سے ثابت اس اسلامی عقیدہ ”ختم النبوة“ سے بھی خلاف ہے جو ضرورت دینی کی حد تک مشہور ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اُسے ثابت کرنے کے لیے دلیل تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ اجماع قطعی سے بھی خلاف ہے کیوں کہ شروع سے لے کر اب تک اسلامی ماحول کے کل مکاتب فکر اہل علم کسی قسم انکار و نزاع کے بغیر اس پر متفق چلے آ رہے ہیں کہ نبی اکرم سید عالم ﷺ کے بعد دوسرے نبی کی پیدائش ممکن نہیں ہے۔ نص قرآنی ”وَحَاسَمَ النَّبِيِّينَ“ سے بھی خلاف ہے جس کا

(۱) تدریب الراوی، ج ۱، ص ۲۷۶، مطبوعہ دار الکتب الحدیثیہ مصر۔

(۲) تدریب الراوی، ج ۱، ص ۲۷۷، مطبوعہ دار الکتب الحدیثیہ مصر۔

مفہوم اجماع امت کے مطابق قطعی و یقینی ہے۔ ایسے میں اس روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا“ کے موضوع و من گھڑت ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے جس پر تفصیلی دلیل قیاس اترانی کے مندرجہ ذیل غیر مباشر انداز سے بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

هُوَ مُضَوِّعٌ.

لِأَنَّهُ خِلَافُ الصَّرُورَةِ الدِّينِيَّةِ.

وَكُلُّ مَا هُوَ خِلَافُ الصَّرُورَةِ الدِّينِيَّةِ مُضَوِّعٌ.

فَهَذَا مُضَوِّعٌ.

هُوَ مُضَوِّعٌ.

لِأَنَّهُ خِلَافُ الْعَقْلِ لِلزُّومِ اجْتِمَاعِ النَّقِیْضِیْنِ.

وَكُلُّ مَا هُوَ خِلَافُ الْعَقْلِ مُضَوِّعٌ.

فَهَذَا مُضَوِّعٌ.

هُوَ مُضَوِّعٌ.

لِأَنَّهُ خِلَافُ الْقُرْآنِ فِي ضَوْءِ الْإِجْمَاعِ.

وَكُلُّ مَا هُوَ خِلَافُ الْقُرْآنِ مُضَوِّعٌ.

فَهَذَا مُضَوِّعٌ.

اسی وجہ سے محدثین نے اسے کسی شک و تردید کے بغیر جزم و یقین کے ساتھ موضوع روایات میں شمار کیا ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جب اس کا موضوع اور من گھڑت ہونا اظہر من الشمس ہو چکا تو پھر اس کا سہارا لے کر قادیانی اور تحزیر الناس والے عقیدہ کو جائز ثابت کرنے کی ناکام کوشش کو بچکانہ تصور کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے جس کا پس منظر حدیث کی کتابوں میں پائے جانے والی ہر بات کو حدیث نبوی ﷺ سمجھنے کی غلطی یا دیدہ و دانستہ جان بوجھ کر دنیا کو مغالطہ دینے کی خیانت سے خالی

نہیں ہے۔

باقی رہا یہ تصور کہ کچھ محدثین نے اسے حدیث نبوی ﷺ ہونے کا اذخاں بھی بیان کیا ہے اور اس کی توجیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہیں خاص کر ملا علی قاری نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہا ہے:

”اِذَا الْمَعْنَى اَنَّهُ لَا يَأْتِي نَبِيٌّ بَعْدَهُ يَنْسَخُ مِلَّتَهُ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ اُمَّتِهِ“

جس سے قادیانی عقیدہ کے ساتھ تحذیر الناس والے عقیدہ کو بھی تقویت ملتی ہے اس لیے کہ تحذیر الناس کے مصنف اور قادیانی بھی نبی اکرم سید عالم ﷺ کے بعد ایسے نبی کی پیدائش کو ہی جائز کہتے ہیں جو نبی اکرم سید عالم کے لائے ہوئے دین و ملت کو منسوخ نہ کرے بلکہ دین محمدی ﷺ کے متبع ہونے کے ساتھ نبی اکرم سید عالم ﷺ کے امتی بھی ہوا ایسے میں اہل سنت کے ان اسلاف اور تحذیر الناس اور قادیانی والا عقیدہ کے مابین کوئی فرق ہی نہیں رہتا، ختم النبوة کے حوالہ سے جب ان میں فرق ہی نہیں ہے تو پھر تحذیر الناس کے مصنف اور قادیانی کو مرتد و قابل نفرت اور اپنے ان اسلاف کو مؤمن مسلمان اور قابل محبت کہہ کر تفریق کرنے کا فلسفہ کیا ہے؟

اس کا جواب اولاً:- حدیث کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہر بات حدیث نبوی ﷺ نہیں ہوتی، قابل تسلیم اور واجب العمل نہیں ہوتی بلکہ دوسرے علوم و فنون کی کتابوں میں کچھ ضمنی، ناقابل عمل اور غلط باتیں پائے جانے کی طرح حدیث کی کچھ کتابوں میں بھی لوگوں نے کچھ غلط باتیں نبی الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین ﷺ کی طرف منسوب کی ہیں جو اپنی قطعی و یقینی علامات سے پہچانی جاتی ہیں کہ وہ اللہ کے رسول سید عالم ﷺ کی حدیث ہرگز نہیں بلکہ موضوع و من گھڑت ہیں جن کی مثالوں پر مشتمل سینکڑوں صفحات ہمارے اسلاف نے لکھے ہیں۔ پیش نظر روایت ”لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ لَكَانَ صَدِيْقًا نَبِيًّا“ بھی بالیقین موضوعات کی اس فہرست میں شامل ہے جس پر دلائل ابھی ہم بیان کر آئے ہیں۔

ثانیاً:- جن حضرات نے اسے حدیث نبوی ہونے کا امکان بتانے کے ساتھ اس کے لیے جائز مصرف تلاش کرتے ہوئے توجیہات کے چکر میں پڑے ہوئے نظر آتے ہیں انہوں نے اس کے ایک سے

زیادہ اسناد اور متعدد طریقوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے احتیاط کی راہ اختیار کی ہیں جو درحقیقت عین بے احتیاطی اور صحیح و سقیم کی پہچان کے لیے فطری علامات سے صرف نظر کرنے کا نتیجہ ہے۔ نیز ان کی توجیہات ایک دوسرے سے متضاد ہونے کے ساتھ بعید از قیاس اور شرعی مآخذ میں نادیدہ و ناشنیدہ ہیں مثلاً بعض کا یہ کہنا کہ ”نبی کا بیٹا ہمیشہ نبی ہوتا ہے“ اور بعض کا یہ کہنا کہ ”حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ ﷺ پر اللہ کے رسول سید عالم ﷺ کا نماز جنازہ نہ پڑھنا اس لیے تھا کہ بڑے ہو کر اس نے نبی ہونا تھا جبکہ ایک نبی دوسرے نبی پر نماز جنازہ نہیں پڑھتا“ اور بعض کا یہ کہنا کہ ”یہ تفسیہ شرطیہ ہے اور تفسیہ شرطیہ کے صدق کے لیے اس کے مقدم کا صدق ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے کذب یعنی عدم تحقق کی صورت میں بھی صادق ہو سکتا ہے۔ جیسا حضرت عمر فاروق ص کا فرمان حضرت صہیب ص کے لیے ”نعم العبد صہیب لَوْ لَمْ يَخْفِ اللَّهُ لَمْ يَغْصِبِهِ“ (کنز العمال، ج 13، ص 437، حدیث نمبر 37146) میں صادق ہے۔ نیز حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ ص کے لیے فرمان نبوی ﷺ ”اِنْ سَالِمًا شَدِيْدُ الْحُبِّ لِلّٰهِ لَوْ لَمْ يَخْفِ اللَّهُ مَا غَصَاهُ“ (حلیۃ الاولیاء، ج 1، ص 177، مطبوعہ دار الفکر بیروت) میں صادق ہے۔ اسی طرح یہاں پر بھی ”لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ لَكَانَ صَدِيْقًا نَبِيًّا“ کے صادق ہونے کے لیے ابراہیم ابن رسول اللہ ﷺ کا رجال میں شمار ہونے کی عمر تک زندہ نہ رہنے کے باوجود تفسیہ شرطیہ کے طور پر کلام صادق ہے یہ سب کچھ لکھتے وقت ان حضرات نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ نبی کا بیٹا اگر ہمیشہ نبی ہوتا ہے تو پھر حضرت آدم ص فی اللہ کا بیٹا قاتل اور عمل غیر صالح کیوں ہوتا، حضرت نوح نخی اللہ کا بیٹا کافر اور عمل غیر صالح کیوں ہوتا۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح اتنا بھی نہیں سوچا کہ ایک نبی کا دوسرے نبی کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا حکم اسلام کے کس مآخذ سے ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ کہیں بھی نہیں ہے اسی طرح یہ بھی نہیں سوچا کہ پیش نظر روایت ”لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ لَكَانَ صَدِيْقًا نَبِيًّا“ کے صدق و کذب کے حوالہ سے جو بحث کی جارہی ہے اس کا تعلق مقدم کے صدق و تحقق کے ساتھ ہرگز نہیں ہے بلکہ عند اہل العربیت تالی میں موجود حکم ”لَكَانَ صَدِيْقًا نَبِيًّا“ کے ساتھ ہے اور مناطقہ کے مطابق بین

المقدم والتالیٰ جو حکم پایا جاتا ہے اُس کے ساتھ ہے یعنی ابراہیم کا نبی ہونے کی نسبت کا اُس کے زندہ رہنے کی نسبت پر مرتب ہونے کے ساتھ جس کے مطابق مؤدّٰلین کی اس تاویل اور موجدین کی اس توجیہ کو بے مصرف کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

ایسے میں قادیانی اور تحذیر الناس والا عقیدہ کے جواز کے لیے ان حضرات کا یہ انداز استدلال بچکانہ تصور سے مختلف نہیں ہے جس کی کوئی حقیقت ہے نہ ثبات۔ نیز ان حضرات کی یہ غفلت و لغزش محض تصوراتی حد تک محدود ہے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی دوسرے نبی کے پیدا ہونے کو جائز نہیں کہا ہے اور نہ ختم زمانی کے اجماعی عقیدہ کو جاہلوں کا عقیدہ کہہ کر اُس سے انکار کیا ہے جبکہ تحذیر الناس کے مصنف اور قادیانی نے یہ سب کچھ کہا ہے البتہ ملا علی القاری جیسے جن حضرات نے پیش نظر روایت کی توجیہ میں یہ کہا ہے ”لَا يَأْتِي نَبِيٌّ بَعْدَهُ يَنْسَخُ مِلَّتَهُ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِهِ“ اس سے سطحی ذہن والے ناواقف حال حضرات کو مغالط لگ سکتا ہے کہ بظاہر یہ قادیانی اور تحذیر الناس والا عقیدہ کا وہمہ دے رہا ہے جبکہ درحقیقت ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے جس کی تفصیل سمجھنے کے لیے تمہید کے طور پر مندرجہ ذیل حقائق کو سمجھنا ضروری ہے؛

سلوک فی الدین کی دو قسمیں ہیں؛

ایک:- وہ ہے جس کا تعلق احکام اللہ کے ساتھ ہے کہ شریعت مقدسہ کے اوامر و نواہی اور ترغیبات و تنبیہات پر عمل کیا جائے جو انسان کے اندر موجود قوت فکری و عملی کے اعتدال اور اُن میں امانت داری سے عبارت ہے اسے سلوک تقویٰ کہا جاتا ہے جو کسی شخص کے بغیر سب پر فرض ہے۔

دوسری:- جس کا تعلق بالترتیب اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ اور ذات اللہ کے رموز و معارف کے ساتھ ہے جس کا رتبہ سلوک تقویٰ کے فریضہ کی دست آوری کے بعد آتا ہے اسے سلوک

احسان کہا جاتا ہے۔

سلوک احسان عام مسلمانوں کے لیے نفلی عبادت ہے جبکہ ذات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے فرضی عبادت ہے یعنی انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم میں کوئی نبی اور کوئی رسول ایسا نہیں گزرا جس نے اعلان نبوة کے زمانہ سے پہلے اس فریضہ کی دست آوری نہ کی ہو چاہے اس کے حصول کے طریقے جیسے بھی ہوں۔

سلوک احسان کے مسافروں کے دو طبقے ہیں، ایک کو انبیاء و مرسلین۔ دوسرے کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔

ذات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا سلوک بعد الحذب ہوتا ہے جبکہ اولیاء اللہ میں بعض کا سلوک قبل الحذب اور بعض کا بعد الحذب ہوتا ہے۔

سفر سلوک کی چار قسمیں ہیں؛

سَفَرٌ مِنَ الْخَلْقِ إِلَى الْخَلْقِ جس میں اپنی ذات و صفات، ظاہر و باطن اور ایک ایک جزو کے مختلف عمل پر غور و فکر کرنے سے لے کر دوسری خلایق علویہ و سفلیہ کے حالات پر حسب استعداد غور و فکر کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَبَيِّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ“ (۱)

جس میں ہر سالک کے اس فکری سفر کا حجم اور اسکی شرح و وسعت اُس کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے اسی طرح اس سفر کے دورانیہ کا شرح تناسب بھی سالکین کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے یعنی جس کی استعداد جتنی زیادہ قوی ہوتی ہے اُس کا منزل مقصود تک پہنچنے میں بھی کم وقت لگتا ہے۔

سَفَرٌ مِنَ الْخَلْقِ إِلَى الْخَلْقِ بِالْخَلْقِ ہے جس میں وصول الی الحق کے بعد سالک کی فکری حرکت و سفر خلقت کی طرف ہونے اور انہیں مستفیض کرنے پر توجہ دینے کے بجائے ذات الہی میں مستغرق ہو جاتا ہے اپنی ذات میں اُسے ذات الہی نظر آنے، اپنی صفات و افعال میں اُسے

صفات و افعال الہی نظر آنے کی طرح دوسروں کی ذوات و صفات اور افعال میں بھی اُسے ذات و صفات اور افعال الہی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا جب تک وہ ذات الہی کے حوالہ سے اس مادراء العقل سفر میں ہوتا ہے اُس سے مادراء العقل افعال و اقوال بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ جس کی مثالوں سے سلوک و معارف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

سفر من الحق الى الخلق بالحق ہے۔

سفر من الخلق الى الخلق بالحق ہے۔

ان دونوں میں سارے راہِ حق اپنا اول سفر ”سفر من الخلق الى الحق“ کامیابی کے ساتھ طے کر کے وصول الی الحق کا شرف پانے کے بعد اُس وحدہ لا شریک کی ذات میں مستغرق ہونے کے بجائے خلق کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے اور توجہ الی الخلق کے اس فکری سفر سے مقصد حق تعالیٰ عز و جل سے ملنے والے معارف و ہدایات خلق خدا کو ”انسانوں“ کو پہنچانا ہوتا ہے، توفیق الہی کے مطابق اُن کی اصلاح احوال کرنے کے ساتھ ہر ایک کی استعداد کے مطابق انہیں معارف الہی سے متعارف کرانا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے سفر سلوک کی یہ دونوں قسمیں یعنی تیسرا اور چوتھا بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں جبکہ حقیقت میں مندرجہ ذیل وجوہ سے فرق ہے۔

تیسرا سفر یعنی **سفر من الحق الى الخلق بالحق** ولایت کے ساتھ خاص ہے عام اس سے کہ ولایت نبی و رسول کی ہو یا امتی کی اس لیے کہ شرعی مفہوم میں ہر نبی و رسول کے لیے اللہ کا ولی ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ ولایت شرعی نبوت شرعی کے لوازمات میں سے ہے جس کے بغیر نبوت و رسالت کا تصور نہیں ہے بخلاف ولایت کے کہ ہر ولی اللہ کے لیے اللہ کا نبی و رسول ہونا ضروری نہیں ہے، جبکہ چوتھا سفر یعنی **سفر من الخلق الى الخلق بالحق** نبوت و رسالت کے شرعی مفہوم کے ساتھ مختص ہے۔

ولایت کے ساتھ مختص سفر کی جانب آغاز و بدایت میں اتصال مع الخلق نہیں بلکہ اتصال مع

الحق معتبر ہوتا ہے جبکہ نبوت و رسالت کے ساتھ مختص سفر میں اس سے برعکس اتصال مع الخلق معتبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ“ (۱)

اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ اولیاء اللہ میں اتصال مع الخلق نہیں ہوتا اور انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم میں اتصال مع الحق نہیں ہوتا (العیاذ باللہ) ایسا تصور ہی اسلام میں نہیں ہے بلکہ ہر طبقہ میں اتصال مع الحق کے ساتھ اتصال مع الخلق بھی ہوتا ہے لیکن فرق صرف اعتبار کا ہے کہ ولایت کے ساتھ مختص سفر کی جانب آغاز و بدایت میں اتصال مع الحق کا اعتبار کرتے ہوئے بزرگانِ دین نے اُس کا نام **سفر من الخلق الى الخلق بالحق** رکھ دیا جبکہ شرعی نبوت و رسالت کے ساتھ مختص سفر کی جانب آغاز و بدایت میں انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی ذواتِ قدسہ کے اتصال مع الخلق اور انسانوں کے ہم جنس، ہم نسب اور اُن کے معاشرہ کا فرد ہونے کا اعتبار کر کے اس کا نام **سفر من الخلق الى الخلق بالحق** رکھ دیا۔

ولایت کے ساتھ مختص سفر یعنی **سفر من الحق الى الخلق بالحق** میں راہِ سلوک کے مسافر صاحبِ وحی نہیں بلکہ صاحبِ الہام ہوتا ہے جبکہ وحی کے حوالہ سے اپنے نبی و رسول کے مطیع و تابع ہوتا ہے اس کے برعکس شرعی مفہوم میں نبی و رسول کا صاحبِ وحی ہونا ضروری ہوتا ہے اور وہ وحی کے حوالہ سے کسی طرح بھی ولی کی طرف محتاج یا اُس کے تابع نہیں ہوتا۔

سفر من الخلق الى الخلق بالحق کی مسؤلیت میں اولیاء اللہ جن معارف کے امین و مبلغ ہوتے ہیں اُن کی متنوع اقسام ہیں جن کے مطابق اولیاء اللہ کے بھی مختلف طبقے ہوتے ہیں اور ہر طبقہ کی ذمہ داری و مسؤلیت دوسرے سے جدا ہوتی ہے جبکہ سفر من الخلق الی الخلق بالحق کی مسؤلیت میں انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم جن علوم و معارف اور جن احکام کی تبلیغ کے ذمہ

دار ہوتے ہیں اُن کے اصول اور بنیادی تعلیمات یکساں ہوتی ہیں جبکہ فروع میں کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ جیسا قرآن و سنت کی روشنی میں سب کو معلوم ہے۔

سفر من الخلق الى الخلق کی مسؤلیت میں اکثر اولیاء اللہ کی تعلیمات و تبلیغات کا بنیادی محور اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ اور ذات الہی سے متعلق رموز و معارف ہوتے ہیں تاہم حسب ضرورت احکام اللہ یعنی شریعت مقدسہ کے ظاہری احوال سے متعلق بھی دنیا کی رہنمائی کرتے ہیں جبکہ **سفر من الخلق الى الخلق** کی مسؤلیت میں انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات و تبلیغات کا بنیادی محور احکام اللہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی حسب ضرورت اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ اور ذات اللہ سے متعلق رموز و اسرار کی تعلیم بھی دیتے ہیں لیکن ہر ایک کو نہیں بلکہ اس کے لیے ایسے خواص ہوتے ہیں جن کو سمجھنے سے عام لوگ عاجز ہیں۔ جیسا حضرت امام زین العابدین اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتے ہوئے کہا ہے:

إِلٰهِي جَوَاهِرَ عِلْمٍ لَوْ أَبَوُحَ بِهَا
لَقِيلَ لِي أَنْتَ مِمَّنْ يَعْبُدُ الْوُثْنَ
وَلَا تَسْخَلُ رِجَالَ مُسْلِمُونَ دُمِي
يَرُونَ أَقْبَحَ مَا بَاتُونَ حَسَنًا
وَقَدْ تَقَدَّمُ فِي هَذَا أَبُو حَسَنِ
إِلَى الْحُسَيْنِ وَأَوْصَا قِبْلَهُ الْحَسَنًا (۱)

اسی طرح ابو ہریرہؓ کا یہ کہنا کہ:

”وَأَمَّا الْآخِرُ فَلَوْ بَشْتُهُ فَيُكْمَقُ هَذَا الْبُلْعُومُ“ (۲)

(۱) تفسیر روح المعانی، ج ۳، ص ۱۷۴، مطبوعہ دار الاحیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) مشکوٰۃ شریف کتاب العلم، ص ۳۷، بحوالہ بخاری شریف۔

سلوک کے مذکورہ اسفارِ اربعہ میں سے سفرِ اول **مِنَ الْخَلْقِ إِلَى الْخَلْقِ** کی حسب الاستعداد تکمیل کرنے کے بعد حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے جن معارف کی تعلیم و تبلیغ کے لیے خلق کی طرف سفر اختیار کیا جاتا ہے یعنی توجہ الی الخلق بالحق اسے صوفیاء کا ملین کی زبان میں مقام نبوۃ اور منزلۃ اور نبوۃ تعریف جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور اس نبوۃ سے مراد لغوی نبوۃ ہے کیوں کہ قرآن شریف کی زبان میں لفظ نبی جو صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے ”نبأ“ بمعنی خبر یا ”نبی“ بمعنی ”رَفَعْتَ“ سے اشتقاق پا کر مختلف ابواب سے حسب المواقف متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کی مثالوں سے قرآن شریف بھر پڑا ہے۔

سفرِ اول کی حسب الاستعداد تکمیل کر کے وصول الی اللہ کے بعد تیسرے اور چوتھے سفر میں توجہ لا فاضلۃ الخلق جو اولیاء اللہ اور ذواتِ قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مابین بظاہر قدر مشترک نظر آ رہی ہے اور صوفیاء کا ملین کی زبان میں مقام نبوۃ کہلاتی ہے۔

یہ نبوۃ اپنے دونوں لغوی مفہوموں کے اعتبار سے اگرچہ درست ہے کہ انبیاء و اولیاء دونوں رفیع المرتبہ بھی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات و افعال، صفات و اسماء اور احکام سے متعلق خبر دینے والے بھی ہوتے ہیں جو غیبی خبر کہلاتی ہے جس وجہ سے ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے تاہم لفظ ”نبی“ اور ”نبوۃ“ کا زیادہ تر استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، افعال و اسماء کے رموز و معارف سے خبر دینے کے مفہوم میں ہوا ہے جیسا قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”نَبِيَّ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ“ (۱)

میرے متعلق میرے بندوں کو خبر دے کے میں ہی غفور و رحیم ہوں۔

حدیث شریف میں فرمایا:

”أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ“ (۲) میں غیب کی خبریں بتانے والا پیغمبر ہوں جس میں جھوٹ نہیں۔

(۱) الحجر، ۴۹۔ (۲) بخاری شریف، کتاب المغازی، ج ۲، ص ۶۱۷۔

النجد میں ہے: ”النبوة والنبوة الاخبار عن الغيب أو المستقبل بالهام من الله“
نیز اصل وضع کے اعتبار سے اس کے لغوی مفہوم میں عظمت فائدہ بھی معتبر ہے کہ کسی حقیر اور بے فائدہ خبر کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور افتادہ علم کے اعتبار سے یہ بھی ضروری ہے کہ سننے والے کو اس سے یقین یا کم از کم ظن غالب حاصل ہو جائے، انجام کاریہ کہ جھوٹی خبر کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ مفردات امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

”النباء خبر ذو فائدة عظيمة يحصل به علم او غلبة ظن ولا يقال للخبر في الاصل نباء حتى يتضمن هذه الاشياء الثلاثة وحق الخبر الذي يقال فيه نباء ان يتعزى عن الكذب كالتواتر وخبر الله تعالى وخبر النبي عليه السلام“ (۱)
اور یہ بھی ہے کہ لفظ ”نبوة“ اپنے اس لغوی مفہوم میں مذکورہ تخصیصات و قيودات کے ساتھ مختص ہونے کے ساتھ اپنے موصوف کے اعتبار سے عام ہے کہ مذکورہ منوث دونوں کو شامل ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق غیبی معارف کی سچی خبریں دینے والے نہ صرف صالح مرد بلکہ صالح عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ النجد میں اس کے لغوی مفہوم کے عموم سے مطابق مذکور کے جمع و مفرد کا استعمال بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”والنبي جمع انبياء ونبين وانباء ونباء“

اس کے بعد منوث کے جمع و مفرد کا استعمال بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”نبئة ونبسات المخبر عن الغيب أو المستقبل بالهام من الله والمخير عن الله وما يتعلق به تعالى“ (۲)

نبوت کے لغوی مفہوم کی اس روشنی میں بالترتیب اولیاء اللہ اور ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ

(۱) مفردات القرآن مادہ (ن، ب، ع)۔

(۲) المنجد، مادہ (ن، ب، ع)۔

والتسليم کی مذکورہ توجہ لا فاضلة الخلق کے رتبے کو لغوی مفہوم میں مقام نبوة کہنا صوفیاء کا ملین کی وسعت بصیرت کی دلیل ہے اس لیے کہ توجہ لا فاضلة الخلق کا یہ رتبہ اولیاء اللہ کے سفر یعنی سفر من الخلق الى الخلق بالحق کی غایت ہونے کی صورت میں مقام نبوة سے مقصد یہ ہوگا کہ اولیاء اللہ کا اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ اور ذات اللہ سے متعلق معارف کی خبر دینے کا مقام جس کے لیے وحی کے سوا باقی الہام، حدس، نور بصیرت، فراست نفث فی الروع جیسے کوئی بھی سبب میسر ہو سکتا ہے۔ اور توجہ لا فاضلة الخلق کا یہ رتبہ ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسليم کے سفر یعنی سفر من الخلق الى الخلق بالحق کی غایت ہونے کی صورت میں پھر دو صورتیں ہیں:

ایک:- ان حضرات کے لیے اعلان نبوت اور نزول وحی کا وقت ابھی نہ آیا ہو اس صورت میں مقام نبوة سے مقصد وہی لغوی مفہوم ہوگا جو اولیاء اللہ کے حق میں ہے یعنی اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ اور ذات اللہ سے متعلق غیبی رموز و معارف کی خبر دینے کا مقام چاہے وحی کے سوا کوئی بھی سبب میسر ہو۔ اس لیے کہ نزول وحی اور اعلان نبوت سے قبل شرعی مفہوم میں ہر نبی و رسول کے لیے ولایت کا حصول بھی مسلمات اسلامیہ کے زمرہ میں شامل ہے کہ ہر نبی و رسول قبل نزول الوحی اور اعلان نبوت سے قبل ولی اللہ ہوتا ہے اور یہ ایسی ولایت ہے کہ نبوت و رسالت کے شرعی مفہوم کے ساتھ بھی جمع رہتی ہے جیسا نبی کی مذکورہ ”نبوة“ منقطع نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ بھی منقطع نہیں ہوتی۔

دوسری:- ان حضرات کے لیے اعلان نبوت اور نزول وحی کا وقت ابھی آ پہنچا ہو اس صورت میں مقام نبوت سے مقصد اُس کے لغوی مفہوم نہیں بلکہ شرعی مفہوم ہی متعین ہوگا یعنی وحی کی خبر دینے کا مقام اور نزول وحی کے حوالہ سے احکام اللہ، اسماء اللہ، صفات اللہ، افعال اللہ اور ذات اللہ سے متعلق علوم و معارف کی خبر دینے کا رتبہ ایسے میں صوفیاء کا ملین کی نگاہ بصیرت کی وسعت کا اعتراف کیے بغیر کون رہ سکتا ہے کہ انہوں نے اس مختصر لفظ ”مقام نبوة“ میں معرفت کا سمندر سمو دیا ہے۔ اسی مقام سے متعلق حضرت شیخ اکبر محمد بن الدین ابن عربی نے فصوص الحکم شریف کے کف عن غریبہ میں فرمایا ہے:

”وَأَعْلَمَ أَنَّ الْوِلَايَةَ هِيَ الْفَلَكَ الْمَحِيطُ الْعَامُ وَبِهَذَا لَمْ تَنْقَطَعْ وَلَهَا الْإِنْبَاءُ الْعَامُ وَأَمَّا نُبُوَّةُ التَّشْرِيعِ وَالرِّسَالَةُ فَمُنْقَطِعَةٌ فِي مُحَمَّدٍ ﷺ قَدْ انْقَطَعَتْ قَلَّا نَبِيٌّ بَعْدَهُ مُشْرِعًا أَوْ مُشْرَعًا لَهُ وَلَا رَسُولٌ وَهُوَ الْمَشْرِعُ“ (۱)

بعد التمهيدات خلاصة التحقيق: سفر اول جو سفر من الخلق الى الحق ہے کی تکمیل کے بعد تیسرا سفر جو سفر من الحق الى الخلق بالحق کہلاتا ہے اور اولیاء اللہ کے ساتھ مختص ہے اسی طرح چوتھا سفر جو من الخلق الى الخلق بالحق کہلاتا ہے اور ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص ہے ان دونوں کی جانب غایت و نہایت جس کی تعبیر توجہ لإفاضة الخلق سے کی جاسکتی ہے صوفیاء کا ملین کے مطابق ”منزلہ اور مقام نبوة“ کہلاتی ہے جو بمنزلہ دریا ہے جس میں اولیاء اللہ کے معارف ولایت کے متفرع جواہر زموز سے لے کر ولایت نبوة قبل اعلان النبوة کے تقسیم جواہر زموز و معارف سمیت بعد اعلان النبوة کے جملہ کمالات بھی پوشیدہ ہیں جو بعد میں اپنے اپنے اوقات پر ظاہر ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولایت کے دونوں حصوں یعنی نبی و رسول کی ولایت اور غیر نبی و رسول کی ولایت کے اعتبار سے مقام نبوة کے اس لفظ سے مراد اس کے لغوی مفہوم ہے جبکہ نزول و وحی اور اعلان نبوة کے بعد نبی و رسول کے اعتبار سے اس سے شرعی مفہوم متعین ہے جو عرف شرع میں یعنی قرآن و سنت کی زبان میں نبی و رسول کہلانے والی ذوات قدسیہ کے ساتھ مختص ہے۔ گویا اولیاء کرام اور صوفیاء کا ملین کی زبان پر استعمال ہونے والا یہ الفاظ (الفلک المحیط، مقام نبوة، مقام الانباء العام، منزلہ) اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے ولایت نبی و رسول اور ولایت غیر نبی و رسول کے اس خاص رتبے کو شامل ہونے کے ساتھ شرعی مفہوم میں نبی و رسول کے اس مخصوص منصب کو بھی شامل ہے اس لیے کہ عرف شرع میں ہر نبی و رسول کہلانے والے کے لیے لغوی مفہوم کے مطابق نبی ہونا ضروری ہے جیسا مفردات القرآن امام

(۱) فصوص الحکم شریف، فص حکمة قدریة فی کلمة عزیریة۔

الراغب الاصفہانی میں ہے؛

”وبدفعه يقع على الانسان اسم الالحاد“ (۱)

یعنی عرف شرعی میں نبی و رسول کہلانے والی ذوات قدسیہ سے لغوی مفہوم میں نبوة کی نفی کرنے والا شخص ایمان سے نکل کر ملحد قرار پاتا ہے۔

لیکن لغوی مفہوم میں نبی کہلانے والے اولیاء کے لیے شرعی مفہوم میں نبی ہونا ضروری نہیں ہے۔ لغوی نبی اور شرعی نبی کے مابین عموم و خصوص مطلق کی اس نسبت کی روشنی میں ہر ایک کی حقیقت و لوازمات اور مداریوں کے خانے بھی جدا جدا ہیں جس کے مطابق شرعی مفہوم میں نبی ہر وہ مقدس انسان ہے جو سلوک کے سفر اول **سفر من الخلق الى الحق** کی تکمیل کے بعد چوتھے سفر سلوک **سفر من الخلق الى الخلق بالحق** کے مطابق بندوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا جاتا ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے جس کا مرد ہونا ضروری ہے اور جملہ حسی و معنوی اور عرفی و غیبی و نقائص سے پاک و محفوظ ہونا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے اور نبی ہونے کا دعویٰ کرنا ضروری ہے اور اپنے اس دعویٰ پر معجزہ دکھانا ضروری ہے اور لوگوں کی اصلاح احوال کے حوالہ سے حسب ضرورت دعوت و تبلیغ کرنا بھی ضروری ہے۔ عام اس سے کہ مستقل شریعت کے مشرع اور مستقل آسانی کتاب کے حامل ہو یا اپنے سے پیش رو نبی کی شریعت کے پابند، اس کے متبع اور اس کی طرف داعی و مبلغ ہو اس کے باوجود کسی حکم کے لیے مستقل وحی اور سابق نبی و رسول کی شریعت میں پہلے سے موجود احکام سے اضافی احکام کا مشرع ہونا بھی ضروری ہے اگرچہ صرف ایک مستقل حکم کا اضافہ کرنے یا سابقہ احکام میں سے صرف ایک حکم کو منسوخ قرار دینے والا ہی کیوں نہ ہو۔

شرعی مفہوم میں نبی و رسول یعنی قرآن و سنت کی زبان میں نبی و رسول کے نام سے مشہور ہونے والی کسی

(۱) تفسیر مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی، ص 377، مطبوعہ اصح المطابع

آرام باغ کراچی۔

ہستی کا وجود ان دو قسموں سے متجاوز نہیں ہے جبکہ لغوی مفہوم میں نبی وہ اولیاء اللہ ہوتے ہیں جنہوں نے سفر سلوک کا پہلا سفر سفر من الخلق الی الحق کی تکمیل کے بعد تیسرے سفر یعنی سفر من الخلق الی الخلق بالحق کے مطابق انسانوں کی روحانی اصلاح پر مقرر کیے جاتے ہیں جس میں وحی نبوة کے سوا الہام، تحدیث، فراست ایمانی اور نفث فی الروح جیسے کوئی بھی سبب پایا جاسکتا ہے اور یہ حضرات مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورت بھی اور لغوی مفہوم میں نبی ہونے کے باوجود خود کو نبی ہرگز نہیں کہتے تاکہ شرعی مفہوم میں نبی ہونے کا اشتباہ نہ ہو جائے اس لیے کہ کسی ناجائز بات کا وہمہ دینے والا کلام عام مسلمانوں کے لیے بھی ناجائز ہے چہ جائیکہ اولیاء اللہ اس کے مرتکب ہوں۔ یہ حضرات خود مجسمہ کرامت ہوتے ہیں عوامی کرامات دکھانا ان کے لیے ضروری نہیں ہے تاہم حسب ضرورت دکھاتے بھی ہیں اور اللہ کے نبی و رسول کی شریعت میں مقررہ احکام میں سے کسی کو ختم کرنا کسی حکم کا اضافہ کرنا دور کی بات ہے جبکہ یہ حضرات شریعت نبوی ﷺ کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی کرنے سے بھی محفوظ ہوتے ہیں جنہیں لغوی مفہوم میں معصوم بھی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ حدیث نبوی ﷺ ”الْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَهُ اللَّهُ“ کے مظہر ہوتے ہیں۔ جملہ خلائق میں ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد یہ سب سے زیادہ اہل علم، اہل عرفان اور خدا شناس ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ جمال الہی کے امیدوار اور جلال الہی سے خائف ہوتے ہیں اور خواہش نفس کی فوٹنگی کے غم اور اس کی عدم دست آوری کے خوف سے بالاتر ہوتے ہیں یعنی آیت کریمہ ”لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ (البقرہ، 62) کے مظہر ہوتے ہیں۔

ان مابہ الاشتراک کمالات کے علاوہ ان میں مختلف طبقے ہوتے ہیں، ہر ایک کی ذمہ داری دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور سب سے بڑی ذمہ داری، سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل طبقہ وہ ہوتا ہے جو اسماء و صفات اور افعال الہی اور ذات الہی سے متعلق معارف کی فیض رسانی کرنے کیساتھ تہجد یدری خدمات بھی انجام دے اور حدیث نبوی ﷺ ”لَنْ تَزَالَ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ

لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ“ (مشکوٰۃ شریف، ص 583، باب ثواب مذہ الامہ) کے مظہر ہوں۔ اور ”يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِيْنَ“ (مشکوٰۃ شریف کتاب العلم، ص 36) کے مصداق ہوں۔ اسی رتبہ سے متعلق صدر الدین شیرازی نے المبداء والمعاد میں لکھا ہے:

”وَهَذَا ضَرْبٌ مِنَ النَّبُوَّةِ“ (۱)

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا:

”مجدد آن است کہ ہر چہ دران مدت از فیوض بامثال برسد

بتوسط او برسد اگر چہ اقطاب و اوتاد و بدلا و نجبا باشند“ (۲)

حضرت میران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی نے اس رتبے پر فائز اولیاء اللہ کو صاحب قلب و لسان کہہ کر ان کے منصب کے متعلق فرمایا ہے:

”وَجَعَلَهُ جَهِيْدًا وَدَاعِيًا لِلْعِبَادِ وَنَذِيْرًا لَهُمْ وَحُجَّةً فِيْهِمْ هَادِيًا مَّهْدِيًّا شَافِعًا مُشَفِّعًا صَادِقًا مُصَدِّقًا بَدَلًا لِرُسُلِهِ وَآيَاتِهِ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتُهُ وَتَحِيَّاتُهُ وَبَرَكَاتُهُ فَهَذَا هُوَ الْغَايَةُ وَالْمُنْتَهَى فِي بَنِي آدَمَ لَا مَنْزِلَةَ فَوْقَ هَذِهِ الْمَنْزِلَةِ إِلَّا النَّبُوَّةُ فَعَلَيْكَ بِهِ“ (۳)

حضرت شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی نور اللہ مرقدہ الشریف نے نبوة کے لغوی مفہوم کی وسعت سے بحث کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر لکھا ہے:

”فَالنَّبُوَّةُ سَارِيَةٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ فِي الْخَلْقِ وَإِنْ كَانَتْ التَّشْرِيعُ قَدْ انْقَطَعَ

(۱) المبداء والمعاد، ص 603، مطبوعہ دار الہادی بیروت۔

(۲) مکتوب نمبر 4، حصہ نور الخلائق۔

(۳) فتوح الغیب، مقالہ نمبر 33۔

فَالْتَشْرِيعُ جُزْءٌ مِنْ أَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ فَإِنَّهُ يَسْتَحِيلُ أَنْ يَنْقَطَعَ خَبَرُ اللَّهِ وَاجْتِبَاءُهُ مِنَ الْعَالَمِ إِذْ لَوْ انْقَطَعَ لَمْ يَبْقَ لِلْعَالَمِ غَدَاءٌ يَتَغَذَى بِهِ فِي بَقَاءٍ وَجُودِهِ“ (۱)

ایک اور مقام پر نبوة کے لغوی اور شرعی دونوں مفہوموں سے متعلق مظاہر سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”میں نے فتوحات مکیہ میں ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے الہام والقاء نہ کیا گیا ہو حالاں کہ میں ہرگز نبی و رسول نہیں ہوں بلکہ اپنے نبی خاتم الانبیاء والمرسلین جن کے بعد نبوة کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے کا تابع اور ان کے وارث ہوں۔“

حضرت شیخ اکبر کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں:

”قَوْلُ اللَّهِ مَا كَتَبْتُ مِنْهُ حَرْفًا لَا عَنْ إِمْلَاءِ إِلَهِي وَالْقَاءِ وَبَيَانِي أَوْ نَفْسِي رُوْحَانِي فِي رُوعٍ كَيْسَانِي هَذَا أَجْمَلَةُ الْأُمُورِ كَوْنًا لَسْنَا بِرُسُلٍ مُشْرِعِينَ وَلَا أَنْبِيَاءَ مُكَلِّفِينَ بِكُسْرِ اللَّامِ اسْمُ فَاعِلٍ فَإِنْ رِسَالَةُ التَّشْرِيعِ وَنُبُوَّةُ التَّكْلِيفِ قَدْ انْقَطَعَتْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ مُحَمَّدٍ ﷺ فَلَا رَسُولَ بَعْدَهُ ﷺ وَلَا نَبِيَّ يُشْرِعُ وَلَا يَكْلِفُ وَأَمَّا هُوَ عَلِمَ وَحُكْمَهُ وَفَهْمَهُ عَنِ اللَّهِ فِيمَا شَرَعَهُ عَلَى السُّنَّةِ رُسُلُهُ وَأَنْبِيَائِهِ عَلَيْهِمُ سَلَامُ اللَّهِ وَمَا خَطَهُ وَكَتَبَهُ فِي لَوْحِ الْوُجُودِ مِنْ حُرُوفِ الْعَالَمِ وَكَلِمَتِ الْحَقِّ فَالْتَنْزِيلُ لَا يَنْتَهِي بَلْ هُوَ دَائِمٌ دُنْيَا وَآخِرَةً“ (۲)

اس میں شرعی مفہوم کے اعتبار سے ”نبوة“ کا رسول اللہ ﷺ کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہونے کا اسلامی عقیدہ بتانے کے ساتھ جس تنزیل کے قائم و دائم اور غیر منقطع ہونے کا کہا ہے اس کا مظہر بھی بتایا ہے کہ

(۱) الفتوحات المکیہ، ج ۲، ص ۹۰، مطبوعہ دار صا بیروت۔

(۲) فتوحات مکیہ، ج ۱، ص ۴۵۶، مطبوعہ دار صادر بیروت۔

وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و حکمت کا اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

فصوص الحکم شریف کے شارح حضرت امام الاولیاء داؤد القیسری نور اللہ مرقده الشریف نے بھی نبوة کے لغوی اور شرعی مفہوم کا ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اُنکے الفاظ میں:

”وَعِنْدَ انْقِطَاعِ النُّبُوَّةِ التَّشْرِيعُ بِاتِّمَامِ دَائِرَتِهَا وَظُهُورِ الْوِلَايَةِ مِنَ الْبَاطِنِ انْتَقَلَتِ الْقُطْبِيَّةُ إِلَى الْأَوَّلِيَّةِ مُطْلَقًا“ (۱)

شرح فقہ اکبر میں ملا علی القاری نے نبی اکرم سید عالم خاتم النبیین ﷺ کی قبل البعث حالات سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے امام فخر الدین الرازی کے حوالہ سے لکھا ہے:

”لَمْ يَكُنْ أُمَّةً نَبِيٍّ قَطُّ لَكِنَّهُ كَانَ فِي مَقَامِ النُّبُوَّةِ قَبْلَ الرِّسَالَةِ فَكَانَ يَعْمَلُ بِمَا هُوَ الْحَقُّ الَّذِي ظَهَرَ عَلَيْهِ فِي مَقَامِ نُبُوَّتِهِ بِالْوَحْيِ الْخَفِيِّ وَالْكَشُوفِ الصَّادِقَةِ مِنْ شَرِيعَةِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَغَيْرِهَا“ (۲)

ان تہدیی حقائق کی روشنی میں مذکور روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا“ سے متعلق ملا علی قاری سے منقول توجیہ واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے یا ان جیسے دوسرے بزرگوں نے حدیث نبوی ﷺ ”أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي“ کا مفہوم ”لَا يَأْتِي نَبِيٌّ بَعْدَهُ يَنْسَخُ مِلَّتَهُ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِهِ“ میں جو بتایا ہے اس سے ان کی مراد حدیث کی عبارت النص اور اس سے مقصد کو متعین کرنا ہے کہ نبوی ارشاد کے یہ الفاظ محض لغوی معنی پر نہیں بلکہ شرعی مفہوم پر محمول ہیں یعنی یہ بتانا مقصد ہے کہ ”أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ“ میں جو ”نبوة“ ہے وہ بھی اور اس کے بعد مذکور ”لَا نَبِيَّ بَعْدِي“ میں بھی شرعی مفہوم پر محمول ہے کہ عرف شرع میں جن ذوات قدسیہ کو نبی کہا جاتا ہے میں ان سب کا خاتم ہوں، سب کی آخری کڑی ہوں اور حضرت آدم ن سے لے کر حضرت عیسیٰ ن تک جتنے بھی

(۱) شرح فصوص الحکم لداؤد القیسری، ج ۱، ص ۱۴۹، مطبوعہ بوستان کتاب قم ایران۔

(۲) شرح فقہ اکبر لملا علی القاری، ص ۱۰۷، مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور پاکستان۔

گزرے ہیں اُن سب کے لیے مبرئوت ہوں کہ میرے بعد کسی ایسی ہستی کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے جو میری شریعت کو منسوخ کرے یا اُس میں کسی حکم کا اضافہ کرے یا اُس کے کسی حکم کو منسوخ کرے چاہے صرف ایک حکم ہی کیوں نہ ہو۔

اہل علم جانتے ہیں ختم النبوة سے متعلق قطعی و یقینی عقیدہ جو اجتماعی ہے اور ضرورت دینی ہے ”نبوة“ کے لغوی مفہوم سے نہیں بلکہ اُس کے شرعی مفہوم سے متعلق ہے۔ ملا علی قاری کی مذکورہ عبارت سے مقصد بھی اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے ایسے میں اُس کا سہارا لے کر تحذیر الناس والا عقیدہ جو صریح التزام کفر ہونے کے ساتھ قادیانی عقیدہ کے لیے بھی حجر اساسی ہے کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرنا مجنوں کی بڑے مختلف نہیں ہے۔

نتیجۃ الکلام:- ملا علی قاری کی مذکورہ عبارت ختم النبوة سے متعلق اسلامی عقیدہ جو ضرورت دینی کے زمرہ میں ہے سے خلاف نہیں ہے بلکہ اُس کے عین مطابق ہے اور اس سے تحذیر الناس اور قادیانی والا عقیدہ کے جواز کا پہلو نکالنا غلط ہے، بے بنیاد اور ”نبوة“ کے لغوی اور شرعی مفہوم کے مابین تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

نیز مذکورہ تمہیدات جو مسلمات اسلامیہ ہیں سے غفلت کا منطقی نتیجہ ہے کیوں کہ بد فہمی کا نتیجہ بد فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ ملا علی قاری سے اِس عبارت کے حوالہ سے جو کوتاہی ہوئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ مذکورہ موضوع و من گھڑت روایت ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا“ کو بے حقیقت و موضوع قرار دینے کے بعد متکلمین کے اِراء عنان کا انداز اختیار کر کے اُس کی صحت کی صورت میں اُس کے اور حدیث ”أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي“ کے مابین تطبیق کے لیے یہ عبارت لکھی ہے کہ حدیث ”أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي“ میں مذکور نبی سے مراد شرعی مفہوم میں نبی ہے جبکہ ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا“ میں مذکور نبی سے مراد لغوی مفہوم میں نبی ہے۔ یعنی وہ اگر زندہ رہتے تو انباء عام و صدیقین کے رُتبے پر فائز ہوتے۔

کوتاہی یہ ہوئی ہے کہ تطبیق کا یہ انداز واضح نہیں ہے کیوں کہ اِس کا مدار نبی کے لغوی اور شرعی مفہوم کے مابین فرق پر ہے جسے ہر سامع و قاری سہولت کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا۔ انجام کار توجیہ کی اِس عبارت ”إِذَا الْمَعْنَى أَنَّهُ لَا يَأْتِي نَبِيٌّ بَعْدَهُ يَنْسَخُ مِلَّتَهُ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِهِ“ سے مذکورہ اشتباہ کو راہل گئی ہے جسے ہم ان پا کا ان اُمت کی بے توجہی اور بشری کوتاہی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ سچ فرمایا حضرت امام مالک نے؛

”إِذَا كُلُّ أَحَدٍ أَخَذَ مِنْ قَوْلِهِ وَبَرَدَ مَا عَدَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ“ وَعَنْ عَلِيٍّ كَرَّمَ اللَّهُ تَعَالَى وَجْهَهُ أَنَّهُ قَالَ: لَا نَنْظُرُ إِلَى مَنْ قَالَ: وَانْظُرْ مَا قَالَ: فَاسْتَفْتِ قَلْبَكَ بَعْدَ الْوُقُوفِ عَلَى أدِلَّةِ الطَّرْفَيْنِ وَمَالَهَا وَمَا عَلَيْهَا أَنْتُمْ أَغْمَلُ بِمَا يُفْتِيكَ“ (۱)

کاش مذکورہ توجیہ اِس کوتاہی سے محفوظ ہوتی تو ملا علی قاری اور اُن کے ہم زبان حضرات کی اِس تطبیق کو ہم بھی داؤ خستین پیش کرتے تا ہم تحذیر الناس اور قادیانی والے عقائد کو اِس سے کوئی مفاد ہاتھ نہیں آتا کیوں کہ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (وَاللَّهُ الْهَادِي إِلَى سَبِيلِ الرُّشَادِ)

تیسرے اشتباہ جو فتاویٰ رضویہ کے حوالہ سے ہے کہ یہ اشتباہ جہل محض یا دیدہ و دانستہ مغالطہ دینے کی بد باطنی سے خالی نہیں ہے کیوں کہ فتاویٰ رضویہ میں حضرت پیران پیر کی نبوة کے جواز کا ہرگز نہیں بلکہ اُن گمراہ جعلی پیروں اور غیر معیاری مشائخ پر رد کیا گیا ہے جنہوں نے پیران پیر کے فضائل میں اِس قسم کی روایت اپنے پیٹ سے گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”میرے بعد اگر نبی کا پیدا ہونا ممکن ہوتا تو پیران پیر نبی ہوتے۔“

فتاویٰ رضویہ میں ان گمراہوں پر رد کر کے بتایا گیا ہے کہ حضرت پیران پیر کے فضائل میں اِس قسم کی قطعاً کوئی حدیث موجود نہیں ہے اور یہ بھی بتا گیا ہے کہ اگر ختم النبوة کے قتل نے جریان نبوة کا دروازہ بند نہ کیا ہوا ہوتا تو حضرت عمر بھی نبی ہوتے اور پیران پیر بھی بلکہ بزرگان دین کے زمرہ میں اور صاحب

فضائل حضرات بھی جیسا حدیث میں آیا ہے ”لو کان بعدی نبی لکان عمر“ نیز روایت میں آیا ہے ”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا“۔ لیکن ختم النبوة کا عقیدہ یعنی سید عالم ختمی مرتبت ﷺ کے بعد دوسرے نبی کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے جس کے مطابق اسلامی عقیدہ ضروریات دین کی حد تک متواتر اور قطعی و یقینی ہے کہ اسلامی ماحول میں اسے ثابت کرنے کے لیے دلیل تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر یہ کہ ”تحدیر الناس“ اور قادیانی جیسے عقائد والے گمراہوں کو سمجھانے کے لیے اسلامی دلائل پیش کی جاتی ہیں۔ فتاویٰ رضویہ کی جلد 28، صفحہ 414 تا 416 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور میں پانچ سوالات پر مشتمل ایک استفتاء کے جواب میں موجود اس ایمان افروز کلام کے اپنے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

”یہ قول کہ ”اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو حضور غوث پاک ص نبی ہوتے اگرچہ اپنے مفہوم شرطی پر صحیح و جائز اطلاق ہے کہ بے شک مرتبہ علیہ رفیعہ حضور پر نور ص لکو مرتبہ نبوت ہے۔ خود حضور معلّٰی ص فرماتے ہیں:

”جو قدم میرے جد اکرم ﷺ نے اٹھایا میں نے وہیں قدم رکھا سو اقدام نبوت کے، کہ ان میں غیر نبی کا حصہ نہیں۔

از نبی برداشتن گمار از تو بنهادن قدم

غیر اقدام النبوة سدم مشاہد الختام

(نبی کا کام قدم اٹھانا اور آپ کا کام قدم رکھنا ہے علاوہ اقدام نبوت کے، کہ وہاں ختم نبوت نے راستہ بند کر دیا ہے۔)

اور جواز اطلاق یوں کہ خود حدیث میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق ص کے لیے وارد:

”لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ

وَالْحَاكِمُ عَنْ عَقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ وَالطَّبْرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ عَنْ عَصَمَةَ بْنِ مَالِكٍ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا“

میرے بعد نبی ہوتا تو عمر ہوتا (اس کو امام احمد، ترمذی اور حاکم نے عقبہ بن عامر سے جبکہ طبرانی نے معجم کبیر میں عصمہ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔

دوسری حدیث میں حضرت ابراہیم صاجرارہ حضور اقدس ﷺ کے لیے وارد:

”لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا. رواه ابن عساکر عن جابر بن

عبدالله وعن ابن عباس وعن ابن ابی اوفی والباوردی عن انس بن

مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم“

اگر ابراہیم جیتے تو صدیق و پیغمبر ہوتے۔ (اس کو ابن عساکر نے جابر بن عبد اللہ اور ابن

عباس اور ابن ابی اوفی سے، جبکہ الباوردی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم

سے روایت کیا،

علماء نے امام ابو محمد جوینی قدس سرہ کی نسبت کہا ہے کہ: ”اگر کوئی نبی ہو سکتا تو وہ ہوتے۔“

امام ابن حجر کی اپنے فتاویٰ حدیثیہ میں فرماتے ہیں:

”قَالَ فِي ”شَرْحِ الْمُهَذَّبِ“ نَقْلًا عَنِ الشَّيْخِ الْإِمَامِ الْمَجْمَعِ عَلَيَّ جَلَالَتِهِ

وَصَلَاحِهِ وَإِسْمَاعِيلِ أَبِي مُحَمَّدٍ الْجَوِينِيِّ الَّذِي قِيلَ فِي تَرْجُمَتِهِ لَوْ جَازَا أَنْ

يَتَّبِعَ اللَّهُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ نَبِيًّا لَكَانَ أَبَا مُحَمَّدٍ الْجَوِينِيُّ“

شرح مہذب میں کہا نقل کرتے ہوئے اس شیخ و امام سے جن کی جلالت و صلاحیت

و امامت پر اجماع یعنی ابو محمد جوینی علیہ الرحمہ جن کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ اگر اب

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت میں کسی نبی کو بھیجنا جائز ہوتا تو وہ ابو محمد جوینی ہوتے۔

مگر ہر حدیث حق ہے، ہر حق حدیث نہیں۔ حدیث ماننے اور حضور اکرم سید عالم ﷺ کی طرف

نسبت کر نیکی کے لیے ثبوت چاہئے، بے ثبوت نسبت جائز نہیں، اور قول مذکور ثابت نہیں۔ (واللہ

تَعَالَى أَعْلَمُ)

وہ کون سا انصاف پسند شخص ہو سکتا ہے جو فتاویٰ رضویہ کی اس عبارت سے وہ خبیث و آنخبث مقصد اخذ کرے جو پیش نظر سوال نامہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

خلاصۃ الکلام بعد الخلاصہ: تحذیر الناس والے عقیدہ کی اسلام میں گنجائش ہو سکتی ہے نہ قادیانی والے عقیدہ کی بلکہ یہ دونوں آپس میں اصل و فرع ہوتے ہوئے صریح التزام کفر ہیں جس میں شک کرنے والا بھی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کے حلقہ سے متاثر اندھے اس قسم صریح التزام کفر کو اسلام میں داخل کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں جسے کفر بالائے کفر کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اسلام اور کفر کے مابین تمیز کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

وَأَنَا الْعَبْدُ الضَّعِيفُ

پیر محمد چشتی

استقامت فی الدین کی کرامت

مسئلہ یہ ہے کہ حدیث شریف ”مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ“، یعنی جو بھی کلمہ تو حید لا الہ الا اللہ پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ کے مطابق سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کلمہ تو حید کا پڑھنا جنتی ہونے کا سبب ہے اور جنت کی کجی ہے۔ اور سب مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ عمر بھر کا نجس کافرو مشرک اگر یہ کلمہ پڑھ کر بغیر نماز روزہ وغیرہ عبادات ادا کئے فوراً مر گیا تب بھی جنتی ہوگا جبکہ قرآن شریف میں اللہ نے فرمایا ہے کہ:

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کرب تسلیم کرنے کے بعد اس پر مستقیم رہنے والے ہی جنتی ہو سکتے ہیں۔ (۱)

جسے پڑھ کر عام قاری کے ذہن میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہو سکتے ہیں:

- (۱) کیا کلمہ طیبہ اور ربنا اللہ ایک چیز کے دو نام ہیں یا یہ دونوں جدا جدا چیزیں ہیں؟
- (۲) جدا ہونے کی صورت میں کیا وجہ ہے کہ ربنا اللہ کہنے والے کے دخول جنت میں استقامت کو شرط قرار دیا گیا ہے جبکہ کلمہ طیبہ کہنے والے کے لیے شرط نہیں ہے؟
- (۳) استقامت فی الدین کے معنی سے متعلق بعض علماء سے سنا ہے کہ وہ اس کا معنی مداومت اور مستقل مزاجی کے ساتھ شریعت پر عمل کرنا بتاتے ہیں اور بعض شریعت پر عمل کا مظاہرہ کرنا کہتے ہیں، ان میں سے کس معنی کو درست کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں یہ دونوں الفاظ متعدد جگہوں پر مختلف معانی و مقاصد کے لیے استعمال ہوئے ہیں، اُن میں سے کفر سے بیزاری اور دائرہ اسلام میں یعنی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں جملے معنی لغوی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہونے

کے باوصف ایک چیز کے دو نام یا ایک ہی معنی و مراد کی ادائیگی کے لیے دو الگ الگ طریقے ہیں۔ ویسا ہی ربنا اللہ کہہ کر اُس سے بھی مراد کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہونے اور غیر مسلموں کی جماعت سے نکل کر جماعت المسلمین میں شامل ہونے کی ادائیگی کے لیے کافی ہے اور استقامت کو ربنا اللہ کہنے والوں کی مقبولیت و کامیابی کے لیے شرط سمجھ کر کلمہ طیبہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی مقبولیت و انجام کار کامیابی میں غیر مؤثر یا غیر ضروری سمجھنا سنگین غلطی ہے کیوں کہ جب دخول فی الاسلام کے لیے ان دونوں طریقوں کا مقصد و مراد ایک ہے تو ان میں سے ہر طریقہ سے اسلام میں داخل ہونے والے کی کامیابی و نجات اخروی اور دخول جنت کے لیے بھی ہر دو صورتوں میں استقامت بھی لازمی شرط ہوگی جس کے بغیر ان میں سے کوئی بھی صورت قابل قبول نہیں ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَنْ يَرْتَدْزْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ قِيمَتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي

الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“ (۱)

یعنی اگر تم میں سے کوئی شخص اسلام میں داخل ہونے کے بعد پھر جائے اور بغیر توبہ کے مر جائے تو ایسوں کے کئے ہوئے اعمال صالحہ دنیا و آخرت دونوں میں ضائع ہوں گے اور وہ دوزخ کی آگ والے ہیں جو ہمیشہ اس میں مبتلا رہیں گے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ“ (۲)

یعنی مرتے وقت جس کے دل میں اسلام کی حقانیت کا یقین ہو وہ جنت میں جائے گا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

(۱) البقرة، 217۔

(۲) صحیح مسلم شریف، باب من لقی الله بالايمان وهو غير شك، ج 1، ص 41۔

”مَنْ كَانَ آخِرَ كَلَامِهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ“ (۱)

یعنی مرتے وقت جس کا آخری کلام کلمہ توحید ہو گا وہ جنت میں جائے گا۔

تیسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ“ (۲)

یعنی اعمال صالحہ کی کامیابی و مقبولیت کا دار و مدار خاتمہ پر ہے، یعنی عمر کے آخری حصہ اور موت سے متصل یا قریب والے اعمال جسکے اچھے ہو گے وہی کامیاب و مقبول سمجھا جائیگا۔

یہ تینوں حدیثیں بالترتیب استقامت فی الاعتقاد، استقامت فی الاقوال اور استقامت فی الاعمال سے متعلق ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے مدعی ہر شخص کی کامیابی اور نجات کے لیے شرط ہے کہ اول سے آخر تک ان تینوں میں استقامت کا مظاہرہ کرے۔ اسی بنیاد پر صحاح ستہ کی ایک مرفوع حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

”أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ مَا دِيمَ عَلَيْهِ“ (۳)

یعنی اللہ کے نزدیک مقبول و پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر استقامت کیساتھ مداومت کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ”مِنْ أُولِهِ إِلَى آخِرِهِ“ استقامت سے عبارت ہے اور اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس میں استقامت کو ضروری قرار نہ دیا گیا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سمیت اربع عناصر سے بنا کر ان چاروں کے اشتراک عمل کے نتیجہ میں درج ذیل تین قوتیں اُس میں ودیعت فرمائی:

(۱) قوت غضبانی۔ (۲) قوت شہوانی۔ (۳) قوت عقلانی۔

(۱) ابی داؤد، باب فی التلقین، ج 3، ص 159۔

(۲) المعجم الكبير الطبرانی، ج 5، ص 420۔

(۳) مشکوٰۃ سریف، ص 110، باب الفصد فی العمل۔

ان میں سے اول اور دوم میں انسان کے ساتھ دیگر انواع حیوانات بھی ایسے ہی شریک ہیں جیسے حواس یعنی قوت باصرہ، سامعہ، لامہ، ذائقہ اور شامہ رکھنے میں شریک ہیں جبکہ قوت عقلانی اُن کے مقابلہ میں محض انسان کے ساتھ خاص ہے یا جنات اور ملائکہ میں بھی پائی جاتی ہے، جیسے حواس میں سے ہر ایک کا جدا جدا کام ہے باصرہ کا عمل سامعہ نہیں کر سکتی اور سامعہ کا عمل لامہ و شامہ سے نہیں ہو سکتا، دیکھنے کا عمل قوت ذائقہ سے نہیں ہو سکتا، سونگھنے کا عمل آنکھ یا کان سے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قوت غضبانی کا عمل اُسی کے ساتھ خاص ہے قوت شہوانی و عقلانی مل کر بھی اُس کا تقاضا پورا نہیں کر سکتیں۔ نیز عقل کے تقاضوں کو شہوانی و غضبانی مل کر بھی انجام نہیں دے سکتیں۔ انسان کی فہم و ادراک سے ماوراء اس تقسیم ازلی سے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا“ (۱)

یعنی ہر چیز کو اُس کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار پر رکھ کر پیدا فرمایا ہے۔

انسان کے اندر موجود قوت غضبانی کا تقاضاء و فریضہ یہ ہے کہ وہ حقوق انسانی کے منافی حرکات پر کنٹرول کرنے کے لیے حرکت کریں، جس سے تحفظ ہو سکے۔ اگر یہ قوت انسان میں موجود نہ ہوتی تو قوت شہوانی کے ہاتھوں دنیا میں کسی کا کوئی انفرادی حق محفوظ نہ ہوتا نہ اجتماعی، کسی فرد کی عزت و آبرو کو تحفظ نصیب نہ ہوتا نہ کسی قوم کو، اور قوت شہوانی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے ضروریات تعیش یعنی اُن چیزوں کے حصول کیلئے حرکت دے جن کے بغیر اس کی بقا ناممکن ہے جیسے کھانے کی ضروریات کے سلسلہ میں زمینداری سے لیکر پکانے تک، پینے کی ضروریات کے سلسلہ میں آب نوشی کے بڑے بڑے منصوبوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی ٹیکسوں تک اور انواع و اقسام مشروبات کی صنعتوں سے لیکر مشروبات کے ظروف تک، اسی طرح لباس کی ضروریات کے سلسلہ میں بڑے بڑے کارخانوں سے لیکر چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں تک اور درزی خانوں سے لے کر گھروں کے لباس خانوں تک۔ نیز رہائش

کی ضروریات کے سلسلہ میں بڑے بڑے رہائشی منصوبوں سے لیکر تعمیراتی ساز و سامان تک اور گھروں کی تعمیر سے لیکر اُن کی رہائشی و آسائشی سہولتوں تک اور بقاء نسل و آرام نفس کے سلسلہ میں ازدواجی بندھن کے جملہ لوازمات و تقاضے یہ سب کچھ انسان کے اندر موجود قوت شہوانی کے تقاضے و مظاہر ہیں۔ اگر انسان میں یہ قوت نہ ہوتی تو ان ضروریات خمسہ یعنی ماکولات و مشروبات، منکوح و منکوحات اور ملبس و مسکن کا مع ان کے جملہ متعلقات و لوازمات کے اس دنیا میں کوئی وجود ہی نہ ہوتا، گویا کرہ ارضی کے اس عظیم کارخانہ قدرت کی یہ تمام رونقیں انسان کے اندر موجود قوت شہوانی کی ہی مرہون منت ہیں جس کے بغیر یہ سارا جہاں بے رونق، بے مزہ اور بے جان ہے۔ انسان کے اندر موجود قوت غضبانی اور شہوانی کو اگر کنٹرول نہ کیا جائے تو وہ بسا اوقات اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے میں حد اعتدال سے بڑھ کر ظلم و زیادتی کی مرتکب بن جاتی ہیں اور کبھی کبھی اپنے فطری تقاضوں کو انجام دینے میں بھی کوتاہی کر کے خود کو بے مقصد بنا دیتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو بھی بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”رَبَّنَا مَا خَلَقْتُ هَذَا بَاطِلًا“ (۱)

یعنی زمین و آسمان اور اُنکے مابین کسی چیز کو بھی بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔

جب بے جس انسان اپنے فطری اور جائز حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے اندر موجود قوت غضبانی کو استعمال میں نہیں لاتا اور اپنے بنیادی حوائج و ضروریات کے حصول کے لئے قوت شہوانی کو استعمال نہ کرتے ہوئے محنت و عمل سے کترا کر دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے تو یہ دونوں صورتیں انسانیت کے لیے باعث فساد بن جاتی ہیں جسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ جیسا فرمایا:

”وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ“ (۲)

یعنی اللہ تعالیٰ انسانیت کے حق میں باعث فساد کردار کو پسند نہیں فرماتا۔

اسی لئے ان دونوں قوتوں پر کنٹرول کرنے اور متعلقہ کاموں کو انجام دینے میں اُن کی نگرانی کرنے کے لیے انسان میں تیسری قوت یعنی قوت عقلانی کو پیدا فرمایا ہے تاکہ وہ مذکورہ کوتاہیوں یا ظلم و زیادتیوں سے اُن کو روکے۔ اگر انسان کے اندر قوت عقل اُس کی قوت شہوانی و غضبانی پر کنٹرول کر کے انہیں بریک نہ لگائے اور تعطل و تجاوز کرنے سے انہیں منع نہ کرے تو انسان کے ہاتھوں یہ دنیا فساد خانہ بن جائے گی۔ ہر طرف غارت گری و خونریزی کا منظر ہوگا۔ فرشتوں نے اسی پہلو کو دیکھ کر کہا تھا:

”اتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ“ (۱)

یعنی اے خداوند عالم کیا تو انسان کی شکل میں اُن لوگوں کو زمین پر آباد کریگا جو فساد خیزی و خونریزی کریں گے۔

انسان کا ان تینوں قوتوں کا مجموعہ ہونا ہی اُس کا زمین میں اللہ کی خلافت اور اللہ کی طرف سے احکام شرعیہ کیساتھ مکلف ہونے کا سبب ہے، یہی وجہ ہے کہ جن خلائق میں یہ تینوں قوتیں اکٹھی نہیں پائی جاتیں انہیں خلافت حاصل ہے نہ مکلفیت، مثال کے طور پر فرشتوں میں عقل ہی عقل ہے اسلئے وہ مکلف ہوئے نہ خلیفہ، اسی طرح جمادات و نباتات اور ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں اقسام و انواع کے حیوانات جن میں سب کچھ ہے لیکن قوت عقل نہیں ہے جس وجہ سے وہ بھی خلیفہ اللہ یا مکلف باحکام اللہ ہونے سے رہ گئے۔ مقصد خلافت کی تکمیل اور تکلیف کے امتحان میں کامیاب وہی انسان ہو سکتے ہیں جو اپنی قوت شہوانی و غضبانی کو عقل کے تابع بنا کر کام میں لاتے ہیں بالفاظ دیگر جن کی عقل اُن کی شہوت و غضب پر غالب ہو، وہی اللہ کے سچے بندے، تکلیف کے امتحان میں کامیاب اور مقصد خلافت کی تکمیل کر نیوالے خوش نصیب ہیں۔ ایسے ہی پاک طینت و پاکبازوں کو اللہ تعالیٰ نے اصحاب یحییٰ اور قلب سلیم کے ناموں سے یاد فرمایا ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۖ اِلَّا اَصْحَابَ الْيَمِيْنِ“ (۲)

(۱) البقرہ، 30۔

(۲) المدثر، 38-39۔

یعنی ہر انسان اپنے برے اعمال کی سزا میں گروئی رکھی ہوئی چیز کی طرح پھینکا ہوا ہوگا مگر اصحاب یحییٰ ایسے نہیں ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

”يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۚ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ“ (۱)

یعنی قیامت کے دن قلب سلیم کے ساتھ اللہ کے حضور حاضر ہونے والوں کے سوا کسی اور کو مال و اولاد اور بیٹے و رشتہ دار وغیرہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ اور قلب سلیم پیدا کرنے کے لیے استقامت فی الدین ضروری ہے۔

تفسیر کاشف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے منقول ہے، انہوں نے فرمایا:

”لَا يَسْتَقِيْمُ اِيْمَانٌ عَبْدٌ حَتّٰى يَسْتَقِيْمَ قَلْبُهُ وَلَا يَسْتَقِيْمُ قَلْبُهُ حَتّٰى يَسْتَقِيْمَ لِسَانُهُ“ (۲)

یعنی اس وقت تک کسی بندے کا ایمان مستقیم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل مستقیم نہ ہو جائے اور دل اس وقت تک مستقیم نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زبان مستقیم نہ ہو جائے۔

اس ارشاد کا واضح مطلب یہی ہے کہ ایمان کی استقامت کے لیے دل، دماغ، زبان اور تمام جوارح کی استقامت ضروری ہے۔ اس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اظہار ایمان چاہے کلمہ تو حید پڑھنے سے ہو یا رَبَّنَا اللّٰہ کہنے سے، اسی طرح اَسْلَمْتُ لِلّٰہ کہنے سے ہو یا اَمَنْتُ بِاللّٰہ کہنے سے ہو بہر حال عند اللہ اُسکے مقبول ہونے اور نجات اخروی کا ذریعہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے تمام تقاضوں کو اپنی استطاعت کے مطابق پورا کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں خواہش نفس، قوت شہوانی یا غضبانی، جان، مال، متاع، خویش و اقرباء، الغرض کسی اور چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے تاکہ جب بھی موت آجائے تو اسی وفاداری کی حالت میں آجائے۔ اسی چیز کا نام استقامت فی الدین ہے اسی کو صحیح معنی

(۱) الشعراء، 88-89۔

(۲) التفسیر الکاشف، ج 6، ص 346، مطبوعہ دار العلم للملایین بیروت۔

میں ایمان و اسلام بھی کہتے ہیں۔ اسی معنی پر آیت کریمہ بھی دلالت کرتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”قَلَّا نَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ“ (۱)

یعنی جب بھی تمہیں موت آجائے تو اسلام پر استقامت کی حالت میں آئے۔
استقامت فی الدین کا دوسرا نام ایفاء عہد بھی ہے جسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا“ (۲)

یعنی وعدہ کے ساتھ وفا کرو بیشک وعدہ سے متعلق پوچھا جائے گا۔

جب کوئی غیر مسلم کلمہ طیبہ پڑھ کر یا ”رَبَّنَا اللَّهُ“ کہہ کر یا ”اَسْلَمْتُ لِلَّهِ“ کہہ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے یا کوئی مدعی اسلام کلمہ طیبہ پڑھ کر خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے تو اُس کا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک و کے ساتھ اس بات کا عہد و پیمان کر رہا ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اُس کے رسول کے ذریعہ جتنے احکام آئے ہوئے ہیں میں اپنی استطاعت کے مطابق عمر بھر اُن پر عمل کروں گا۔ یہیں پر اس بات کی وضاحت فائدہ سے خالی نہیں ہوگی کہ مقصد کلمہ کے حوالہ سے سلف صالحین سے منقول اس معنی کے مقابلہ میں جو لوگ کلمہ طیبہ کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین کیا جائے اور اللہ کی رضامندی اور اس کے امر کے بغیر مخلوق سے کچھ نہ ہونے کا یقین کیا جائے تو یہ اُن کی بھول ہے کلمہ طیبہ سے مقصد ہونا دور کی بات ہے بلکہ اسلام میں بھی ایسا عقیدہ رکھنا جائز نہیں ہے یہ دونوں جملے یعنی اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین کہا جائے اور اللہ کی رضا کے بغیر مخلوق سے کچھ نہ ہونے کا یقین کہا جائے اسلامی تصور کے سراسر خلاف اور قرآنی عقیدہ کے ساتھ متصادم ہونے کے علاوہ عقل و نقل کے بھی خلاف ہیں کیوں کہ پہلا جملہ یعنی ”اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین“ اپنے عموم کے سبب ان تمام چیزوں کو شامل ہے، جن کا قرآن و حدیث کی روشنی میں اللہ سے نہ

(۲) الاسراء، 34۔

(۱) البقرہ، 132۔

ہونے کا یقین ہے۔ جیسے کھانا پینا، اُلٹھنا، بیٹھنا، بیکھنا، عبادت کرنا، کفر و شرک، جھوٹ، ظلم، کسب، ولادت۔ علیٰ ہذا القیاس وہ تمام کام جو اللہ کی شان اقدس کے خلاف ہیں، قرآن و حدیث کے مطابق ان سب کا اللہ تعالیٰ سے نہ ہونے کا یقین ہے۔

دوسرا جملہ یعنی ”اللہ کے امر و رضا کے بغیر مخلوق سے کچھ بھی نہ ہونے کا یقین“ میں مخلوق سے صادر ہونیوالے تمام معاصی از قسم کفر، شرک، قتل، زنا، جھوٹ، چوری وغیرہ عیوب و نقائص کا اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہونے کا عقیدہ و یقین ظاہر ہو رہا ہے، جو نصوص قطعیہ کے خلاف، شریعت محمدیہ پر بہتان اور اہل اسلام کے اجماعی و مسلمہ عقیدہ کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ“ (۱) بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ“ (۲)

بے شک اللہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔

اور تیسری جگہ ارشاد فرمایا:

”وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ“ (۳) اور اللہ بندوں کیلئے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔

نیز دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی صفات ”سبوح قدوس“ کے خلاف ہیں کیوں کہ لغت اور شریعت کے حوالہ سے ان دونوں صفتوں کے معنی یہ ہیں کہ ”ہرنا مناسب چیز سے اچھی طرح پاک، مقدس، منزہ، مبرا، جیسا کہ لسان العرب ج 6، ص 168 میں ہے۔

اور بحیثیت مومن و مسلمان اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر ایمان لانے کا معنی و مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام چیزوں سے پاک، مقدس، منزہ ہونے کا عقیدہ و یقین کیا جائے جو اس کی شان کے خلاف ہیں اور جتنے بھی کام رب العزت کے جلال و جمال و کمال کے لائق نہیں ہیں ان سب کا اللہ تعالیٰ سے نہ

(۳) غافر، 31۔

(۲) الزمر، 7۔

(۱) الاعراف، 28۔

ہونے کا یقین کیا جائے اور اس عقیدہ و یقین کو زبان سے بیان کیا جائے۔ قرآن وحدیث اور شریعت کی زبان میں اسی کو تسبیح و تقدیس کہتے ہیں۔
شیخ زادہ علی البیہاوی میں ہے:

”التسبیح تبعید اللہ تعالیٰ عن السوء والنقصان بان يعتقدانه سبحانه وتعالى

منزلة فی ذاته و صفاته و افعاله عن كل سوء و نقصان و يتكلم بما يدل عليه“

یعنی تسبیح کا معنی ہر برائی و نقصان سے اللہ کو منزہ جاننا ہے اس طریقے سے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات و صفات اور افعال میں ہر قسم کی برائی و نقصان سے پاک ہونے کا عقیدہ رکھا جائے اور اسی عقیدہ پر دلالت کرنے والے مناسب الفاظ کے ساتھ کلام کیا جائے۔

تفسیر قرطبی میں ہے: ”التسبیح تنزیہ اللہ من كل سوء و نقص“

اللہ کی تسبیح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر برائی و نقصان سے اس کے منزہ و مقدس ہونے کا عقیدہ کیا جائے۔

تفسیر قاسمی میں ہے: ”تنزیہ ذاته تعالیٰ عما لا يليق بجلاله“

اللہ کی تسبیح کرنے کا معنی یہی ہے کہ اس کی ذات کو ان تمام چیزوں سے پاک ہونے کا یقین کیا جائے جو اس کے جلال کے لائق نہیں۔

تفسیر مظہری میں ہے: ”القدوس المنزه عما لا يليق“

قدوس کا معنی یہی ہے کہ جو چیزیں اس کی شان اقدس کے لائق نہیں ہیں وہ ان سب سے منزہ و مقدس ہے۔

تفسیر روح المعانی میں ہے: ”القدوس البلیغ فی النزاهة عما یوجب نقصانا“

یعنی اللہ کے قدوس ہونے کا معنی یہ ہے کہ جو چیزیں اس کی شان اقدس میں نامناسب و نقصان کے باعث ہیں ان سب سے وہ کمال درجہ کا پاک ہے۔

جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ سے نہ ہونے کا یقین و عقیدہ ضروری ہے ان تمام باتوں سے اللہ تعالیٰ کے مبرا منزہ پاک ہونے کے عقیدہ کے ساتھ ان چیزوں کا اللہ تعالیٰ سے نہ ہونے کا یقین اور اس یقین کا اظہار تسبیح و تقدیس کی صورت میں نہ صرف ہم ہی کرتے ہیں بلکہ تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں کا بھی لازمی جزو تھا اور تمام ملائکہ بلکہ سب کائنات کا مشترکہ عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَأَنَّ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ“ (۱)

یعنی اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

یعنی جتنے کمالات اس کی شان اقدس کے مناسب ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے متصف ہونے کا اور جتنی چیزیں اس کی شان اقدس کے خلاف ہیں ان کا اللہ تعالیٰ سے نہ ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہی معنی و مطلب ہے تمام آیات تسبیح کا مثلاً:

”سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ“ (۲)

یعنی آسمانوں اور زمین میں تمام مخلوق اللہ کو اس کی شان کے نامناسب کاموں سے پاک ہونے کی صفت کا اظہار کرتے ہیں۔

نیز فرمایا: ”فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ“ (۳)

یعنی عظمتوں کے مالک پروردگار کے نام کی پاکیزگی کا اظہار کریں۔

نیز ارشاد فرمایا: ”سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى“ (۴)

یعنی انسانی عقل کے ادراک سے ماورائی بلندیوں کے مالک پروردگار کے نام کی پاکیزگی کا اظہار کرو۔

قرآن شریف کے متعدد مقامات پر واقع حکم تقدیس و تسبیح کے علاوہ نمازوں کے اندر رکوع و

(۲) الصف، ۱۔

(۱) الاسراء، ۴۴۔

(۴) اعلیٰ، ۱۔

(۳) الواقعة، ۷۴۔

سجود میں بھی بالترتیب ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ اور ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پڑھنے کا ہر نمازی کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اندرون نماز رکوع و سجود کی حالت میں ان سب کاموں کا اللہ سے نہ ہونے کا یقین ظاہر کیا جائے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہیں۔ اللہ کی عبادت، اس کے حضور عاجزی، قیام و صیام اور رکوع و سجود جیسے افعال انسانیت کی معراج و کمال ہیں جبکہ یہی کمالات اللہ کی شان میں عیب و نقصان ہیں جس وجہ سے عین اس کمال کے اوقات میں بھی انسانوں کو ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ اور ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ کہہ کر اس ذات وحدہ لا شریک و کا ان کاموں سے پاک ہونے کے اقرار اور انسانیت کے حق میں ان جملہ کمالات کا اس سے نہ ہونے پر یقین کے اظہار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ورنہ اگر اللہ سے سب کچھ ہونے کے یقین کرنا اسلامی عقیدہ ہوتا تو ان آیات میں اور نمازوں کی حالت رکوع و سجود میں اللہ کی تسبیح و تقدیس کرنے کے احکام کا کیا معنی و مطلب ہو سکتا ہے لہذا مذکورہ الفاظ و عقیدہ اللہ کی ذات و صفات و افعال پر ایمان کے منافی ہو کر شریعت محمدی پر بہتان، شان الوہیت کی توہین و تنقیص کو تسلیم اور غیر اسلامی تبلیغ ہو کر مردود و غیر اسلامی عقیدہ قرار پا رہا ہے۔

نیز قرآن وحدیث اور اصول دین پر مشتمل اسلامی دستاویزات کے حوالہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کے اوصاف اضافیہ مثل خالقیت و رازقیت اور اوصاف فعلیہ مثل خالق، رازق، مصور، محی، ممیت، اور اوصاف ثبوتیہ حقیقیہ مثل علیم، قدیم، سمیع، بصیر، کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے، ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے اوصاف سلبیہ جیسے عرض جسم، محدود، محدود، مرکب، مکلف وغیرہ کا نہ ہونا ضروری ہے۔ پیشوا یا ان اہل اسلام اور مذاہب کے ائمہ دین و متکلمین اور اصول دین کے ماہرین نے بلا تکبر متفقہ طور پر اللہ تعالیٰ کے اوصاف سلبیہ کے ساتھ یقین و عقیدہ کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”لیس بعوض ولا جوهر ولا مَصْور ولا محدود ولا ممدود ولا متبعض ولا متجز ولا مرکب ولا متناه ولا یوصف بالماہیة ولا بالکیفیة ولا یتمکن فی

مکان ولا یجری علیہ زمان ولا یشبہ شی یخرج ولا عن علمہ وقدرتہ
شئی“ (۱)

اگر اللہ تعالیٰ سے سب کچھ ہونے کا یقین کرنا اسلامی عقیدہ ہوتا تو مذکورہ متفقہ عقیدہ یعنی اللہ تعالیٰ کے عرض، جسم، جوہر، محدود، محدود، متجزی، مرکب، متناہی وغیرہ چیزوں کے ساتھ متصف نہ ہونے کا عقیدہ بیان نہ ہوتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے اوصاف سلبیہ کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہوتا لیکن مذکورہ چیزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے متصف نہ ہونے کا عقیدہ تمام امت مسلمہ کا متفقہ و اجماعی مسئلہ ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے اوصاف سلبیہ کے ساتھ ایمان لانا تمام امت مسلمہ کا اجماعی عقیدہ ہے لہذا اللہ سے سب کچھ ہونے کا عقیدہ غیر اسلامی تبلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ شریعت محمدیہ پر بہتان، اللہ تعالیٰ کے اوصاف سلبیہ سے انکار اور شان الوہیت کی توہین، اکابرین اسلام کی واضح عبارات و مشترکہ اقدار سے انحراف ہو کر مردود و مطرود قرار پاتا ہے۔ نیز مخلوق سے صادر ہونے والے افعال و اعمال کے ہونے یا نہ ہونے اور کرنے یا

(۱) ۱۔ شرح عقائد، ص 27۔

۲۔ مواقف، ص 270

۳۔ شرح مقاصد، ج 2 ص 61 تا 107

۴۔ احیاء العلوم ج 1، ص 111

۵۔ اساس التقدیس، ص 12 تا 40

۶۔ تفسیر کبیر 1، ص 116 تا 142

۷۔ برفقہ محمودیہ، ج 1، ص 201

۸۔ قواعد الاحکام، ج 1، ص 168 تا 172

۹۔ وسیلہ احمدیہ ج 1 ص 119

۱۰۔ شرح اسماء الحسنیٰ امام رازی ص 186۔

نہ کرنے سے متعلق قرآن وحدیث اور اسلامی دستاویزات کی روشنی میں درج ذیل تفصیل ہے؛

عصاة سے معاصی و گناہوں کا اللہ کی رضا کے بغیر صادر ہونے کا یقین وعقیدہ ہونا ضروری ہے، یعنی گناہ کے تمام کام شیطانی حرکت سے صادر ہوتے ہیں جس پر اللہ کی رضا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ“ (۱) بے شک اللہ بے حیائی کا امر نہیں فرماتا۔

نیز فرمایا؛ ”وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ“ (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کیلئے کفر پسند نہیں کرتا۔

اہل اطاعت سے اطاعت اور نیکوں کا اللہ کے حکم و امر یا رضا سے صادر ہونے کا یقین وعقیدہ ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”وَأَنْ تَشْكُرُوا وَابْرِضْهُ لَكُمْ“ (۳)

اطاعت ومعصیت اور ہر قول و فعل کا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے بعد صادر ہونا نیک یقین وعقیدہ ضروری ہے یعنی بغیر تقدیر کوئی بھی فعل کسی بھی مخلوق سے صادر نہ ہونے کا یقین وعقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”إِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ“ (۴) ہم نے ہر چیز کو تقدیر کے مطابق پیدا کیا ہے۔

نیز فرمایا؛

”وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ“ (۵) وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ“

جس جس چیز کو ہم نے پیدا کیا ہوا ہے وہ کتاب تقدیر میں موجود ہے اور مخلوق کے ہاتھوں صادر ہونے والے تمام چھوٹے و بڑے اعمال پہلے سے لکھے ہوئے ہیں۔

(۱) الاعراف، 28۔ (۲) الزمر، 7۔ (۳) الزمر، 7۔

(۴) القمر، 49۔ (۵) القمر، 52، 53۔

مخلوق سے صادر ہونے والے اقوال و افعال، حرکات، سکناات، اطاعت ومعصیت، اسلام، کفر، توحید، شرک وغیرہ کا اور صادر ہوتے وقت جن اسباب یا کسب و اختیار سے وہ صادر ہوتے ہیں اُن سب کا اللہ تعالیٰ کے مقدور و مخلوق ہونا یقین وعقیدہ رکھنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (۱)

بے شک اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر خوب قادر ہے۔

نیز فرمایا؛ ”وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ“ (۲)

تم کو بھی اور تمہارے تمام اعمال کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا فرمایا ہے۔

مخلوق کے دخل عمل سے صادر ہونا اقوال و افعال وغیرہ کا اللہ تعالیٰ کے کاسب نہ ہونے کا یقین وعقیدہ رکھنا ضروری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کسب سے پاک ہے اور آلات و اسباب کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ“ (۳)

اللہ سب سے بے نیاز ہے جبکہ تم محتاج ہو۔

مخلوق سے صادر ہونے والے تمام نفس الامری کمالات و خوبی و اطاعات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارادہ مع الرضا و وابستہ ہونے کا یقین وعقیدہ ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“ (۴)

اللہ تعالیٰ تمہاری آسانی پسند فرماتا ہے اور تمہاری تکلیف پسند نہیں فرماتا۔

نیز فرمایا؛ ”فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ“ (۵)

اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا پسند کرتا ہے اسلام کے لیے اس کا سینہ کھول دیتا ہے۔

(۱) البقرہ، 20۔ (۲) الصنفت، 65۔ (۳) محمد، 38۔

(۴) البقرہ، 185۔ (۵) الانعام، 125۔

مخلوق سے صادر ہونے والے نفس الامری نقص و عیب و معصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارادہ مع الرضاء وابستہ نہ ہونے کا عقیدہ و یقین ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَنْ يَرِدْ أَنْ يُّضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَانَمَا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ“ (۱)

جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسکے سینہ کو ایسا تنگ کرتا ہے گویا وہ بلندی پر چڑھ رہا ہوتا ہے۔

مخلوق سے صادر ہونے والے نفس الامری نقص و عیب و معصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارادہ بغیر رضا یعنی ارادہ تکوینی وابستہ ہونے کا عقیدہ و یقین ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا“ (۲)

اگر اللہ نے انکے شرک کا تکوینی ارادہ نہ کیا ہوتا تو وہ کبھی شرک نہ کرتے۔

نیز فرمایا: ”وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ“ (۳)

اور اگر تیرے پروردگار نے اُن کی ان بدکرداریوں کا تکوینی ارادہ نہ کیا ہوتا تو وہ کبھی یہ نہ کرتے تو انہیں اُنکے حال پر ہی رہنے دیں۔

مخلوق سے جو اور جیسے بھی افعال و اقوال، اطاعت و معصیت عالم تفصیل و عالم ظہور میں صادر ہوتے ہیں ان کی پیدائش سے قبل مرتب ازل میں حسب استعداد خلائی ان سب کا اللہ کو علم ہونے کا یقین و عقیدہ ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ (۴) وہ ہر چیز پر علم محیط رکھتا ہے۔

جو مخلوق اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں اپنے اختیار و رضا سے ایمان و اسلام کا راستہ اختیار کر رہا تھا اور

(۱) الانعام، 125۔

(۲) الانعام، 107۔

(۳) الانعام، 112۔

(۴) البقرہ، 29۔

ازلی مومن و خاتمہ بالخیر ہوا اسکے کفر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ارادے کا وابستہ نہ ہونے کا یقین و عقیدہ ضروری ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:

”محال ان یختلف علمہ عن شیء او یتحقق غیر ما علم فیکون جہلاً لا علماً“ (۱)

یعنی اللہ کے علم کے خلاف ہونا محال ہے۔

نیز تفسیر قرطبی میں ہے:

”تعلق العلم الازلی بكل معلوم فیجری ما علم و اراد و حکم“

یعنی ہر معلوم کے ساتھ اللہ کا علم ازل متعلق ہوا ہے پس جس چیز کو اللہ نے جانا اور اس کے ہونے کا ارادہ تکوینی فرمایا اور فیصلہ کیا وہی ہوگا۔ (۲)

جو مخلوق اللہ کے علم ازل میں اپنے اختیار و رضا سے کفر و شرک کا راستہ اختیار کر رہا تھا اور خاتمہ بالکفر ہوا اس کے مومن مسلمان ہونے کے ساتھ اللہ کے ارادے کا وابستہ نہ ہونے کا یقین و عقیدہ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُم عَلَى الْهُدَى“ (۳)

اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت پر جمع کرنے کا ارادہ کیا ہوتا تو ایسا ہی کرتا لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا کہ ارادہ نہیں کیا تھا کیوں کہ اُس کے علم میں ایسا ہونا نہیں تھا۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب تفسیر روح المعانی نے کہا:

”وَلَكِنْ لَمْ يَشَاءَ ذَلِكَ سَبْخُهُ لِسُوءِ اخْتِيَارِهِمْ حَسَبَ مَا عَلِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى

مَنْهُمْ فِي الْاَزَلِ الْاَزَالِ“ (۴)

لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا ارادہ نہیں فرمایا ہے کیونکہ اس نے اپنے علم ازل کے مطابق اُنکے احوال کو جانا تھا۔

(۱) حجة الله البالغه، ج 1، ص 65۔ (۲) تفسیر قرطبی، ج 18، ص 132۔

(۳) الانعام، 35۔ (۴) تفسیر روح المعانی، ج 7، ص 139۔

مخلوق کے اقوال و افعال، اطاعت و معصیت کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم ازلی اور مخلوق کی استعداد ازلی کے خلاف قضاء و قدر کا اللہ سے نہ ہونے کا یقین و عقیدہ ضروری ہے۔ الحدیث الندیہ میں ہے:

”القضاء تابع للارادة والارادة تابعة للعلم“ (۱)

صاحب تفسیر قاسمی نے فرمایا:

”جرت عادته تعالیٰ برعاية الاستعدادات“ (۲)

تفسیر بیضاوی میں فرمایا:

”ارادته تعالیٰ تابعة لعلمه سبحانه وتعالى“ (۳)

مخلوق سے صادر ہونے والے تمام کارِ خیر و کارِ شر کا اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کے مطابق ہونے کا یقین و عقیدہ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَا تَشَاءُ وَاِنْ اَنْ يَّشَاءَ اللَّهُ“ (۴)

نیز فرمایا: ”وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ“ (۵)

کائنات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم، معلوم، رضا، ارادہ تشریفی، ارادہ تکوینی، حکم تشریفی، حکم تکوینی، قضاء و قدر، یہ سب جدا جدا امور ہیں۔ جن کے درمیان فرق مراتب کو جاننا ضروری ہے ورنہ ایک جگہ دوسرے کو استعمال کر کے شریعت پر بہتان، شان الوہیت کی تنقیص اور خلاف قرآن و حدیث، عقیدہ کی تبلیغ کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

(۱) الحدیقة الندیہ، ج ۱، ص ۲۵۶۔

(۲) تفسیر قاسمی، ج ۶، ص ۲۷۶۔

(۳) تفسیر بیضاوی، ج ۴، ص ۵۹۶۔

(۴) الدھر، ۳۰۔

(۵) القمر، ۵۲۔

اس تفصیل کی روشنی میں مذکورہ جملہ یعنی اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین نمبر ۱، نمبر ۵، نمبر ۷، نمبر ۱۲ کے خلاف ہے لہذا اسلامی دستاویزات کے خلاف ہو کر اسلام پر بہتان ہوا۔ نیز شان الوہیت کی توہین ہے اسلئے کہ اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین کر کے آلات کسب کا بھی محتاج بنادیا اور معلوم ازلی کے خلاف ہونے کا یقین کر کے اللہ کو جاہل بنادیا۔ (العیاذ باللہ) نیز مخلوق کی استعداد ازلی کے خلاف اللہ کا علم، ارادہ، قضاء و قدر و حکم ہونے کا یقین کر کے اللہ کو ظالم بنادیا۔ (العیاذ باللہ)

نیز کفر و معصیت، عیوب و نقائص کیساتھ اللہ کے راضی ہونے کا یقین و عقیدہ کر کے اور حکم و امر کرنے کا یقین کر کے نہ صرف توہین شان رب العزت کا ارتکاب کیا بلکہ نصوص قرآنی کے برعکس عقیدہ کا پرچار کر کے شریعت پر بہتان باندھا اور غیر اسلامی تبلیغ کا مظاہرہ کیا۔ (فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ“ (۱)

دوسری جگہ فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ“ (۲)

تیسری جگہ فرمایا: ”وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ“ (۳)

چوتھی جگہ فرمایا: ”وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلَمًا لِلْعِبَادِ“ (۴)

اور دوسرا جملہ یعنی اللہ کی رضا و امر کے بغیر مخلوق سے کچھ بھی نہ ہونے کا یقین نمبر ۱، نمبر ۵ کے خلاف ہو کر شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بہتان اور شان الوہیت کی توہین بن کر غیر اسلامی تبلیغ ہے اسلئے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا و امر کے بغیر مخلوق سے کچھ بھی نہ ہونے کا یقین ہو تو لازماً تمام معاصی از قسم کفر و شرک، قتل، زنا، چوری، جھوٹ وغیرہ کا صدور اللہ کی رضا و امر سے ہوگا۔ (العیاذ باللہ)

نیز اللہ تعالیٰ کو معاصی پر راضی ہونے کا عقیدہ و یقین کر کے اعتراف کر لیا کہ کفر و شرک، معصیت اور عیوب و نقائص پر اللہ تعالیٰ راضی ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا و امر سے ہو رہا ہے۔ (العیاذ باللہ)

(۱) الزمر، ۷۔ (۲) الاعراف، ۲۸۔

(۳) ق، ۲۹۔ (۴) غافر، ۳۱۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ“ (۱)
دوسری جگہ فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ“ (۲)

خلاصہ کلام:- مقصد کلمہ کے حوالہ سے یہ دونوں جملے ان آیات و نصوص کے خلاف اور جملہ اہل اسلام کے عقیدہ سے متضاد ہونے کے ساتھ مقصد کلمہ کے حوالہ سے سلف صالحین کی تصریحات کے بھی خلاف ہیں۔

فتح الباری شرح صحیح البخاری میں ہے:

”ان المراد بالشهادة تصديق رسول الله صل الله عليه وسلم فيما جاء به“ (۳)
یعنی کلمہ شہادت پڑھنے سے مقصد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تمام احکام کے ساتھ تصدیق کرنا ہے۔

عمدة القاری شرح صحیح البخاری میں ہے:

”ان الشهادة برسالته صل الله عليه وسلم تتضمن تصديقه بما جاء به“ (۴)
یعنی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی حقانیت پر شہادت دینے کا مقصد آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تمام احکام کی تصدیق کرنا ہے۔

افتضاء الصراط المستقیم میں ہے:

”والشهادة بان محمداً رسول الله تتضمن تصديقه في كل ما اخبر و طاعته
في كل ما امر فما اثبته وجب اثباته وما نفاه وجب نفيه“ (۵)

(۱) الزمر، ۷۔ (۲) الاعراف، ۲۸۔

(۳) فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج ۱، ص ۵۰۔

(۴) عمدة القاری شرح صحیح البخاری، ج ۱، ص ۱۸۳۔

(۵) افتضاء الصراط المستقیم، ص ۴۵۲۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کیساتھ شہادت دینا اس بات کو متضمن ہے کہ جن جن باتوں کی آپ ﷺ نے خبر دی ہے ان کے متعلق آپ کے سچے ہونے کی تصدیق کی جائے اور جن جن کاموں کے کرنے کا آپ نے حکم دیا ان میں آپ کی تابعداری کی جائے لہذا جس چیز کو آپ نے روا رکھا ہے اُسے روا رکھا جائے اور جس چیز کو آپ نے ناروا بتایا ہے اُسے ناروا سمجھا جائے۔

علامہ اقبال نے بھی اسی مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہی:

چوں میگویم مسلمانم بلر زمر کہہ دانم مشکلات لا اله
مقام انفس ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف سلویہ پر ایمان کے برعکس اور جملہ اہل اسلام کے متفقہ عقیدہ سے برخلاف اس قسم غیر اسلامی عقائد کو دعوت و تبلیغ کے نام پر پھیلاتے ہوئے دیکھ کر بھی اسکے انداد کی طرف اہل علم حضرات متوجہ نہیں ہو رہے ہیں جو الیہ سے کم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور مزید تحقیق سمجھنے کیلئے میری دوسری کتاب (الاستفتاء) کا مطالعہ کیا جائے جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں کلمہ طیبہ کے ہمارے بیان کردہ شرعی مقاصد و مطلب کے ثبوت میں کل مکاتب فکر سلف صالحین کی کتابوں کے بقید جلد و صفحہ حوالہ جات کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے کیا کچھ ہونے اور کیا کچھ نہ ہونے سے متعلق اسلامی عقائد کی تشریح کا حق ادا کیا جا چکا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقصد کلمہ سے قطع نظر شان الوہیت سے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کی ذات کے مناسب سب کچھ ہونے کا یقین ہے کہ وہ اپنی شان اقدس کے لائق سب کچھ کرتا ہے جو آیت کریمہ ”كُلُّ شَيْءٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ کا تقاضا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اُس کی شان کے خلاف کچھ بھی نہ ہونے کا یقین ہے کہ وہ اپنی شان اقدس کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتا جو اللہ کی تسبیح و تقدیس اور اُس کی تزیین و پاکی پر دلالت کرنے والی آیات کریمہ کا تقاضا ہے۔ یہ دو جملے یعنی اللہ سے اُسکی ذات کے لائق سب کچھ ہونے کا یقین اور اپنی شان اقدس کے خلاف اُس وحدہ

لا شریک سے کچھ بھی نہ ہونے کا یقین، کل مکاتب اہل اسلام کی کتب عقائد میں شان الوہیت سے متعلق جو متفقہ اسلامی عقیدہ لکھا ہوا اسلامی دستاویزات کی شکل میں موجود ہے، اُس کا نچوڑ و خلاصہ ہیں۔ اس کے باوجود کلمہ طیبہ کا مقصد و منطوق یا معنی و مفہوم انہیں بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ کلمہ طیبہ کا شرعی معنی و مقصود وہی ہے جو سلف صالحین کے حوالہ سے ہم بیان کر آئے ہیں۔

شان الوہیت سے متعلق اسلامی عقائد کے خلاصہ اور لب لباب کے طور پر ہم نے جو دو جملے پیش کئے ہیں یہ دونوں اُس کے جزو ہیں اس لئے کہ مقصد کلمہ یعنی کلمہ طیبہ پڑھنے والے کا اللہ کے ساتھ یہ عہد کرنا کہ اس کلمہ کے ضمن میں جتنے احکام تیری طرف سے مجھ پر تیرے پیغمبر کے ذریعہ عائد ہوتے ہیں میں اپنی استطاعت کے مطابق اُن پر عمل کروں گا۔ یہ عہد نامہ کل احکام کو شامل ہے اسی وجہ سے اس کلمہ کے پڑھنے والے کو مومن کہا جاتا ہے جس کے معنی ہے ”المصدق لجميع ما جاء به النبی صل اللہ علیہ وسلم اجمالاً فیما علیم اجمالاً و تفصیلاً فیما علیم تفصیلاً“ تو ظاہر ہے کہ اللہ کے نبی کے لئے ہوئے احکام شرع کا مجموعہ مرکب اپنی جگہ کل ہے جس کے تحت عقائد سے لیکر اعمال تک، حقوق اللہ سے لیکر حقوق العباد تک، تہذیب الاخلاق سے لیکر تدبیر منزل تک، اور سیاست مدنی سے لیکر شعائر اللہ تک جتنے بھی شعبے تفصیل کے درجہ میں ثابت ہیں یہ سب کے سب اُس کل کے اجزاء مختلف ہیں جن میں سے فی الجملہ شان الوہیت سے متعلق اسلامی عقائد کے خلاصہ کے طور پر یہ دو جملے بھی ہیں۔ جس طرح کسی مجموعہ مرکب یعنی کل کو جزو قرار دینا خلاف حقیقت ہے اسی طرح اُس کے جزو کو کل کہنا بھی خلاف واقعہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اُس میں شان الوہیت سے متعلق اسلامی عقائد کے وہ ضروری مسائل بھی ہیں جن کا جاننا ہر مومن مسلمان کیلئے ضروری ہے۔ میں نے اُسے چونکہ خالصتاً دفاع اسلام اور مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کی نیت سے بغرض تبلیغ لکھ کر شائع کی تھی لہذا قانون شریعت ”انما الاعمال بالنیات“ (الحديث) کے عین مطابق رب کریم نے بھی اُسے درجہ قبولیت سے نواز کر مسلمانوں کے حق میں تحفظ ایمان کا سبب بنادیا اور مقصد کلمہ کے طور پر اللہ سے سب

کچھ ہونے کا یقین اور اللہ کی رضا و امر کے بغیر مخلوق سے کچھ بھی نہ ہونے کے یقین کی غیر اسلامی تبلیغ میں مبتلا حضرات کیلئے سبب ہدایت بنا کر اُن کے مرکزی امیروں کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائی جس کے نتیجہ میں میری اس تبلیغی سعی کے بعد وہ حضرات ”بستی نظام الدین“ سے مربوط رانیونڈی تبلیغی اجتماعات میں اس نکتہ آغاز کو پہلے کی طرح بیان نہیں کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ذمہ دار مرکزی امیروں کی طرف سے اپنی اس دیرینہ غلطی سے ”الاستفتاء“ کی بدولت آگاہی حاصل ہونے کے بعد اس جماعت سے وابستہ لوگوں کو بھی اس تاریخی غلطی سے آگاہ کرنے اور اس اعلانیہ مذہبی جرم سے اعلانیہ توبہ کرنے کیلئے شرعی احکام پر عمل کرنے کی بجائے محض اس جرم کو ترک کر کے ”گھڑ شدہ دا صلواہ آئندہ دا احتیاط“ پر عمل کرنے پر اکتفا کیا۔

بہر حال یہ ان کا اپنا معاملہ ہے وہ جانیں اور اللہ، مجھے صرف اس بات پر خوشی حاصل ہوئی ہے کہ ”الاستفتاء“ کو تبلیغ کی نیت سے اور ان حضرات کی اصلاح کی غرض سے تحریر کر کے شائع کرنے کا جو جائز مقصد تھا وہ مجھے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اس عاجزانہ کوشش کو اپنی درگاہ میں قبول فرما کر ان حضرات کے لیے باعث اصلاح بنا دیا۔ اسی وجہ سے میں نے اُن فتوؤں کو بھی شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا جو ”الاستفتاء“ کی تائید و توثیق میں اندرون ملک و بیرون ممالک سے غیر جانبدار علماء کرام و مفتیان عظام نے میرے پاس بھیجے ہیں اس لیے کہ میرا مقصد مسلمانوں کے عقائد کا تحفظ اور ان حضرات کی اصلاح کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لہذا اس مقصد و حید کے حصول کے بعد اُن فتوؤں کو شائع کر کے ”رانیونڈ“ کے ساتھ مربوط علماء کی بکلی و زخمت کا اظہار کرنا کسی طرح بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ نیز خدا نخواستہ اگر ایسا ہو جاتا تو میری اس تبلیغی کاوش میں نفسانیت، علمی تفوق کا وسوسہ یا اگلے کو نیچا دکھانے کی شیطانی حرکت کا دخل عمل پیدا ہو سکتا تھا جسے کوئی بھی سچا مبلغ گوارا نہیں کر سکتا۔

کلمہ طیبہ کے شرعی مقاصد و مدعا کو بیان کرنے کے ضمن میں اس طویل داستان کو ذکر کرنے سے میرا مقصد قارئین کو آگاہ کرنا ہے کہ دعوت و تبلیغ جیسے اسلامی ناموں کے پردہ میں اور بزرگی کے لباس میں

اسلام کی بیخ کنی کرنے والے کل مکاتب فکر میں موجود ہیں۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ مذہبی تعصب و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اسلامی اقدار اور اسلام کے مشترکہ مسائل پر نگاہ رکھیں اور ایسے دوست نما دشمنوں سے اپنے ماحول کو بچانے کی کوشش کریں۔

اس ضمنی افادہ کے بعد اصل مسئلہ یعنی استقامت فی الدین کی بنیاد یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھنے کے ضمن میں آنے والے تمام احکام اسلام پر حسب استطاعت عمل کرنے کا عہد و بیان کرنے کے بعد ایفاء عہد کریں۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں احکام اسلام کو پیش نظر رکھیں اور قوت شہوانی و غضبانی کی ناجائز خواہشات، داخلی و خارجی اور ماحولیاتی شیطانی حرکات کو عقل پر غالب نہ آنے دیں اور ان سب کو عقل کا تابع بنا کر خود کو قلب سلیم کا مظہر بنادیں جسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۚ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ“ (۱)

یعنی قیامت کے دن قلب سلیم والوں کے علاوہ کسی بھی فرد بشر کو اس کے مال و اولاد فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں۔

نیز فرمایا: ”اِنَّمَا اَمْرُ الْكُفْرِ وَ اَوْلَادُكُمْ فَتْنَةٌ“ (۲)

ایک جگہ میں مال و اولاد کو باعث فائدہ اور دوسری جگہ میں باعث فتنہ قرار دینے کا مطلب یہی ہے کہ جو لوگ ان کے متعلق خواہشات نفس اور قہر و غضب پر عقل کو ترجیح دے کر راہ استقامت اختیار کرتے ہیں یعنی مال و اولاد یا ان کی خواہش و محبت پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کے متعلق اللہ اور اللہ کے رسول کے بتائے ہوئے احکام و ہدایات پر عمل کرتے ہیں اُن کے حق میں باعث فائدہ و راحت ہیں اور وہ لوگ جو ان ہی کو سب کچھ سمجھ کر ان کی خواہش و محبت کو تقاضا عقل پر ترجیح دیکر ان کے حصول و تحفظ کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عملاً ترجیح دیتے ہیں، اُن کے حق میں باعث عذاب و فتنہ ہیں۔ جیسے فرمایا:

”قَلَّا تَعْلَمُكَ اَمْرُ اَلْهُم وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَرْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ“ (۱)

یعنی ذاتی مفادات اور مال و اولاد کی خواہش کو اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام پر ترجیح دینے والوں کے مال و اولاد تیرے لئے باعث تعجب نہ ہو کیونکہ یہ سب کچھ اللہ نے اسلئے انہیں دیا ہوا ہے تاکہ وقت موت سے ہی یہ ان کے لیے سبب عذاب بنا شروع ہو جائے کیوں کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کے مقابلہ میں ان ہی کو محبوب سمجھنے والے منکرین کو موت کے وقت جب ان سے جدائی کا یقین ہوگا تب ان کی حسرت و افسوس اور عذاب و غم کا آغاز ہوگا جو ان کے ساتھ آخرت تک جائے گا۔

ان کے برعکس جن سعادت مندوں نے مال و اولاد، جان و منصب، عزیز داری و رشتہ داری اور ہر قسم دنیوی مفادات کو بشمول انسانی قہر و غضب و نفسانی خواہشات کے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع بنا کر کلمہ طیبہ کے ضمن میں اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کے مطابق اول سے آخر تک ایفاء عہد کرتے ہوئے استقامت فی الدین حزر جان بنایا۔ وفاداری کو اپنا شعار بنایا اور نامساعد ماحول میں بھی احکام اسلام پر عمل کرنے کو اطمینان نفس کا سامان بنایا تو ایسے باوفا مسلمانوں کو موت کے وقت مژدہ سنایا جاتا ہے کہ:

”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ اِزْجِعِي اِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً“ (۲)

یعنی اے باوفا انسان! جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ پر وفا کرتے ہوئے اطمینان کی زندگی گزار کر اب دار آخرت کی طرف جا رہا ہے ایسی خوش حالی کے عالم میں اپنے پروردگار کے حضور حاضری دیجئے کہ وہ تجھ سے راضی تو اس سے راضی اور تو نے استقامت فی الدین کی بدولت اس کو راضی کیا تو اس نے بھی ایفاء عہد کرتے ہوئے تجھے راضی کیا۔

یعنی ”وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أَوْ بِعَهْدِكُمْ“ (البقرہ، 38) کلمہ طیبہ پڑھنے کی صورت میں اللہ کے ساتھ استقامت فی الدین کے لیے عہد و پیمان کرنے کے بعد ایفاء عہد کرنے والے ایسے خوش قسمت و فاشعاروں کے متعلق اللہ نے ارشاد فرمایا:

”إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ“ (۱)

یعنی جن لوگوں نے اللہ کی ربوبیت کو تسلیم کرنے کی صورت میں اپنے پروردگار کے ساتھ استقامت فی الدین کا وعدہ کیا اس کے بعد عملی زندگی میں استقامت فی الدین کے اس وعدہ کو پورا بھی کیا تو اللہ کی طرف سے خصوصی پیغام لے کر فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں کہ مت ڈرو اور غم مت کرو اور اس جنت کے حاصل ہونے کی خوشی مناؤ جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا جاتا رہا۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردوں یعنی حضرت مجاہد اور حضرت عکرمہ سے منقول ہے

”اسْتَقَامُوا أَعْلَى شَهَادَةٍ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ حَتَّى مَاتُوا“

یعنی کلمہ شہادت پڑھ کر اللہ کے ساتھ استقامت فی الدین کا جو وعدہ کیا مرتے دم تک اس کے ساتھ ایفاء عہد کیا۔

حضرت سفیان ثوری نے کہا: ”عَمِلُوا أَعْلَى وَفَاقَ مَا قَالُوا“

یعنی ”رَبُّنَا اللَّهُ“ کہنے کے ضمن میں انہوں نے اللہ کیساتھ استقامت فی الدین کا جو عہد و پیمان کیا تھا اس کے مطابق عمل بھی کیا۔

حضرت مولیٰ علی ص سے منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا: ”ثُمَّ ادَّاءُ الْفَرَائِضِ“

یعنی ربنا اللہ کہنے کی صورت میں اللہ کے ساتھ استقامت فی الدین کا وعدہ کرنے کے بعد ایفاء

عہد کے تقاضا کے مطابق استقامت فی العقیدہ استقامت فی العمل اور استقامت فی القول کے جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں۔ انہیں پورہ کرتے ہیں۔

حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی یہ تفسیر بظاہر اگرچہ سب سے مختصر ہے لیکن درحقیقت کلمہ طیبہ کے اندر موجود تمام احکامات کو جامع ہے کیونکہ کلمہ طیبہ کے ضمن میں پوشیدہ جملہ احکام اسلام کا خلاصہ و مقصد صحت عقیدہ، صحت عمل اور صحت قول ہے۔ جن پر عمل حسب وعدہ ہر مدعی اسلام پر فرض ہے۔ حضرت کی اس تفسیر کی تائید نوح البلاغہ کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جہاں آپ نے قلب سلیم کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

”طوبى لقلب سليم اطاع من يهديه و تجنب من يرديه“

یعنی خوش نصیبی ہے قلب سلیم والوں کے لئے جو ہدایت دینے والے کی تابعداری کرتے رہیں اور ہلاکت کی طرف لے جانے والوں بچتے رہیں۔

امام قرطبی نے اس آیت کریمہ کی تفسیر سے متعلق متعدد اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرمایا:

”قُلْتُ وَهَذِهِ الْأَقْوَالُ وَإِنْ تَدَاخَلَتْ فَتَلْخِيقُهَا اعْتَدَلُوا أَعْلَى طَاعَتِ اللَّهِ عَقْدًا وَقَوْلًا وَفِعْلًا وَدَامُوا أَعْلَى ذَالِك“ (۱)

یعنی استقامت فی الدین کی تفسیر میں سلف صالحین سے منقول یہ اقوال زیادہ ہونے کے باوجود ایک ضابطہ کلیہ کے تحت مندرج ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کے مطابق اطاعت فی العقیدہ اطاعت فی القول اور اطاعت فی العمل پر اعتدال کے ساتھ مداومت کرتے ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو استقامت فی الدین کی تفسیر میں امام قرطبی نے جو ضابطہ کلیہ بیان فرمایا ہے یہ اس سلسلہ میں سلف صالحین سے منقول تمام اقوال کو شامل ہے خاص کر حضرت مولیٰ علی ص کے قول کو

شامل ہونے کے ساتھ اس کی تشریح بھی ہے اس لئے کہ ”رَبُّنَا اللَّهُ“ کہہ کر یا ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ کہہ کر یا کلمہ شہادت پڑھنے کی صورت میں جن احکام پر استقامت کیساتھ عمل کرنے کا اللہ کے ساتھ وعدہ کیا جا رہا ہے وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ان تینوں قسموں میں منحصر ہیں صحت عقیدے، صحت قول اور صحت عمل یہ تینوں اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کے مطابق انسان پر علی الدوام فرض ہیں۔ اسلامی فرائض اور عبادات کی ظاہری شکلیں ایک دوسرے سے اگرچہ مختلف ہیں لیکن اول تا آخر ہمیشگی اور دوام ان سب کے مابین قدر مشترک ہے ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں جن احکام کو انسان پر لازم قرار دیا گیا ہے ایک، دو یا بار عمر کے کچھ حصہ تک ان کو اپنے اوپر لازم سمجھنے کے بعد اس عقیدے سے انحراف کیا جائے بلکہ جو حکم جس طرح لاگو کیا گیا ہے اسی طرح اس پر ہمیشگی و دوامت پوری عمر مسلمانوں پر لازم ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَأَعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ“ (۱)

یعنی موت آنے تک اپنے پروردگار کی طرف سے عائد شدہ احکام کی پابندی کو اپنے اوپر لازم جانو۔

عبادت، نماز و روزہ وغیرہ چند مخصوص احکام کیساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ شریعت کی زبان میں اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ یہاں تک کہ دنیاوی کاموں اور باہمی معاملات و معاشرتی مسائل کو بھی مخصوص نیت کے ذریعہ عبادت بنایا جاسکتا ہے۔ سورۃ حجر کی مذکورہ آیت کریمہ میں عبادت پر تا حیات مداومت و ہمیشگی اختیار کرنے کا جو حکم دیا ہے وہ تمام انواع و اقسام عبادت کو شامل ہے چاہے وہ از قبیلہ عبادات اعتقادی یا عبادات قولی، عبادات عملی ہوں یا مالی، انفرادی ہو یا اجتماعی، ظاہری ہوں یا باطنی کیونکہ اسلام دین فطرت ہونے کی بنیاد پر اس کے احکام تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہیں جب انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسلامی احکامات و ہدایات سے خالی نہیں ہے تو ان پر اسی انداز سے عمل کرنا اور

ان کے مقابلہ میں خواہش نفس یا دغلی و خارجی متضاد محرکات اور شیطانی تقاضوں و ماحولیاتی اثرات کا حتی الوسع مقابلہ کرتے ہوئے میزان شریعت کو اپنے لئے اوڑھنا و بچھونا بنانا ہی استقامت فی الدین و معیار دین ہے جسکے بغیر دعویٰ ایمان ناقابل قبول ہے۔ اس اعتبار سے آیت کریمہ سورۃ فصلت کی آیات نمبر ۳۰ تا ۳۲ اور سورۃ ہود کی آیت نمبر ۱۱۳ کے ساتھ مربوط ہے اول کے ساتھ اس کا ارتباط حکم و نتیجہ والا ہے کہ اس آیت میں استقامت کے ساتھ پوری عمر اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ سورۃ فصلت والی آیات میں اس حکم پر عمل کر کے استقامت دکھانے والوں کے لیے من عند اللہ مقررہ ثمرات و نتائج کو بیان کیا گیا ہے اور سورۃ ہود آیت نمبر ۱۱۲ کے ساتھ اس کا ارتباط اجمال و تفصیل والا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

”فَأَسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتُ“ (۱)

یعنی جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی طرح ایفاء عہد پر مستقیم رہو۔

اس میں استقامت کا حکم ہر ایک کیلئے واضح نہیں تھا کہ ایفاء عہد پر استقامت کا یہ حکم کب تک لاگو رہے گا اس کی کیا اہمیت ہے اور کہاں تک ایک مدعی اسلام کیلئے اس پر عمل کرنا لازم ہے تو اس اجمال کی تفصیل و تفسیر اس آیت کریمہ میں کر دی گئی ”وَأَعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ“ (الحجر، ۹۹) یعنی مرنے دم تک اپنے خالق و مالک کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کا پابند رہو۔ یا بالفاظ دیگر اللہ کی طرف سے عائد جملہ احکام اسلام و ہدایات کی مدت العمر پابندی کرو سب سے بڑی عبادت استقامت فی الدین کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک انسان مذہب دشمن معاشرہ میں رہتا ہو جس میں افراد معاشرہ ہر طرف سے غیر اسلامی حرکات کو پسند کر رہے ہوں اور اللہ کے احکامات و ہدایات پر عمل کرنے والوں کو پس ماندہ کہہ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہو اور اسلامی احکام پر عمل کرنے میں اسے خاندانی، معاشی اور معاشرتی مشکلات و دشواریاں پیش آرہی ہوں۔ الغرض اس معاشرہ میں رہتے



ہوئے اسلامی احکام پر استقامت کے ساتھ عمل کرنا انگاروں پر چلنے کی طرح مشکل ہوا ایسے حالات میں ان نامساعد محرکات کو خاطر میں لائے بغیر احکام اسلام پر عمل کرنا سب سے بڑی عبادت اور استقامت فی الدین کی بہترین مثال ہے۔ ایسے ہی سعات مندوں کے متعلق حضرت شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی نے الفتوحات المکیہ میں فرمایا:

”لا تمنعَنَّك عن السلوك مضائق، من خلفهن ارائك ودرانك“ (۱)
یعنی معاشرتی اور ماحولیاتی مشکلات شریعت پر عمل کرنے سے تجھے منع نہ کریں کیوں کہ ایسے نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے شریعت کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنانے والوں کے لیے اس کے بعد لازوال سہولتیں ہیں۔

اور ایسے ہی سعادت مندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رئت ولا اذن سمعت ولم یخطر علی قلب بشر“ (۲)

☆☆☆☆☆

(۱) الفتوحات المکیہ، ج ۲، ص ۳۸۰، مطبوعہ مصر۔

(۲) حدیث قدسی تفسیر روح المعانی، ج ۲۱، ص ۱۳۲، تحت آیت ۱۷، السجدہ، احیاء

التراث العربی بیروت۔



المكتبة العظيمة

مجمع حضرت الباب العالي الشافعي مكتبة كبريى شارع 0300-5893316